قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2025 قیمت 25₹

ماہنامہ
اُردو دُنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

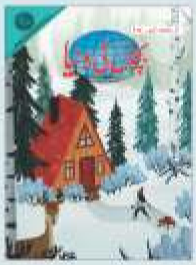

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

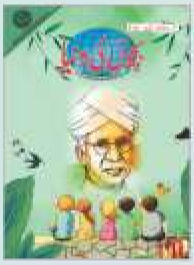

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:3، مارچ 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
سالاسار امیجنگ سسٹمس
A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے   سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000   شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746،   فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
• ہماری بات 4

خطوط
ربط و التفات   قارئین کے خطوط   5

ادب زاویے اور جہات
اردو ادب میں وقت کا تصور   اے رحمان   7
مراثیِ انیس میں تلمیحات کی پیشکش   نصیب علی چودھری   13

حاشیائی اردو خاکے   عمیر منظر   18
اردو زبان و ادب کے فروغ میں منشی نول کشور کا حصہ   محمد شہباز عالم   21

رپورٹ
عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کی ثقافتی سرگرمیاں   ادارہ   24

شخصیات
مجاز کی نظموں کا صوتی آہنگ   ناز بیگم   29
جمیل مظہری کی شاعرانہ خصوصیات   اسلم رحمانی   33
ہوش صاحب   عبداللہ خالد   36
گورکھپور کا گوہر نایاب: مسلم انصاری   ذاکر حسین ذاکر   39

کتب خانہ
قدیم مذہبی اور دیگر اداروں کے کتب خانے   بمل کمار دت
مترجم: سرتاج احمد عابدی 42

لوک ادب
لوک گیتوں کی زبان   اظہر علی فاروقی   47
لوک ادب میں لوری کی اہمیت   ترنگ موریہ   49

ہندی ادبیات
جدید ہندی شاعری میں اردو کی علامتوں اور شعری روایات کا استعمال   نریش   51

خراج عقیدت
خوشبوئے عشق بانٹنے والا پروفیسر قیصر شمیم   علی شاہد دلکش   54
نواب محمد عبدالوحید غازی آف گیوردھا   محمد اسداللہ   57

بازدید
اردو تنقید کے مسائل   خلیل الرحمن اعظمی   60

صحت
علاج بذریعہ غذا   حکیم احتشام الحق قریشی   66

عالمی ادبیات
ہیمنگوے: تشکیلی دور اور ادبی زندگی کی ابتدا   سلامت اللہ خان   69

نیا آسمان نئے ستارے
فراق شناسی ناقدین کے حوالے سے   تجمل حسین   74
مظہر امام کی شاعری   نیر وہاب   77

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ   ادارہ   80

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں   ادارہ   86

ہماری بات

ادب کیا ہے اور اسے کیوں پڑھا جائے اس تعلق سے بہت سی باتیں ہر زمانے میں ہوتی رہی ہیں۔ ادب کے حوالے سے سب سے بنیادی بات تو یہ ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہے۔ اس میں ہمارے سماج کی نوع بہ نوع تصویریں نظر آتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ادب تخلیق کار کے داخلی جذبات ومحسوسات کا اظہار بھی ہے۔ اس لیے ادیب دنیا میں جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، زندگی کے جو حقائق ادیب کے باطن کو مہمیز کرتے ہیں وہ ادب کے پیرائے میں ڈھل جاتے ہیں۔ فکر وشعور اور خیال کی سطح پر بھی انسانوں میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے لہٰذا یہ بات بھی ادب پر اثر انداز ہوتی ہے۔

زبان وادب علاحدہ علاحدہ چیزیں نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ادب زبان سے بھی آگے کا مرحلہ ہے۔ اگر زبان کی بات کی جائے تو زبان بجائے خود ہماری تہذیب کا استعارہ ہے۔ ہم جب کلام کرتے یا کوئی بات کہتے ہیں تو اس کے پس پردہ ایک پوری تہذیب کارفرما ہوتی ہے۔

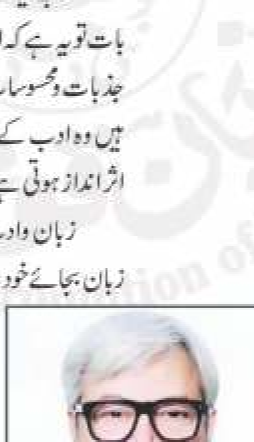

اردو کے ناقدوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ زبان داخلی تجربوں اور خارجی چیزوں کے درمیان رابطہ اور مناسبت قائم کرتی ہے اور خارجی تصویروں کو داخلی تجربوں کا قائم مقام بنانے سے وجود میں آتی ہے، اس لیے ہماری زبان سے ادا کیا گیا ہر لفظ ایک مردہ استعارہ ہے۔ ادب زبان کا تخلیقی استعمال ہے لہٰذا اس میں زندگی سے متعلق تجربوں کے ساتھ فنی ہنرمندیوں کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ادب کی فنی ہنرمندیاں بھی انسان کے گہرے تجربوں کا پتہ دیتی ہیں۔ پھر جمالیاتی حسن کا تعلق بھی انسانی تجربوں سے بہت گہرا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ادب ہر طور سے سماج کا آئینہ قرار پاتا ہے۔ ادب انسانی شعور کی ترتیب وتہذیب کرتا ہے۔ انسان کے ذہنی وفکری ارتقا میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے باشعور انسانی معاشرہ ادب کے مطالعے پر شدت کے ساتھ زور دیتا ہے۔ ادب کا مطالعہ انسان کے احساس وادراک میں حسن پیدا کرتا ہے اور انسانی زندگی کے حقائق قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ادب یا ادیب دنیا کو تبدیل نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود وہ حقائق اشیا کی تفہیم میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی حیثیت ایک پل کی بن جاتی ہے جس پر چل کر قاری کو حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اور فنکار کا تجربہ قاری کا تجربہ بھی بن جاتا ہے۔

ادب تخلیق کرنے والوں نے ہمیشہ زندگی کے کسی اہم مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ اگر کسی مقصد کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو ایسی صورت میں فن پارہ تخلیق کار کے ذہنی انتشار اور فنی چمک دمک کی گرفت میں آجاتا ہے۔ قاری نے ہمیشہ فن پاروں میں مقصدیت کی تلاش کی ہے اور یہ بھی ہوا کہ فن پارے کی مقصدیت نے قاری کے فکر وخیال کو صحیح سمت عطا کی۔ ادب کے سیاق میں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ انسان کا شعور عمومی طور پر جمود کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اس میں وقت اور تجربے کے اعتبار سے تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کا مطالعہ زندگی کے ہر مرحلے میں اہم ہو جاتا ہے۔ ادب کی ضرورت انسان کے ماضی، حال اور مستقبل میں ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ادب کے مقابلے میں دنیا کے دیگر علوم کو نہیں رکھا جا سکتا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ ادب کا مطالعہ انسان کے اندر کھوٹے اور کھرے کا امتیاز اور شناخت پیدا کرتا ہے اور ادب کی داخلی خوبیوں سے قاری کو آگاہ کرتا ہے۔ پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان ظاہر سے داخل کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ اس سطح پر اسے زندگی کی بصیرت، آگہی اور عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اس طور سے دیکھا جائے تو بہت واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ ادب نے انسان کو عرفانِ ذات بھی عطا کیا اور اجتماعی شعور سے بھی آگاہ کیا ہے۔ زندگی اور زمانے کے مذاق سلیم کے تئیں قاری کو غیر معمولی بصیرتیں عطا کی ہیں۔

یہ بات اب قاری کے ذوق پہ منحصر ہے کہ وہ ادب کے کس گوشے کو اپنے لیے زیادہ مفید اور کارآمد خیال کرتا ہے۔ ادب کے مطالعے کے دوران اچھے، تہہ دار اور بامعنی متن کا انتخاب بھی بہت اہم ہے۔ اردو ادب میں آج اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ سب کا سب پڑھنا ممکن نہیں ہے، اسی لیے قرأت کے لیے متن کا انتخاب ضروری امر ہے۔

شمس اقبال

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ 'اردو دنیا' فروری 2025 موصول ہوا۔ ہر مہینے اگر وقت پر رسالہ مل جائے تو اس کی خوشی الگ ہی ہوتی ہے۔ اس رسالے کے مدیر ڈاکٹر شمس اقبال نے 'ہماری بات' میں اردو کی ترقی و کامیابی کے تعلق سے خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر شمس اقبال کا اصل مقصد یہی ہے کہ اردو کو اس دور کی تکنالوجی کے ساتھ مکمل طور پر مربوط کیا جائے۔ اس کے علاوہ شمس اقبال نے زبانوں کی اہمیت، افادیت اور عظمت کو بھی واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبانیں ملک کی شان ہوتی ہیں، جس ملک میں جتنی زیادہ زبانیں ہوں گی اس کا کلچر اتنا ہی مضبوط ہوگا۔ اس رسالے میں مختلف قسم کے مضامین شامل ہیں، مثلاً خطوط، ادب زاویے اور جہات، چراغ راہ، عالمی ادبیات، خصوصی گفتگو، شخصیات، خبرنامہ، کتابوں کی دنیا وغیرہ۔ اصل میں رسائل کے مضامین سے طلبہ وطالبات کو کافی فائدہ بھی پہنچتا ہے۔ یہ معلومات کا خزانہ ہے اور یہ مکمل شمارہ مطالعہ کرنے کے لائق ہے۔

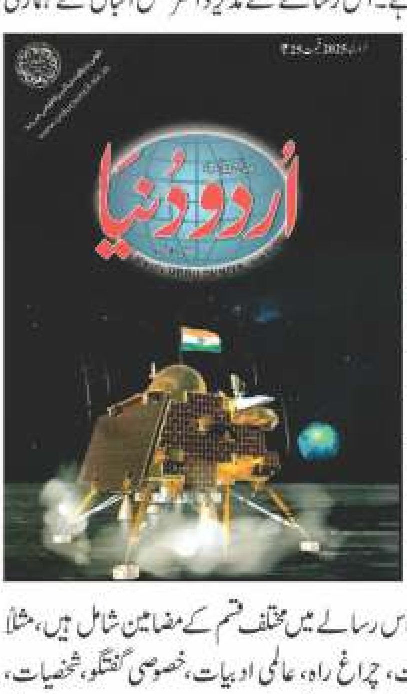

فرحین خانم، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، آسام یونیورسٹی، سلچر، آسام

اردو دنیا جنوری 2025 کا تازہ شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ ایڈیٹر جناب ڈاکٹر شمس اقبال صاحب نے سچ کہا "(ہمارے ملک میں) الگ الگ زبان اور کلچر کے باوجود ہندوستانیت ہر زبان کے خمیر میں شامل ہے۔" ادب زاویے کے کالم میں 'مخطوطہ شناسی اور ادبی تحقیق' بہت ہی اہم مضمون ہے۔ مضمون نگار امتیاز احمد نے تعریف و تفہیم اور اصول پر

بڑی مفصل بحث کی ہے۔ زبان و تعلیم کے کالم میں 'طلبا کی تعلیم پر گھر اور اسکول کے ماحول کا اثر' مضمون نگار شفاعت احمد نے بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق کافی اچھی گفتگو کی ہے۔

کتابوں کی دنیا میں شہر برہان پور کے نوجوان قلمکار محترم تنویر رضا برکاتی (چیئرمین دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہان پور) کا ماہنامہ اردو آنگن کے 'ڈاکٹر محمود شیخ نمبر' پر بہترین تبصرہ شامل ہے، جسے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس مشہور و معروف اور مقبول رسالے میں ہمارے شہر برہان پور قلمکار بھی شائع ہو رہے ہیں۔ مجموعی طور پر پورا شمارہ ہی مطالعے کے لائق ہے۔

صائمہ نکہت، مدرس: مدرسہ فاروقیہ سلطان العلوم، مومن پورہ، برہان پور (ایم پی

'اردو دنیا' جنوری 2025 کا شمارہ موصول ہوا۔ یوں تو شمارے کا ہر مضمون قابل تعریف ہے بالخصوص ڈاکٹر محمد آدم کا مضمون 'ڈپٹی نذیر احمد آثار و افکار' اور ڈاکٹر محمد شریف کا مضمون 'شیخ عبدالغنی کے افسانوں میں لداخ کی تہذیب و معاشرت' قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر محمد آدم کا مضمون 'نذیر احمد آثار و افکار' نذیر احمد کے ناولوں کا موضوعاتی سطح پر جائزے کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد شریف کا مضمون 'شیخ عبدالغنی کے افسانوں میں لداخ کی تہذیب و معاشرت' میں شیخ عبدالغنی کے افسانوں سے چند اقتباسات پیش کیے ہیں جو لداخ کی تہذیب و معاشرت کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ اس شمارے کا ہر مضمون عمدہ اور معلوماتی ہے جو قارئین کی علمی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔

اقرا شفیع، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی

ماہنامہ 'اردو دنیا' جنوری 2025 کا شمارہ موصول ہوا۔ پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ شمارے کے تمام مضامین اہم اور قابل تعریف ہیں، بالخصوص محمد معراج عالم کا 'بہار کے اردو ناولوں میں شہری زندگی کی عکاسی'، امیر حسن کا 'اکبرالہ آبادی کی شاعری میں مشرق کا تصور' اور محمد شریف کا 'عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخ کی تہذیب و معاشرت'۔

محمد معراج عالم نے بہار کے تہذیبی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہاں کی شہری زندگی کی عکاسی کرنے والے اردو ناولوں کا بڑے فنکارانہ انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے۔ امیر حسن نے اکبر الہ آبادی کی شاعری میں مشرق کے تصور میں اکبر کے مکمل نظامِ فکر کو اجاگر کیا ہے۔ محمد شریف نے عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخ کی مخصوص تہذیب، ثقافت، تاریخ اور معاشرتی ڈھانچے کے پہلوؤں کو نہایت احتیاط سے کھنگالا ہے اور انھیں فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ مضمون اس لیے بھی اہم ہے کہ لداخ جیسے غیر اردو علاقے میں اردو کا یہ سپہ سالار حال ہی میں راہیِ ملکِ عدم ہوا ہے۔ مجموعی طور پر ماہنامہ 'اردو دنیا' کا یہ شمارہ ادبی دنیا میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ یہ شمارہ اردو ادب کے طلبہ، اساتذہ اور تحقیق کاروں کے لیے کارآمد ثابت ہے۔

صبی جان: ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی

'اردو دنیا' جنوری 2025 کا شمارہ نظر نواز ہوا، نہایت پرکشش اور تازہ مضامین کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ یوں تو اس شمارے کا ہر مضمون جاذبِ نظر ہے بطور خاص شاہد وصی کا مضمون 'تنقید کی زبان'، گیان چند جین کا 'علم اللغات اور لفظ اصلیات'، ڈاکٹر محمد شریف کا 'عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخ کی تہذیب و معاشرت' قابلِ مطالعہ ہیں۔ شاہد وصی کا مضمون 'تنقید کی زبان' تنقید میں اسلوب کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ گیان چند کا مضمون اپنی نوعیت میں منفرد ہے جو زبان دانی اور الفاظ شناسی کے حوالے سے نہایت معلوماتی ہے۔ 'عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخ کی تہذیب و معاشرت' میں عبدالغنی شیخ کے افسانوں سے اقتباسات چن کر لداخ کی تہذیب و معاشرت کے نمایاں پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

ذاکر احمد: ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی

ماہنامہ 'اردو دنیا' جنوری 2025 کا شمارہ میرے مطالعے میں رہا اور میرے لیے یہ معلوماتی ثابت ہوا۔ اگرچہ پورا شمارہ ہی قابلِ مطالعہ ہے۔ تاہم عبدالغنی شیخ پر لکھا گیا مضمون 'عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخ کی تہذیب و معاشرت' میرے لیے متاثر کن اور معلوماتی ہے۔ میرے خیال میں عبدالغنی شیخ پر لکھا گیا یہ مضمون ان کی شخصیت اور تخلیقات کے ساتھ ساتھ لداخ کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے شام و سحر کو بھی موثر انداز میں پیش کرتا ہے۔

عبدالغنی شیخ کی مختصر کہانیاں لداخ کے ثقافتی، سماجی اور سیاسی منظرنامے کو بڑے دلنشین انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں عموماً شناخت، روایت اور تبدیلی جیسے موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں جن کے ذریعے لداخی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بہت گہرائی سے بیان کیا جاتا ہے۔ عبدالغنی شیخ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں وہ بیک وقت مورخ، تبصرہ نگار، خاکہ نگار، ناول نگار، افسانہ نگار اور ادیب ہونے کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ ایک طرف انھوں نے اردو فکشن کو ایک نیا روپ دیا تو دوسری طرف لداخ کی تاریخ کو زندہ رکھنے میں اہم کارنامہ انجام دیا۔

بلال احمد گوجر، ریسرچ اسکالر کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل سرینگر

جنوری 2025 کا شمارہ ہمیشہ کی طرح وقت پر موصول ہوا، الٹ پلٹ کر دیکھا، سرورق پر ترنگا آن بان شان سے لہرا رہا ہے۔ ٹائٹل بے حد دلچسپ اور جاذبِ نظر ہے۔ اداریے میں بھارتیہ بھاشا اتسو پر بہت معلوماتی گفتگو کی گئی ہے۔ جے این میں 'معاصر اردو ادب کا تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی منظر نامہ' کے عنوان سے جو سمینار منعقد ہوا تھا اس کی مفصل رپورٹ شہلا کلیم نے تحریر کیا ہے، اس رپورٹ کو پڑھ کر سمینار کی رنگارنگی اور اس کی کامیابی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور سترہ مضامین مختلف موضوعات پر اس میگزین کی زینت بنے ہیں، خاص طور پر تمل ادبیات واقدار کے تحت جو مضامین ہیں وہ بہت اہم ہیں، ان میں تمل ادب پر بہت ہی معلوماتی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ واقعی یہ رسالہ ہم جیسے قارئین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔

حذیفہ شمیم، بتیا، دربھنگہ، بہار

'اردو دنیا' دسمبر 2024 باصرہ نواز ہوا۔ سرورق پر قلم اور دوات کی رونمائی شمارے کی رعنائی میں اضافہ کیے ہوئے ہے۔ پس منظر سادہ ہے۔ قلم خاموشی سے اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ 'من شاہ جہانم'۔ بے شک سرورق آنکھوں میں رچ بس گیا۔ خط لکھتے وقت عزیز نبیل کے شعر نے مدد کی۔

چمک اٹھا ہر ایک پل، مہک اٹھے قلم دوات کسی کے نام دل کا انتساب لکھ رہے تھے ہم

ہماری بات میں مدیر محترم نے اردو زبان پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ ابتدائی پانچ سطروں میں اردو کی عظمت کا بیان ہے۔ بعد ازاں مستقبل کے لیے اردو کے روڈ میپ کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ یہ باتیں دعوتِ فکر دینے والی ہیں۔ بزمِ جہاں کے انداز کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ ہمیں اپنا انداز بدلنا ہوگا، کیونکہ معاصر ادب کے معاملات و مسائل جب تک ہماری زبان کا حصہ نہیں بنیں گے تب تک ان کی اہمیت نہ ہوگی۔ آپ کی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی درست ہے کہ ہمیں اپنے ملک اور مٹی کا قرض اتارنا ہوگا کہ اس زبان کے خمیر میں محبت ہے، ایثار بھی اور قربانی بھی۔ ادبی مباحث کے زیر عنوان 'وہاب اشرفی کے افسانے' اس شمارے کا بہت عمدہ مضمون ہے۔ اس سے یقیناً وہاب شناسی میں مدد ملے گی۔ شخصیات کے تحت 'انجم مانپوری: ایک منفرد طنز نگار' پڑھ کر خوشی ہوئی۔ بحیثیت مجموعی سال رواں کا آخری شمارہ بھی یادگار ہے۔

محمد رفیع انصاری، 'المدنی' 734 بھوسار محلہ، بھیونڈی 421302 ضلع تھانے، مہاراشٹر

اے۔ رحمان

اردو ادب میں وقت کا تصور

یہ موضوع ایک بنیادی سوال پیدا کرتا ہے کہ وقت کے تصور سے وقت کا کون سا تصور مراد ہے۔ مختلف مذاہب، اساطیر، فلسفوں اور سائنس نے وقت پر غور و فکر اور مباحث کے بعد مختلف اور گوناگوں نظریات قائم کیے ہیں، اور سائنس کے شعبے میں تو فکر و تحقیق مستقل جاری ہے۔ معاملہ ادب کے وسیع و عریض میدان سے تعلق رکھتا ہے اور کسی صنف ادب کو مختص کیے بغیر ضروری ہو جاتا ہے کہ وقت کے تصور پر بنیادی گفتگو کر لی جائے۔

'وقت آوارہ ہوا کی مانند'۔ اگر حمایت علی شاعر کے اس مصرعے کو لغوی طور پر قبول کر لیا جائے تو وقت' ایک بے سمت حرکیاتی اکائی یا وجود ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ 1966 کی ایک فلم' وقت' میں ساحر لدھیانوی کا مشہور نغمہ تھا' وقت سے دن اور رات... وقت سے کل اور آج... وقت کی ہر شے غلام... وقت کا ہر شے پہ راج۔ بنیادی طور پر وقت کے لیے عوامی محاورہ بھی یہی ہے اور عوام الناس کے ذہنوں میں وقت کا کم و بیش تصور بھی۔ فلم اور فلمی نغمے کا حوالہ میں نے بلا جھجک دیا ہے کیونکہ برگساں کا قول ہے:

"There is nothing in philosophy which could not be said in everyday language."

فلسفے میں ایسی کوئی چیز نہیں جس کو روز مرہ کی زبان میں بیان نہ کیا جا سکے۔ اپنے نغمے میں ساحر نے ان تمام اعتقادات کا ذکر کیا ہے جو عام طور پر وقت سے منسوب ہیں۔ وقت لاتا ہے بہاریں، وقت لاتا ہے خزاں۔ وقت کی پابند ہیں آتی جاتی رونقیں۔ وقت ہے پھولوں کی سیج۔ وقت ہے کانٹوں کا تاج۔ لیکن یہ سب وقت کے خارجی اوصاف ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود وقت کیا ہے۔ عام وجودی اصطلاح میں اس کی تعریف یا شناخت کیونکر ہو۔ اب جاوید اختر کے یہ مصرعے دیکھیے:

یہ وقت کیا ہے/ یہ کیا ہے آخر کہ جو مسلسل گزر رہا ہے/ یہ جب نہ گزرا تھا/ تب کہاں تھا/ کہیں تو ہوگا/ گزر گیا ہے/ تو اب کہاں ہے/ کہیں تو ہوگا/ کہاں سے آیا کدھر گیا ہے/ یہ کب سے کب تک کا سلسلہ ہے/ یہ وقت کیا ہے

اب ان مصرعوں میں شاعر نے اس سوال کو نظم کر دیا ہے جو آغاز تہذیب سے انسان کو درپیش رہا ہے۔ وقت کے عمومی تصور میں کیونکہ وقت کو گذران یعنی تحرک سے وابستہ کیا گیا ہے اس لیے بنیادی سوال' وقت کیا ہے' اور اگر یہ کوئی گزرنے والی شے ہے تو پھر یہ تعریف جس منطقی سوال کو جنم دیتی ہے اسے بھی جاوید اختر بڑے خوبصورت انداز میں پوچھتے ہیں۔

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں/ کہ چلتی گاڑی سے پیڑ دیکھو/ تو ایسا لگتا ہے/ دوسری سمت جا رہے ہیں/ مگر حقیقت میں/ پیڑ اپنی جگہ کھڑے ہیں/ تو کیا یہ ممکن ہے/ ساری صدیاں/ قطار اندر قطار اپنی جگہ کھڑی ہوں/ یہ وقت ساکت ہو/ اور ہم ہی گزر رہے ہوں/ اس ایک لمحے میں/ سارے لمحے/ تمام صدیاں چھپی ہوئی ہوں/ نہ کوئی آئندہ/ نہ گذشتہ/ جو ہو چکا ہے/ جو ہو رہا ہے/ جو ہونے والا ہے/ ہو رہا ہے/ میں سوچتا ہوں/ کہ کیا یہ ممکن ہے/ سچ یہ ہو/ کہ سفر میں ہم ہیں/ گزرتے ہم ہیں/ جسے سمجھتے ہیں ہم/ گزرتا ہے/ وہ تھما ہے/ گزرتا ہے یا تھما ہوا ہے/ اکائی ہے یا بٹا ہوا ہے/ ہے منجمد/ یا پگھل رہا ہے/ کسے خبر ہے/ کسے پتا ہے/ کہ وقت کیا ہے

اب یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ نظم کے اس بند میں شاعر نے جو سوالات قائم کیے ہیں آئن سٹائن نے انھیں سوالوں کا جواب اپنے نظریہ اضافت میں دیا جس کی اشاعت انھوں نے 1905 میں کی تھی۔ اس کا کچھ ذکر آگے آئے گا۔

جیسا کہ میں نے کہا تہذیب کے آغاز سے ہی انسان کے سامنے وقت ایک بہت بڑے معمے کی صورت میں کھڑا ہوا ہے۔ فلسفہ، مذہب اور سائنس تینوں نے اپنے اپنے عقائد اور طریقوں سے اسے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کی لیکن ان تینوں کے ذریعے اخذ کیے گئے نتائج باہم متصادم ہیں۔ اس کے باوجود وقت ہمارے یعنی عوام الناس کے لیے کائنات اور زندگی کی ایسی تاریخی حقیقت معلومہ (Given) بن چکا ہے کہ اب یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ ازمنہ قدیم کی تہذیبوں میں انسان وقت کا کوئی مختلف تصور رکھتا ہوگا۔ تہذیب انسانی کی توقیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو مصر قدیم میں سب سے پہلے وقت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی اور

حالانکہ اس وقت مصری لفظیات میں وقت کے لیے کوئی صریح اور واضح اصطلاح موجود نہیں تھی۔ اس کے باوجود قدیم مصریوں نے ہی وقت کو دنوں، پہروں اور گھنٹوں کے Sections میں تقسیم کرکے وقت کا وہ عمومی تصور قائم کیا جو آج دنیا بھر میں مروج و مستعمل ہے اور قدیم مصریوں کے ذریعے کیے گئے اسی تقسیم ادوار اور تصور وقت کا جائزہ لینے سے وہ تناظر قائم ہوتا ہے جس میں وقت کی عصری تفہیم کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ مصری تہذیب کا مکمل انحصار دریائے نیل پر تھا۔ انھوں نے دریا کو گھٹتے بڑھتے اور پھر گھٹتے دیکھا، ماحول کو کبھی سرد کبھی گرم اور کبھی پھر سرد محسوس کیا، ہواؤں کے رخ بدلتے دیکھتے اور اس طرح ان مختلف وقفوں سے واقف ہوئے جو ایک تسلسل سے آتے جاتے رہے اور جن کو بعد میں موسم سے موسوم کیا گیا اور اس طرح وقت کے بنیادی تصور نے ان کے ذہن میں جگہ بنائی۔ لیکن وقت کا وہ بنیادی تصور ان کے ذہن میں ایک دائرے کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ موسم جاتے تھے اور پھر آجاتے تھے۔ قدیم ہندو فلسفے میں بھی وقت کا تصور Cyclical یعنی دائرے کی صورت میں ہے جسے کال چکر کہا گیا۔

مصری تہذیب کے بعد وقت کے بارے میں اہم نظریات یونان میں قائم ہوئے۔ سقراط سے پہلے دنیائے موجودات کے سلسلے میں دو متضاد فلسفے تھے۔ ایک وہ جو اکتسابی علم پر مبنی تھا اور دوسرا وہ جو غیر عقلی عقائد اور علم مخالف نظریات پر۔ سقراط نے دانش اور دانشوری کا رخ فطری فلسفے اور کائناتی طبیعات کی جانب سے ہٹا کر مادی دنیا اور اخلاقیات کی جانب موڑ دیا۔ اس کے شاگرد افلاطون نے فلسفے کو مادہ پرستی اور سیاست پر فوقیت دیتے ہوئے 387 قبل مسیح میں 'اکیڈمی' قائم کی اور مکالمات کے ذریعے فطرت انسانی، ریاست، اخلاقی اقدار، علم اور لسانیات وغیرہ پر منضبط نظریے تشکیل دیے۔ اس نے زمان و مکان کی فلسفیانہ تعبیر بھی کی جن کے نتیجے میں ثبات Permanence اور تغیر یعنی Change کی اصطلاحات وجود میں آئیں۔ فلسفے کو حسی تجربے یعنی سائنس کے دائرے میں لانے کی ابتدائی کوشش افلاطون کی فکر میں ہی نظر آتی ہے۔ شروع میں افلاطون کا عقیدہ تھا کہ خالق (Creator) نے کائنات کی تخلیق کے ساتھ ساتھ وقت کی بھی تخلیق کی لیکن بعد میں اس نے حرکتِ سیارگان کے وقفوں سے وقت کی پیمائش کی۔ اس نے وقت کی اصطلاح کو ایسے وجود کے معنی میں استعمال کیا جو تبدیلی سے آزاد ہے یعنی جس کا کوئی ماضی، حال اور مستقبل نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ارسطو نے اس لفظ سے مراد لی ایک ایسا وجود جو ہمیشہ قائم رہنے والا (Everlasting) ہو افلاطون اور ارسطو کے تصور وقت میں بنیادی فرق یہ تھا کہ افلاطون نے وقت کا ایک آغاز مقرر کیا تھا جبکہ ارسطو کا نظریہ تھا کہ وقت کا آغاز اور انجام ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں یعنی نہ آغاز ہے نہ انجام بلکہ ہمیشگی۔ یعنی ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے۔ ارسطو نے وقت کی تعریف تعداد سے کی۔ یعنی وقت مسلسل حرکات کی تعداد ہے۔ یہ تبدیلی نہیں بلکہ ایک ایسی شے ہے جس کا تبدیلی پر انحصار ہے۔ ایسی تبدیلی جس کو 'پہلے' اور بعد کے تعلق سے شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک آفاقی ترتیب ہے جس میں تمام

وقت کے تمام پہلو حقیقی ہیں اور ماضی اور مستقبل اتنے ہی قابل ادراک ہیں جتنا کہ حال۔ آئن سٹائن نے اس مفروضے کو بھی باطل قرار دیا کہ وقت محض وہم ہے۔

تبدیلیاں ایک دوسرے سے متعلق ہو کر ایک سلسلہ بناتی ہیں۔ اس تشریح پر ارسطو کے دو نہایت الجھن آمیز اور پیچیدہ دعوے استوار ہیں۔ ایک تو یہ کہ 'اب' یعنی لمحہ موجود ایک متحرک شے ہے اور دوسرے یہ کہ 'وقت' کا وجود 'روح' پر مبنی ہے۔ چوتھی صدی عیسوی میں ارسطو کے اس نظریۂ وقت سے Augustine نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ یہ نظریہ قابل قبول نہیں کیونکہ کائنات کا ایک آغاز ہے۔ ظاہر ہے اس کا اختلاف اس کے اعتقاد (انجیل) پر مبنی تھا۔ لیکن اب آغازِ کائنات سے 'قبل' کا مسئلہ آیا جس کے جواب میں آگسٹین نے کہا کہ خدا نے کائنات کے ساتھ ہی 'وقت' کی تخلیق کی اس لیے آغاز کائنات سے قبل 'وقت' کا تصور بے کار ہے۔ لیکن یہ نظریہ مذہبی عقیدے پر مبنی تھا لہٰذا ارسطوئی فلسفہ بعد کے فلسفیوں کی رہنمائی کرتا رہا حتیٰ کہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں گلیلیو اور نیوٹن نے وقت کا ایک سائنسی تناظر قائم کیا جو مکمل طور سے ریاضیاتی فارمولوں پر مبنی ہے لہٰذا اس کا ذکر بے محل ہوگا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ زمان و مکاں کا رشتہ اور اس کا مضبوط ارتباط سمجھ میں آ گیا۔ انیسویں صدی میں Thermodynamics کی دریافت نے نیوٹن کے نظریات کو تبدیل کر دیا اور اس کے بعد وقت کے تصور میں سب سے بڑا انقلاب بیسویں صدی میں آیا جب آئن سٹائن نے اپنا نظریہ اضافت شائع کیا۔

بہت سادہ الفاظ میں کہا جائے تو آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کی رو سے زمان و مکان کے چار جہاتی ڈھانچے میں وقت ایک خلا ہے ان معنی میں کہ ہر واقعہ وقت کے اس خلا میں اپنا ایک مقام، ایک پتہ رکھتا ہے۔ وقت کے تمام پہلو حقیقی ہیں اور ماضی اور مستقبل اتنے ہی قابل ادراک ہیں جتنا کہ حال۔ آئن سٹائن نے اس مفروضے کو بھی باطل قرار دیا کہ وقت محض وہم ہے۔

2015 میں امریکی ٹیلی ویژن پر ایک سلسلہ وار پروگرام شروع ہوا جس کا عنوان تھا 'حقیقت سے قریب تر' Closer to Truth اس کے تحت کائنات اور انسانی شعور کے عمیق ترین اسرار کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے ایک Episode 'وجود کے راز: اگر کوئی چیز ہے تو کیوں ہے' میں کیمبرج پروفیسر رابرٹ لارنس کون نے آئن سٹائن اور اسٹیفن ہاکنگ کے وقت سے متعلق نظریات کو بیان کرتے ہوئے آسان زبان میں وقت کی تشریح کرتے ہوئے کہا 'وقت متنازع کیوں ہے؟ وقت تو 'ہے'۔ اس کا احساس ہوتا ہے وہ غیر محسوس طریقے سے آگے بھی بڑھتا ہے۔ اس میں دریا کا بہاؤ ہے، دورانیہ ہے ترتیب ہے۔ ایک کے بعد ایک واقعات ہوتے ہیں۔ واقعات کا درمیانی وقفہ قابل پیمائش ہے۔ سوال بس یہ ہے کہ کیا یہ تمام اوصاف حقیقی اور طبیعاتی دنیا کا حصہ ہیں یا ذہن انسانی کے مصنوعی پیکر۔ ہوسکتا ہے وقت وہ نہ ہو جو ہم سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک آفاقی پس منظر ہے۔ ایک ایسا ابدی اسٹیج جس پر تمام واقعات جو ہورہے ہیں، ہورہے ہیں۔

اسٹیفن ہاکنگ نے وقت کی تعبیر کرتے ہوئے اس میں ایک نئے زاویے کا اضافہ کیا۔ متصورہ وقت یعنی Imaginary Time اپنی کتاب 'وقت کی ایک مختصر تاریخ' میں ہاکنگ نے یہ بنیادی نظریہ پیش کیا کہ

تمام سائنسی شواہد اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کائنات ہمیشہ سے نہیں تھی بلکہ آج سے تقریباً 15 کھرب سال پہلے اس کا آغاز ہوا اور یہ کائناتی سائنس یعنی Cosmology کی بہت بڑی دریافت ہے۔ حالانکہ ابھی یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ کبھی کائنات ختم بھی ہوگی۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں اگر کبھی ختم ہوئی بھی تو کم از کم بیس کھرب سال بعد ہوگی۔ ہاکنگ کہتا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی تک یہ بحث چلتی رہی کہ کائنات ہمیشہ سے تھی یا اس کا کبھی آغاز ہوا لیکن یہ بحث فلسفے اور مذہبیات پر ہی مبنی رہی۔ قابل مشاہدہ ثبوت وشواہد نہیں دیکھے گئے۔ ماہر علم کائنات یعنی Cosmologist سر آرتھر ایڈنگٹن نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر آپ کا نظریۂ کائنات مشاہدات کے موافق نہ ہو تو گھبرایئے مت ہو سکتا ہے مشاہدات غلط ہوں۔ لیکن اگر آپ کا نظریہ Thermodynamics کے دوسرے قانون سے ٹکراتا ہے تو پھر آپ کا نظریہ بڑی مشکل میں پڑ جائے گا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ سائنس جس چیز کو تجربے سے ثابت کر دے اس کا ابطال ممکن نہیں۔

اب بات آتی ہے سٹیفن ہاکنگ کے متصورہ وقت کی۔ وقت کو اور وقت کے بہاؤ کو rectilinear یعنی خطِ مستقیم کی صورت تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ہاکنگ کہتا ہے کہ ایک افقی خطِ مستقیم تصور کیجیے۔ اس کے مشرقی یعنی دائیں سرے پر ماضی ہے اور بائیں سرے پر مستقبل۔ لیکن متصورہ وقت یعنی Imaginary time ایک خطِ عمودی ہے۔ حقیقی وقت میں آپ صرف آگے کی جانب سفر کر سکتے ہیں۔ ماضی اور مستقبل کا سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ آپ ماضی کو یاد کر سکتے ہیں مستقبل کو نہیں۔

متصورہ وقت (عمودی) میں آگے اور پیچھے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ شمال سے جنوب چلیں تو جب واپس لوٹیں گے تو جنوب سے شمال ہوگا۔ یہ آگے اور پیچھے کا واضح تصور ہے۔ متصورہ وقت میں آگے اور پیچھے جا سکتے ہیں۔ حقیقی وقت میں نہیں۔

مختلف سائنسی نظریات... جو باہم متضاد بھی ہیں... کے تجزیے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سائنس بھی ابھی تک وقت کی کوئی حتمی تعریف متعین نہیں کر سکی۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت میں زماں قید ہے مکاں میں تو اسٹیفن ہاکنگ کی 'مختصر' تاریخ اربوں کھربوں سال کی بات کرتی ہے اور ظاہر ہے

انسانی تجربے کی رو سے وقت ایک ایسا بہاؤ ہے جس کی رفتار ناقابلِ فہم ہے۔ اس پہلو سے زمان کا تصور مکان کے تصور سے کہیں زیادہ پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔

جب کوئی 'دورانیہ' مذکور ہو تو اس کا آغاز اور انجام بھی فرض کیا جائے گا۔ وقت کا ایک دیو مالائی یعنی اسطوری تصور بھی زیرِ بحث آتا ہے لیکن میکس ملر کی تشریح کے مطابق وہ نظریہ لسانیاتی ہے کیونکہ ہر دیو مالا بنیادی طور پر کسی زبان سے پیدا ہوئی اور نہ صرف لسانی تبدیلیوں بلکہ گذرتے 'وقت' کے ساتھ ساتھ دیو مالائی عقائد بدلتے گئے حتیٰ کہ مذاہب (جنھیں اصلاً دیو مالائی عقائد کی ترقی یافتہ شکل بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ تمام آسمانی کتابوں میں 'ماضی' کی کہانیوں کو ہی مثال یا عبرت کے لیے بیان کیا گیا ہے) نے وقت کو اپنے اپنے بنیادی عقیدے کے تناظر میں پیش کیا۔ زرتشت نے ساتویں صدی قبل مسیح میں جس مذہب کو متعارف کیا اس میں نہ صرف نیکی بدی کی باہم متصادم قوتوں بلکہ اچھے برے اعمال کا عاقبت (دوسری زندگی) میں نتیجہ بھگتنے کا ذکر تھا۔ 'ژنداوستا' میں یہ یقین بھی دلایا گیا کہ انسان مرنے کے بعد ایک 'نجات دہندہ' کے ذریعے دنیا میں واپس لایا جائے گا۔ دنیا کی 'عمر' زرتشت نے بارہ ہزار سال مقرر کی تھی جو تین تین ہزار سال کے چار دورانیوں پر مشتمل تھی۔ ان چار ادوار کے بعد نیکی کے بدی پر غالب آنے کا دعویٰ کیا گیا لیکن اس کے بعد 'وقت' کے حوالے سے صورتِ حال کیا ہوگی یہ واضح نہیں ہوتا۔ زرتشتی مذہب میں 'خالق' خدا یا اللہ کے وجود کا بیان مبہم ہونے کے باعث اسے آسمانی مذہب تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام اہم ترین آسمانی مذاہب ہیں اور تینوں میں کائنات اور دنیا کی 'ابتدا' اور 'انتہا' یا اختتام کا واضح تصور موجود ہے۔ یہودیت میں 'تاریخ' (ماضی) کو بہت اہمیت دی گئی ہے، یہاں تک کہ خالق (تورات میں یہودا) کو 'رب التاریخ' کا لقب دیا گیا ہے۔ تخلیق کائنات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اسے ایک عظیم تاریخی واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ یہودا اس دنیا کو فنا کر کے ایک دن نئی دنیا تخلیق کرے گا جس میں نیک یہودی (اسرائیلی) ایک پر مسرت ابدی زندگی گذاریں گے۔ عیسائیت اور اسلام دونوں میں تخلیقِ عالم اور فنائے عالم کے عقائد تقریباً یکساں ہیں لیکن زماں کے تعلق سے اسلام میں مسئلہ ذرا الجھا ہوا ہے کیونکہ ایک حدیثِ قدسی ہے ''زمانے کو برا مت کہو کیونکہ زمانہ میں خود ہوں''۔ قرآن میں 'عصر' کی قسم کھائی گئی ہے اور کئی مفسرین نے عصر سے زمانہ مراد لیا ہے۔ بخاری میں حدیث ہے ''ابنِ آدم زمانے کو کوستا ہے اور زمانے کا مالک میں ہوں رات دن میرے ہاتھ میں ہے'' ایک اور دلچسپ حدیث ہے ''انگور کو کرم نہ کہو اور نہ یوں کہو ہائے رے خراب زمانہ کیونکہ زمانہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس طور دیکھا جائے تو زمانہ خالقِ مطلق کی ذات سے الگ کوئی شے نہیں جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ علامہ اقبال نے برگساں کے اعتراض کے جواب میں یہی کہا تھا 'نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ'۔

لیکن وقت اگر کوئی متحرک اکائی یا phenomenon ہے تو وہ سفر تو کر رہا ہے، بہہ رہا ہے، گذر رہا ہے جس کے نتیجے میں تغیر رونما ہوتا نظر آتا ہے۔ ابتدا اور انتہا کی خبر تو نہیں معلوم لیکن اپنے 'ہونے' کا وہم تو ہے۔ اس وہم کا ادراک تو ہے۔

میں وقت کے فلسفیانہ تصور کے ذکر سے گریز کر رہا ہوں کیونکہ تقریباً تمام فلسفوں میں وقت اور کائنات کے باہمی تعلق کی جس طور تشریح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے محض فلسفیوں کی ژولیدہ خیالی کا تاثر ملتا ہے اور معمہ سلجھنے کے بجائے زیادہ الجھ جاتا ہے۔ لیکن انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا میں وقت کی جو تعریف درج ہے اسے نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اس واسطے کہ وہاں سائنس اور فلسفے دونوں سے استفادہ صاف نظر آتا ہے:

''انسانی تجربے کی رو سے وقت ایک ایسا بہاؤ ہے، جس کی رفتار ناقابلِ فہم ہے۔ اس پہلو سے زمان کا تصور مکان کے تصور سے کہیں زیادہ پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ وقت 'کتنا' فی سیکنڈ کی رفتار سے گذرتا ہے یا ہم اس میں گذرتے ہیں کیونکہ (اس پیائش کے لیے) تغیر کا کوئی مختلف پیمانہ درکار ہے جسے آپ ہائپر ٹائم (hyper- time) کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ ہائپر ٹائم اگر خود بھی بہہ رہا ہو تو پھر کسی ہائپر ٹائم کی ضرورت ہوگی جس سے وقت کی

رفتار کا اندازہ لگایا جا سکے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا۔ ساتھ ہی اس سوال میں ایک اور سوال پوشیدہ ہے کہ اگر دنیا زمان و مکان پر مشتمل ہے تو انسانی ذہن بھی دنیاوی رخ پر ہی بہہ رہا ہے۔ اگر ہاں تو اس کی رفتار کیا ہے۔ کیا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات اس وقت اچانک عدم سے وجود میں آتے ہیں جب حالیہ لمحہ (بیتتے ہوئے) ان تک پہنچتا ہے یا اس کے برعکس ہوتا ہے اور یہ کہ زمان و مکان میں مستقل ہونے والی تبدیلیوں کا کیا جواز ہے۔ اس کے علاوہ نشے اور جنونی کیفیت کی حالت میں ہونے والے وقت کے مسخ شدہ تجربے کو دیکھا جائے تو یہ چیز بھی سامنے آتی ہے کہ کسی شدید ہیجانی کیفیت میں انسان وقت کی رفتار اور گذران کا درست طریقے سے ادراک نہیں کر پاتا۔ اس نوعیت کے حقائق وقت کی ماہیت کو واضح کرنے کے بجائے اسے مزید الجھا دیتے ہیں اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی حافظہ یک سمتی (unidirectional) کیوں ہے۔''

اب بات آتی ہے اردو 'ادب' میں وقت کے تصور کی تو میں نے اس کے لیے فکشن، خصوصاً ناول کا انتخاب کیا ہے۔ وجہ یہ کہ اول تو شاعری خاص طور پر غزلیہ شاعری میں کسی ایک فکر یا فلسفے کا منطقی تواتر (consistency) نہیں پایا جاتا، دوم یہ کہ غزل عموماً مسلسل بیانیہ نہیں ہوتی لہٰذا ایک ہی غزل کے مختلف اشعار میں مختلف اور متضاد فلسفیانہ نکات یا نظریات کی موجودگی عجب نہیں سمجھی جاتی، مگر یہ فیصلہ تو کیا نہیں جا سکتا کہ شاعر کس نظریے یا فلسفے کی حمایت کر رہا ہے۔ نظم کا معاملہ جدا ہے۔ زیادہ تر تاثراتی یا موضوعاتی ہونے کی بنا پر نظم کسی مخصوص نظریے یا فلسفے کا منطقی تواتر سے اظہار کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔ میں نے مضمون کا آغاز ہی جاوید اختر کی نظم سے کیا تھا لیکن اس میں وقت کے تعلق سے سوال اٹھائے گئے ہیں، کوئی ایسا نظریہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی جو کسی سوال کا جواب دیتا نظر آئے۔ اس کے برعکس اوپر بیان کی گئی ایک حدیثِ قدسی کو عنوان بنا کر ن۔ م۔ راشد نے جو نظم کہی اس میں تصورِ وقت کے حوالے سے تخلیقی واردات کا اظہار کیا گیا ہے۔

زمانہ خدا ہے

زمانہ خدا ہے
اسے تم برا مت کہو
مگر تم نہیں دیکھتے، زمانہ فقط ریسمانِ خیال
سبک مایہ، نازک، طویل
جدائی کی ارزاں سبیل
وہ صبحیں جو لاکھوں برس پیشتر تھیں
وہ شامیں جو لاکھوں برس بعد ہوں گی
انھیں تم نہیں دیکھتے، دیکھ سکتے نہیں
کہ موجود ہیں، اب بھی، موجود ہیں وہ کہیں
مگر یہ نگاہوں کے آگے جو رسی تنی ہے
یہ رسی نہ ہو تو کہاں ہم میں تم میں
ہو پیدا یہ راہِ وصال

ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی اپنی ایک نظم میں وقت کا تجزیہ یوں کیا ہے۔

وقت ٹھہرا ہوا ہے

زماں کی روانی فقط واہمہ ہے
زماں... گول منکوں کا اک ڈھیر جس کو
مری انگلیاں رات دن گن رہی ہیں
مری انگلیوں کو پتہ ہے کہ ہر گول منکا
جو بے حس پڑا ہے
فقط ایک پل ہے کہ جس کی
ازل بھی نہیں
اور ابد بھی نہیں ہے
مگر دیکھنے والے کہتے ہیں
منکے رواں ہیں
مری انگلیوں سے گذرتے چلے جا رہے ہیں
زماں کی روانی فقط واہمہ ہے
ہر اک شے
خود اپنی جگہ پر
حنوطی ہوئی لاش ہے
وقت کی منجمد قاش ہے
وقت ٹھہرا ہوا ہے

اختر الایمان جنھوں نے غزل کو درگذر کرتے ہوئے صرف نظم کو ذریعۂ اظہار بنایا تھا اور وقت کی تمام جہات اور وصفی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اپنے مجموعے 'بنت لمحات' کے پیش لفظ میں کہتے ہیں: ''میری شاعری میں وقت کا تصور ایسے ہے جیسے وہ میری ذات کا حصہ ہو۔''

زلزلہ اف یہ دھاکہ یہ مسلسل دستک
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو

———

کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو
کیا خبر وقت دبے پاؤں چلا آیا ہو

———

توڑ ڈالے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا

وقت یعنی زماں سے یہ خدشہ کہ وہ 'مکاں' کی دیوار توڑ ڈالے گا اختر الایمان کے تصورِ وقت اور زمان و مکاں کے باہمی رشتے کے تئیں ان کے ادراک و احساس کی غمازی کرتا ہے۔

فکشن میں افسانہ اور ناول دونوں شامل ہیں لیکن پلاٹ اور کرداروں کی لامحدودیت کے اوصاف کی بنا پر ناول اپنے وسیع تر کینوس میں فلسفوں اور نظریات کی ایک پوری کائنات لیے ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وقت کے تصور کو ناول کے تناظر میں تلاش کرنا افسانے کی نسبت کہیں زیادہ آسان اور نتیجہ خیز ہے۔ اردو ناول کی تاریخ یوں تو پچھلے تقریباً ایک سو پچیس سال پر محیط ہے لیکن ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے بعد بعض ادبی taboo تو زائل ہوئے ہی، ادب زندگی سے قریب تر ہو کر معاشرتی، نفسیاتی اور سیاسی مسائل کی آئینہ داری پر مائل ہوا اور بحیثیت صنفِ ادب ناول نے وہ جدید طرز اختیار کی جسے حقیقت نگاری کہا گیا۔ اس دور کے اہم ناول نگاروں میں عصمت چغتائی اور کرشن چندر جیسے نام بھی شامل ہیں لیکن وقت کا شعوری احساس بہت واضح طور پر سب سے پہلے عزیز احمد کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ 1948 میں شائع ان کا ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی' خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں انھوں نے نام نہاد 'اونچے طبقے' کی انفرادی اور معاشرتی نفسیات کا بڑا خوبصورت تجزیہ کرتے ہوئے اخلاقی اقدار کے زوال اور اس کے نتیجے کے طور پر رونما ہوئے تہذیبی المیے کو اپنے مرکزی کردار سلطان حسین کے ذریعے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ سماجی ریاکاری تہذیبی زوال کا آغاز ہے اور ان کا یہ کردار اسی زوال پذیر معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے بھی حالات سے مکمل طور پر متفق نہیں اور وقت کے بے رحم تفوق سے نبرد آزما ہے۔ اس کی اندرونی کشمکش جو دراصل پورے معاشرے کے نفسیاتی ڈھانچے کی عکاسی کر رہی ہے اس خود کلامی سے عیاں ہوتی ہے۔ ''بہتا ہوا پانی، دریا، سمندر، وقت۔ لیکن تخیل زندگی کا غلام ہے اور زندگی وقت کے دربار کی مسخری ہے اور وقت جو ساری دنیا کا احتساب کرتا ہے وہ بھی رک کر رہے گا۔ یوں کہا شیکسپیئر اور بہت سے ماہرینِ طبیعات نے۔ زندگی وقت کے

دربار کی مسخری۔ میں ۔۔ سلطان حسین، میری ابتدا میں میری انتہا ہے۔ پیدائش، افزائش نسل اور موت۔ میرے لیے سب کے سب بے معنی ہیں کیونکہ میں متوسط طبقے کا دہریہ بہتے ہوئے پانی، بپتسمہ کے چھینٹے، زنار کے دھاگے، تسبیح کے دانے پر یقین نہیں رکھتا۔''

اور یہ جملہ Augustine کے فلسفۂ وقت، خصوصاً زمان و مکاں کے باہمی رشتے کے بارے میں اس کے نظریے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔'سب کچھ تاریکی کی طرف جا رہا ہے۔ستاروں کے درمیان خلائے مکانی کی طرف۔'

جدید اردو ناول کا کینوس وسیع تر کرنے اور اس صنف کو نئی جہات عطا کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا قرۃ العین حیدر نے۔ان کا پہلا ناول 'میرے بھی صنم خانے' تقسیمِ ہند کے بعد 1948 میں شائع ہوا جس میں انہوں نے اودھ کے جاگیرداروں کی نفسیات، ملمع شدہ کردار اور معاشرتی رویوں کی مغربی طرزِ زندگی کے تناظر میں نہایت بھرپور عکاسی کی اور تقسیم کے المیے سے پیدا شدہ جذباتی انتشار اور نظریاتی بے سمتی کو بیان کرتے ہوئے وقت کو مکمل طور سے اس پورے انسانی حادثے کا ذمے دار ٹھہرایا ہے: '' ایک کارواں جو آگے بڑھتا ہے۔ماضی کا افسوس اور فردا کی فکر اس کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ نئے دن آتے ہیں اور نئی راتیں آتی ہیں۔ جھکڑ چلتا ہے، آندھیاں اٹھتی ہیں، کسی کو موت آتی ہے کسی کو نہیں آتی۔۔ ''پھر وقت کی پرواز کے ساتھ کوئی نیا معمہ بن جائے گا۔نیا حل تلاش کر لیا جائے گا۔ہم جہاں ہیں اس جگہ نہ ہوں گے۔یہ سے آگے نکل جائے گا۔زندگی کی مقناطیسی رو وقت کے ریگستانوں میں کھو جائے گی''۔۔۔ ''وقت بہت غلط موقعوں پر آگے بھاگ جاتا ہے اور ہم اسے واپس نہیں لا پاتے۔کتنی ہنسی کی بات ہے''

''وقت کی بات، یہ وقت کی بات۔جو لمحے گذر جاتے ہیں وہ واپس نہیں آ پاتے۔وہ اپنے ہونے کا شدید تکلیف دہ احساس چھوڑ جاتے ہیں۔''ایک اور ناول جو تصورِ وقت کے سلسلے میں اہمیت کا حامل ہے وہ ہے' کارِ جہاں دراز ہے'۔اس ناول میں وقت انسانی زندگی کے اہم ترین کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔

''ابھی میں خود مستقبل سے نکل کر آیا ہوں۔۔ میں وقت ہوں۔۔ زندگی کا کاغذ کترنے والا۔''

چودھری محمد نعیم اس ناول پر اپنے انگریزی مضمون میں لکھتے ہیں۔'' قرۃ العین کا بنیادی مسئلہ وقت ہے۔وہ بے چہرہ قوت جو تمام چہروں کے رنگ بدل دیتی ہے۔ جو افقی بھی ہے اور عمودی بھی، جسے ہم صرف اپنی ذات کے زیاں کی قیمت پر نظر انداز کر سکتے ہیں اور جو بیک وقت ایک عام گھڑی کی طرح سہل الحصول بھی ہے اور کائنات کی مانند بے کنار بھی۔''

فلسفے کی رو سے وقت سب سے بڑی طاقت ھے اور وقت کے بھاؤ یا گذران سے پیدا شدہ تغیر (جو وقت کے بھاؤ کا ثبوت بھی ھے) ایک ناقابل تردید حقیقت ھے۔یہ تغیر ھی انسان کے تمام دکھوں کا سبب ھے اور یہی اس کو آگھی تک پہنچاتا ھے۔اس تغیر کے سوا اور کہیں سے انسان روشنی (ھدایت) حاصل نہیں کر سکتا۔

لیکن 'آگ کا دریا' میں قرۃ العین کے ذریعے وقت کا جو tretment نظر آتا ہے وہ منفرد بھی ہے اور عدیم النظیر بھی۔وقت اس ناول کا موضوع ہی نہیں بلکہ واقعات کا سبب اور کرداروں کی شناخت ہے۔قرۃ العین کی کئی تحریریں اور آگ کا دریا خصوصی طور پر اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ بودھ فلسفے سے بہت متاثر رہی ہیں۔

'' پچھلی صدی میں کپل وستو کے شہزادے نے بھی جنگل کا راستہ اختیار کر کے ملک کی اس روایت کو نبھایا تھا۔۔ ان کی آمد کے وقت باسٹھ مدرسہ ہائے فکر اپنی مختلف شاخوں سمیت پہلے سے موجود تھے۔۔۔ خیالات کی اس سلطنت میں انھوں نے بھی۔جو شاکیہ منی سدھاوتے کہلائے۔فلسفے کی ایک اور نو آبادی قائم کر دی تھی۔ باسٹھ مختلف نظریات۔۔۔ اور زندگی ایک ہے۔۔انسان تنہا ہے۔۔۔ گوتم نے آنکھیں بند کر لیں''

(آگ کا دریا)

فلسفے کی رو سے وقت سب سے بڑی طاقت ہے اور وقت کے بہاؤ یا گذران سے پیدا شدہ تغیر (جو وقت کے بہاؤ کا ثبوت بھی ہے) ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔یہ تغیر ہی انسان کے تمام دکھوں کا سبب ہے اور یہی اس کو آگہی تک پہنچاتا ہے۔اس تغیر کے سوا اور کہیں سے انسان روشنی (ہدایت) حاصل نہیں کر سکتا۔

'' گوتم زندگی کا پھیلاؤ بہت عظیم ہے۔اس وسعت سے بچتے رہو۔۔ کائنات۔۔اور اس کی وسعت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ کہاں جاتی ہے؟ ہم کہاں پیدا ہوئے؟ کس طرح اور کس وجہ سے زندہ ہیں؟ اور یہاں سے کہاں جائیں گے؟ تم جو برہما سے واقف ہو۔ذرا بتلاؤ دکھ یا سکھ کس کے حکم سے یہاں رہ رہے ہیں؟ وقت یا فطرت۔۔یا حادثے۔۔یا عناصر کو سمجھا جائے اسے جو پرجوش کہلاتا ہے جو تمہارے نزدیک پرم آتما ہے؟ ہری شنکر نے بات ختم کی۔

اپنشدوں میں لکھا ہے کہ کائنات آزادی میں پیدا ہوئی آزادی میں موجود رہتی ہے اور آزادی میں سما جاتی ہے''

'' وہی ابدیت، ہری شنکر نے رنجیدہ آواز میں کہا، آزادی اور ابدیت ایک اور قید نہیں؟''

سوچتے سوچتے گوتم وقت کے اس نقطے پر لوٹ آیا جہاں وہ اس سے موجود تھا۔'' قید اس لیے ہوتی ہے'' اس نے گھاس پر سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔''کہ خودی اپنے آپ کو ذہن سے مماثل کر لیتی ہے، اور لہٰذا دکھ اور گناہ اور ذہنی اور اخلاقی کمزوریوں کا شکار ہو جاتی ہے اور پراکرتی کا تجربہ کسی کو تو کرنا ہے۔یہ تجربہ خالص روح کرتی ہے۔یہ تجربہ میں بھی کر رہا ہوں۔''اس نے سوچا۔'' یہ تجربہ کرتے کرتے کدھر نکل جاؤں گا، لیکن کوئی پرواہ نہیں۔سوال حقیقت پسندی یا تصوریت کا نہیں، صحیح عمل اصل چیز ہے۔'' وقت سنسناتا ہوا اس کے چاروں اور ڈول رہا تھا۔اب مذہب فلسفے کے آگے کمتر درجے کا علم ہو گیا تھا مگر جس مسئلے کو مذہب حل نہ کر سکا فلسفہ کیا حل کرتا۔کرشنا کا فلسفۂ عمل گیان مارگ بھی دکھاتا ہے اور بھکتی مارگ بھی، مگر مہاویر نے کہا۔ خداوند عالم کا کوئی وجود نہیں۔دنیا ابدی ہے اور اپنے وجود میں قائم اور مادے اور خلا اور دھرم اور ادھرم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے۔صرف یہی ایک حقیقت ہے۔اور شاکیہ منی نے کہا۔خدا ہو نہ ہو۔حقیقت محض یہ ہے کہ دکھ موجود ہیں۔باسٹھ فلسفے اودیا کے اودیا کے باسٹھ گن ہیں۔محبت بیکار ہے۔فلسفہ بے کار ہے۔سب مہا موہ ہے۔سب مایا ہے۔سب دھوکا ہے۔شروع میں نہ وجود تھا نہ عدم وجود۔ہر شے خلائے غیر حقیقی ہے۔پھر یہاں خواہشوں کا گذر کہاں؟ کون تمنا کرے گا اور کس چیز کی؟ کسی چیز کا کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں۔ہر شے اپنا لمحاتی وجود خود ہے اور شاکیہ منی نے کہا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم

ہیں حالانکہ ہم اضافیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہر شے تکلیف ہے۔ سروم دکھم دکھم۔ ہر شے فانی ہے۔ جسم اور روح دونوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ روح لازوال نہیں۔ محض اس کی تشکیل دینے والے عناصر باقی رہتے ہیں۔ روح کا آواگون نہیں۔ انسان اس طرح دفعتاً بجھ جاتا ہے جیسے چراغ کو پھونک مار کر گل کردیا جائے۔ صرف واقعات اور احساسات کا دورِ تسلسل قائم ہے اور رہے گا۔‘‘

آگ کا دریا میں وقت کا افقی روپ بھی استعمال کیا گیا ہے اور عمودی بھی (جسے متصورہ وقت کہیے) بعض ناقدین اور مبصرین کا خیال ہے کہ ناول کے مرکزی کردار جو ہر دور میں ایک ہی نام کے ساتھ سامنے آتے ہیں وقت کے مختلف روپ ہیں لیکن میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ ناول کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اس کے پیچھے تاریخیت اور تاریخ کی معتبریت برقرار رکھنا مقصد تھا۔ وقت وہ قوت ہے جو ان کرداروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہر دور میں مختلف طریقے سے۔ ہر دور کا گوتم پچھلے دور کے گوتم سے الگ شناخت رکھتا ہے، الگ عمل اور ردِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنے دور کے معاشرتی نظام کی آئینہ داری کرتا ہے۔ کرداروں کا باہمی عمل interaction ہر دور میں مختلف اور اس تغیر کا عکاس ہے جو گذرتے وقت کا فطری نتیجہ ہے۔ مگر کال چکر کے زیرِ اثر آخری دور میں گوتم نئے زمانے کا ایک ذہین، جوشیلا اور تخیل پرست نوجوان ہے جو ایک کامیاب افسر بن کر بھی یہی سوچتا ہے کہ کاش نروان ممکن ہوتا۔

آگ کا دریا کا ایک اور کردار ابوالمنصور کمال الدین بھی وقت کے معمے کو حل کرنے کی کوشش میں نظر آتا ہے:

’’وقت کے متعلق اس نے پڑھا کہ زمان و مکان اضافی ہیں اور محض ایسا خلا نہیں جس میں حقیقت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وقت کے مسئلے پر کمال بہت گڑ بڑایا، یہ مسئلہ بھی سامی نظریۂ کائنات سے یکسر جداگانہ تھا جس میں ابتدائے آفرینش سے روزِ قیامت تک ایک مخصوص باضابطہ وقفہ تھا جس کے بعد ابدیت ہی ابدیت ہوگی لیکن یہاں تو ابتدائے آفرینش کے بعد پھر ابتدائے آفرینش تھی اور کوئی ایسا مخصوص نقطہ نہ تھا جہاں سے وقت شروع ہوا۔ یہ حکما کہتے تھے کہ وقت کا لمحہ مختلف انسانوں کے لیے مختلف ہے۔ انسانی وقت دیوتاؤں کے وقت کا سوواں اور برہما کے وقت کا دس لاکھواں حصہ ہے۔ لہٰذا چھونے اور محسوس کرنے کی دنیا ہی وجود کے سارے ممکنات سلب نہیں کرلیتی۔ اس نے پڑھا: زمان و مکان حقیقت کی جہت ہیں اور حقیقت وجود میں آنے کی کیفیت کا دوسرا نام ہے اور ابدی ارتقا اور اشکال اور ہیئتوں کے پُر پیچ نمود اور دنیاؤں کے تسلسل کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔‘‘

قرۃ العین کو وقت کے مختلف تصورات کا شدید احساس ہے لیکن ناول میں وقت کا استعمال انھوں نے افقی طور پر کیا ہے یعنی ماضی، حال اور مستقبل جن کا تواتر منطقی ہے، تاریخی ہے اور تمام واقعات سلسلے وار طور پر مربوط ہے حالانکہ کسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرۃ العین کے یہاں وقت ژگ زیگ zig zag ہے لیکن اس احساس کا سبب واقعاتی تنوع اور مختلف النوع تسلسل ہے۔ وقت ژگ زیگ نہیں ہوسکتا۔ ’آخرِ شب کے ہمسفر‘ پر اپنے مضمون میں شمیم حنفی نے قرۃ العین کے تصورِ وقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ’’نہ تو ان کا زماں کا تصور سیدھا سادا اور یک رخا ہے کہ وقت کے کسی ایک منطقے یا انسانی مقدر کے کسی ایک دائرے کی جزئیات کا سلسلہ ترتیب دے کر ایک کہانی بنالیں۔ نہ ہی وہ تاریخ کو سماجی حقیقت نگاری کے ترجمانوں کی صورت محض تاریخ تک رکھنے پر قانع ہیں۔ انھوں نے وقت کی حدوں کو توڑ کر تاریخ اور اساطیر کے ایک نئے رشتے کی دریافت کی ہے اور معلوم و مانوس واقعات و حوادث کو بھی ایک انوکھی اور پُراسرار اساطیری جہت سے ہمکنار کیا ہے، جبھی تو ان کے کردار ماضی اور حال کے خانوں میں ایک ہی سہولت اور آزادی کے ساتھ آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں اور بظاہر گذری ہوئی صورتِ حال سے وابستہ مقدرات کی گونج موجود کے ساتھ آئندہ زمانوں کی طرف بھی رواں دواں نظر آتی ہے۔‘‘

آگ کا دریا کے کردار اپنے مکالموں نیز خود کلامی سے عینی کے تصورِ وقت کو واضح کرتے رہتے ہیں:

’’مجھ سے پہلے اب تک جو کچھ ہوا اس کی ذمے داری مجھ پر ہے یا نہیں؟ بتاؤ میں کیا لکھوں... گوتم نے پوچھا۔ ’’وقت کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں... سب خواب کی طرح گذر رہا ہے... گذر جائے گا۔‘‘ ہری شنکر نے جواب دیا۔ ’’گذر جائے گا یا گذرتا رہے گا۔؟ گوتم نے پوچھا۔۔

’’یہ تمھارا اپنا مسئلہ ہے‘‘...

’’وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا۔ وقت سے تم بچ نہیں سکتے اور اپنی اصلی حالت کو پا کر کوئی چیز اپنے آپ سے انحراف نہیں کرتی۔‘‘

’’وقت کے سامنے کوئی رشتے نہیں ہیں... کوئی منطق... کوئی طاقت... وقت پر تمھارا قابو نہیں رہ سکتا... جو آنکھیں رکھتا ہے وقت کے ارتقا کو پہچان لیتا ہے۔‘‘

قرۃ العین وقت کے ’ارتقا‘ کی بات کرتی ہیں لیکن وقت کے آگے بڑھنے کا یقین یا عقیدہ تو گھڑی والے وقت سے مشتق ہے جس کے تحت منٹ، گھنٹے، دن اور دوسرے تمام دورانیے مقرر کیے گئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وقت کا ارتقا ان کے یہاں چکر دار بھی ہے لہٰذا انھوں نے فلمی تکنیک فلیش بیک کا استعمال بھی کیا ہے اور... خصوصاً آگ کا دریا میں... منتخب مرکزی کرداروں کو الگ الگ ٹائم کیپسول time capsules میں رکھ کر ان کا باہمی interaction اس طور پیش کیا ہے کہ ہر ٹائم کیپسول کی اپنی شناخت ہے جو اس دور کے مطابق ہے لیکن ہر کردار بھی ہر دور یعنی ٹائم کیپسول کے تغیر کی عکاسی کرتا ہے اور اس طرح مسلسل ادوار کا تاریخی تواتر وقت کے ارتقا کو بخوبی پیش کرتا ہے۔ یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ مصنفہ وقت کے کون سے تصور یا نظریے کی حامی ہیں لیکن مختلف فلسفوں کو juxtapose کرنے کی تکنیک سے وقت کے مختلف تصورات کو اپنے پلاٹ اور کرداروں سے نہایت چابکدستی کے ساتھ ہم آہنگ کرلیا ہے۔ قرۃ العین سے پہلے یا ان کے بعد وقت کے تصور یا تصورات کا استعمال کرتے ہوئے اس قسم کا تخلیقی تجربہ کسی نے نہیں کیا۔ ’سلسلے واری‘ یعنی chronology پیمانہ استعمال کیا جائے تو ’آگ کا دریا‘ میں ابتدائیں اور انتہائیں دونوں موجود ہیں لیکن عینی آپا نے ابتداؤں اور انتہاؤں کو یوں خلط ملط کیا ہے کہ ہر کردار کی اپنی ایک ابتدا ہے اور اپنی ہی انتہا، یا اختتام۔ وقت کے کسی بھی تصور سے ماورا۔ بالفاظ دیگر ’آگ کا دریا‘ ہرگز یہ بتانے کی کوشش نہیں کرتا کہ وقت ’کیا‘ ہے، البتہ یہ توضیح ضرور کردیتا ہے کہ وقت کیا ’نہیں‘ ہے۔

رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو وہ بھی کیا معلوم

■

A. Rehman
1/1, Kirti Apartments
Mayur Vihar, Phase-1
Delhi-110091
rehmanbey@gmail.com

نصیب علی چودھری

مراثیِ انیس میں تلمیحات کی پیش کش

کسی بھی زبان کی شاعری میں تلمیحات کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔ خاص کر انگریزی ادب میں جس قدر تلمیحات ملتی ہیں اتنی کسی بھی ادب میں نہیں۔ محمود نیازی نے ’’تلمیحات غالب‘‘ میں اس بات پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ اردو میں تلمیحات کی تعداد بہت کم ہے۔ اردو شاعری کی بہت سی تلمیحات عربی اور فارسی زبان سے مستعار ہیں۔ یہ تلمیحات فارسی اور عربی شاعری میں عشق و عاشقی، تصوفانہ، سرشاری و سرمستی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی معاملات کو بیان کرتی ہیں۔ یہی تلمیحات اردو شاعری کا حصہ بھی بنتی ہیں۔ کسی بھی شاعری میں تلمیحات برتنے کی روایت بہت قدیم ہے۔ ان تلمیحات سے ہم کسی بھی معاشرے کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو بہت ہی آسانی سے سمجھ پاتے ہیں۔ تلمیحات فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ شمس قیس رازی نے تلمیح کو بلاغتِ کلام کا اعلیٰ مقام شمار کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب ’المعجم فی معائر اشعار العجم‘ میں تلمیح پر اچھی بحث کی ہے۔ تلمیح فصیح کیوں ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تلمیح ایک مختصر لفظ ہے جو ایک طویل واقعے یا حادثے کو خود میں لیے ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ ابھی تک کسی بھی شاعری میں تلمیح کے علاوہ کوئی بھی ایسا لفظ دیکھنے میں نہیں آیا کہ جو بہ ذات خود مختصر ہو اور خود میں اتنا زیادہ جامع ہو کہ کسی بھی واقعے یا قصے کو اختصار کے ساتھ بیان کر دے۔ فصاحت جس طرح سیدھے سادے لفظوں میں ہوتی ہے اسی طرح تلمیح کی بنیاد بھی ایسے ہی ایک مشہور و معروف واقعے پر ہوتی ہے۔ جیسے اردو شاعری میں اگر ’جنگ آزادی‘ کا لفظ تلمیحاً استعمال کیا جائے تو ہندوستان کی جد و جہد آزادی میں 1857 کی جنگ سے لے کر 1947 تک کی لڑائی کا ایک نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور پورا طویل پس منظر صرف اس ایک لفظ سے سامنے آجاتا ہے۔ اسی لیے تلمیح کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ تلمیحات کا وجود عہدِ عتیق سے انسانی وجود کے ساتھ مزید سنورتا چلا گیا اور ساتھ ہی ان الفاظ کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ تلمیحات کے متعلق شمیم انہونوی کی یہ رائے بڑی اہم معلوم ہوتی ہے:

’’علم کلام اور معنی و بیان کی مملکت میں تلمیح کا سکہ انسانی تہذیب و ترقی اور علم و فن کی ایجاد سے ہزارہا سال پیش تر سے رائج ہے۔ تلمیح سے ایام جاہلیت کی زندگی کا نمونہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح تاریخی حالات و واقعات کو محفوظ رکھنے کی آرزو کلام شعرا کے پردے میں چھپا کر پوری کر دی گئی تھی۔ تاریخ کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو تلمیح کی صفت حروف و الفاظ کے وجود میں آنے سے ہزارہا سال پہلے بھی موجود تھی اور بلا خوفِ تردید دنیائے ادب میں یہ قدیم اور پہلی صفت کہی جا سکتی ہے۔‘‘[1]

اردو شاعری میں تلمیحات کی روایت کافی پرانی ہے۔ کلاسیکی شاعری یعنی دکنی و شمالی ہند کے شعرا کے کلام کا کچھ نہ کچھ حصہ انھیں تلمیحات پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری میں مرثیہ ہی محض تنہا ایسی صنف ہے جس کی بنیاد تلمیحاتی الفاظ کے استعمال پر ہے۔ لہٰذا مرثیہ میں ان تلمیحات کا استعمال کئی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ اولاً مرثیے میں یہ تلمیحات تعلّی پسندی کے اظہار کا ایک بڑا ذریعہ بنتی ہیں۔ ثانیاً یہ تلمیحی الفاظ مناسبات و مراعاتِ کلام کی نشاندہی کر کے کلام کے تناسب میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ثالثاً کلام میں سوز و گداز کے علاوہ مبالغے کی ایک قسم غلو کا استعمال کر کے چاشنیِ کلام مقصود ہوتی ہے۔ اس طرح تلمیحات کے استعمال سے مرثیے کی خوب صورتی نکھر جاتی ہے۔ مثلاً اگر کربلا میں جنگ کا بیان مقصود ہوتا ہے تو حضرت حسین یا حضرت علی کی شجاعت کی پیکر تراشی بڑے ہی عمدہ طریقے سے انجام دی جاتی ہے۔ اہل بیت کی تلمیح سے آپسی کلام، درد و غم کا اظہار اور اس غم کی تسکین و تسلی ایک ڈرامائی

انداز میں خوب صورتی سے پیش کی جاتی ہے۔ اس طرح مرثیہ تمام اصناف شاعری میں ایک بہترین مرقع بن کر سامنے آتا ہے۔ اردو شاعری میں مرثیہ ہی وہ صنف ہے جس میں بیک وقت تعلّی، ڈرامائی انداز بیان، مراعات کلام اور مناسبات الفاظ اور درد وغم کی کیفیات کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

اردو مرثیے میں انیس و دبیر کی تلمیحات نے ایک الگ رنگ ڈھنگ عطا کیا ہے جس سے مرثیے کا اصل کمال سامنے آیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مراثی کا اوجِ کمال انیس و دبیر پر ختم ہوگیا۔ وہ ایک عہد اپنے ساتھ لے گئے جس عہد کی باز آفرینیاں آج تک اسی لب و لہجے میں سنائی دیتی ہیں کہ جس طرح پہلے سنائی دیتی تھیں۔ اس طرح مراثی کا عہدِ زریں، عہدِ انیس و دبیر کہا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری میں مرثیہ صرف ایک صنف کے طور پر شعرا کا مطمح نظر رہی ہے۔ لیکن انیس نے مرثیے میں سلیس اور سادہ الفاظ استعمال کیا اور اس کو فصاحت و بلاغت کے بازو وپر عطا کیے۔ وہیں دبیر نے مرثیے میں ابہام وایہام اور ثقیل الفاظ کا زیادہ استعمال کیا ہے، لیکن اس کو انھوں نے مرثیے میں اتنی خوبی اور خوبصورتی سے برتا کہ مرثیے کا حسن دوبالا ہوگیا، یعنی انیس نے جس خوبی کے ساتھ بدائع لفظی کا استعمال کیا تو دبیر نے صنائع لفظی کا بھرپور استعمال کر کے قاری کو سحر زدہ کر دیا۔ دبیر کی حیثیت انیس سے الگ اس لیے ہے کہ اگر دبیر بھی انیس کی طرح الفاظ کا بہاؤ، روانی اور سلاست کا استعمال کرتے تو پھر دبیر کی اپنی ذاتی حیثیت کچھ بھی باقی نہیں رہتی۔

مراثی انیس منظر نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کے یہاں کربلائی تناظر میں جس طرح کی منظر کشی کی گئی ہے، وہ بڑی وقعت کی حامل ہے۔ کربلا کا میدان، وہاں کی ایک عجیب وغریب شام وسحر، دوپہر، دن، کرداروں کی آپسی گفت وشنید، درد کی احساس کن کیفیتیں، مدمقابل کی جرأت، ذہنی الجھن وکشمکش وغیرہ کیفیات اس منظر نگاری کی عمدہ غمازی کرتی ہیں۔ اس طرح یہ کیفیات انیس کے کلام کو منظر نگاری کا بھی ایک حسین مرقع بنا دیتی ہیں۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''انیس کے یہاں منظر نگاری، جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور کردار نگاری کا کمال نظر آتا ہے۔ انیس کے یہاں جزئیات نگاری اور تصویر کشی کا جو غالب رجحان

اردو مرثیے میں انیس و دبیر کی تلمیحات نے ایک الگ رنگ ڈھنگ عطا کیا ہے جس سے مرثیے کا اصل کمال سامنے آیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مراثی کا اوجِ کمال انیس و دبیر پر ختم ہوگیا۔ وہ ایک عہد اپنے ساتھ لے گئے جس عہد کی باز آفرینیاں آج تک اسی لب و لہجے میں سنائی دیتی ہیں کہ جس طرح پہلے سنائی دیتی تھیں۔

ہے، اس کے اثر سے ان کی زبان اور طرز ادا میں صفائی کا عنصر غالب رہا کہ اس کے بغیر، ان امور کا حق ادا ہی نہیں ہوسکتا اور یہ گویا ان کا خاندانی جوہر ہے۔ موقع محل کی مناسبت سے فصیح تر الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب اور اسی نسبت سے اسلوب بیان کے انتخاب کی جو بے مثال صلاحیت اور قدرت میر انیس کو حاصل تھی، ان عناصر نے ان کی شاعرانہ زبان کو فصاحت وروانی کی دل کشی اور تاثیر کی گرمی سے معمور کر دیا ہے۔''[2]

انیس کے کلام میں اضافاتِ کلام (فارسِ میدانِ تہوّر، گوہر تاجِ عرش، صورتِ برگِ خزاں، کثرتِ جوہرِ ذاتی) عطف ومناسباتِ کلام (دست و پا صدر و کمر، گردن وسر) کنیت (سخی ابنِ سخی، ابنِ یداللہ، سبطِ حسن، ابنِ مظہر، بوتراب) اشتقاق (فتح، مفتاح، قبضے، قابض، اسفل، سفلہ) اور ایسے ہی مترادف المعنی (جنگ وجدال، فتح وظفر) وغیرہ الفاظ کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ان کا مرثیہ 'بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حرُ' میں حر کے متعلق بیان کرتے ہوئے کس قدر محترم الفاظ لاتے ہیں اور ساتھ ہی تلمیح کا بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ بند ملاحظہ کریں:

واہ رے طالعِ بیدار، رہے عزت و جاہ!
حُر پہ کیا فضلِ خدا ہو گیا اللہ اللہ!
پیشوائی کو گئے آپ شہِ عرش پناہ
خضرِ قسمت نے بتادی اسے فردوس کی راہ
مدتوں دور رہے جو وہ قریب ایسا ہو
بخت ایسے ہوں، اگر ہو تو نصیب ایسا ہو

انیس نے کمالِ مہارت سے تلمیحی الفاظ کو کلام میں برتا ہے اور اس کے ذریعے انھوں نے اپنے کلام میں سحر آفرینی سے کام لیا ہے۔ انیس کے کلام کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں ہمیں الفاظ کا باہمی تناسب دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ انھیں الفاظ پر اکتفا کرتے ہیں کہ جتنے الفاظ سے معانی ادا ہو جائیں۔ اسی لیے فصاحت و بلاغت جس قدر انیس کے یہاں ہے، وہ نہ بعد والوں کے یہاں ہے اور نہ ہی پہلے والے مرثیہ گو شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ انیس کے یہاں ہر شعر بعد والے شعر کے لیے ایک نئی راہ نکالتا ہے۔ ہر بند دوسرے بند کے لیے ایک دل کش کیفیت کا باعث بنتا ہے۔ انیس کے کلام میں جاہ وجلال کی تابناکی غم و درد کی اندوہ بیانی، خاندانی آپسی کلام کی سحر انگیزی بڑی معنی خیز ہے۔ ان کے کلام میں جن تلمیحات کا استعمال ہوا ہے، ان میں انبیائی ورُسلی، مکانی، قرآنی، سلاطینی وعسکری، یوسف، داؤد، یونس، ابراہیم، ایوب، موسیٰ، سلیمان، یعقوب اور محمدؐ اور اہل بیت وغیرہ ہیں۔ انھیں تلمیحی الفاظ کو تاریخی واقعات بیان کرنے کے لیے بھی استعمال کر لیا گیا ہے۔ کسی ایک نبی کی تلمیح سے ان کے زمانے کی معاشرتی، سماجی اور سیاسی حالات تک کا پتہ چل جاتا ہے۔ جیسے نوح کی تلمیح سے ان کے عہد کے ان تمام معاملات کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے جن کی وجہ سے طوفان نوح آیا اور اس کے بعد کے معاملات کی گرہیں بھی کھلتی جاتی ہیں۔ ایسے ہی یوسف کی تلمیح سے مصر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے اور شاعری میں ایسی سحر انگیزی پیدا کر دیتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسی زمانے کی سیر کر رہے ہوں۔ شاعری کو معجزۂ فن صرف اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ چند الفاظ سے ہمارے سامنے ایک پوری تہذیب کی

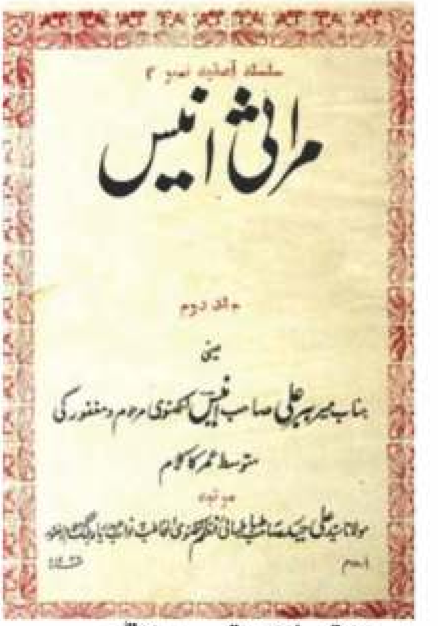

عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ محمد کی تلمیح سے ایمان و عرفان اور وجدانیات و روحانیات کی کیفیات کا جو احساس ہوتا ہے وہ ایسا ہے کہ کسی نے بے جان جسم میں روح پھونک دی ہو۔

انیس نے انبیائی تلمیحات کا جس قدر استعمال کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا مرثیہ 'یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر' میں بہت سی تلمیحات مل جاتی ہیں۔ لیکن کلیم الدین احمد نے اس مرثیے کے بیش تر اشعار کو بھرتی کا بتایا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس مرثیے میں رعایت لفظی کا درست استعمال نہیں ہوا ہے۔ وہ اس مرثیے کے پہلے مصرعے میں استعمال ہوئے الفاظ 'چمن نظم' اور 'گلزار ارم' اور دوسرے مصرعے میں استعمال ہوئے 'خشک زراعت' پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ارم ایک باغ تھا جسے شدّاد نے بنایا تھا جو اس کے خیال میں جنت سے کم حسین نہ تھا۔ مجازاً جنت کو بھی ارم کہتے ہیں اور یہ معنی عام ہے لیکن وہ Submerged Meaning بھی ہے اور اس کی واقفیت انیس کو بھی ہوگی۔ پھر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ خدا سے یہ دعا کی جائے کہ وہ چمن نظم کو باغ شداد بنادے۔ یا پھر شاید یہ بات ہو کہ اگر چمنِ نظم کو گلزار جنت بنانے کی مانگ کی جائے تو وہ بھی شداد کے تکبر کے مرتکب ہوں گے، پھر چمن کو گلزار کیوں بنایا جائے، کیا چمن میں پھول نہیں ہوتے۔ جو چمن تھا اور شاید پھلا پھولا چمن تھا وہ اب خشک زراعت ہے۔ لیکن چمن نظم کہاں اور کہاں خشک زراعت۔ اور چار مصرعوں کے بجائے صرف دو مصرعے ہوتے تو کوئی کمی محسوس نہ ہوتی۔''[3]

کلیم الدین احمد کی بات کسی قدر درست بھی ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انیس کے یہاں خالص اسلامی رنگ بھی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی مناظر کا غلبہ ہے اور یہی بات مسعود حسن رضوی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انیس کے یہاں کربلائی مناظر کی عکاسی میں ہندوستانی مناظر کا رنگ ملتا ہے اور یہ خالص اسلامی رنگ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی انیس نے جس قدر ڈرامائی کیفیات سے واقعات کی ترتیب بنائی ہے اور اس میں جس قدر متناسب الفاظ سے کام لیا ہے وہ کسی بھی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ اسی لیے کلیم الدین احمد بھی ان کو لفظوں کا شہسوار تسلیم کرتے ہیں۔ انیس نے اس مرثیے کے ایک بند میں حضرت سلیمان کی تلمیح کو کس قدر کمال مہارت سے استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

گر بزم کی جانب ہو توجہ دم تحریر
کھنچ جائے ابھی گلشن فردوس کی تصویر
دیکھے نہ کبھی صحبتِ انجم ، فلکِ پیر
ہو جائے ہوا، بزمِ سلیماں کی بھی توقیر
یوں تختِ حسینانِ معانی اُتر آئے
ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

ان مصرعوں کی تعلی دیکھیے کس قدر اعلیٰ درجے کی ہے۔ یہاں لفظ 'ہوا' ختم ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ انیس ایک ہی لفظ کو متضاد معانی میں استعمال کرتے ہیں۔ رثائی شاعری میں تعلّی اور مبالغے کی قسم غلو کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے اور یہ مبالغہ بجا طور پر شاعری کو پر اثر بناتا ہے۔ مشابہتی الفاظ، رعایتی جملے، مناسبات وغیرہ کو خوب صورت انداز میں لایا جاتا ہے۔ تعلّی پسندی کا اظہار تو انیس نے بہت سی جگہ کیا ہے۔ مثلاً ان کا یہ بند دیکھیں۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہر منوّر سے ملا دوں
خاروں کو نزاکت میں گل تر سے ملادوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

کلیم الدین احمد نے انیس کے اس ایک بند کو پیش کر کے اس میں تعلّی کے حوالے سے بڑی خوب صورت بات کہی ہے۔ تعلّی پسندی کا اظہار شعر میں صرف چاشنی پیدا نہیں کرتا بلکہ الفاظ کا تناسب، تکرار الفاظ اور جملوں کے باہمی ربط سے کلام کو پر لطف بنایا جاتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے کہا ہے کہ صرف تعلّی سے کلام کی چاشنی ایسے ہی نہیں بڑھ جاتی ہے بلکہ اس کے لیے ذہنی ہم مزاجی، نوانجی کی بازیافت ضروری ہے۔ ان کی یہ بات کسی حد تک درست ثابت ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''انیس کی شاعری کا اصل الاصول ہے: مبالغہ۔ چسٹرٹن نے کہا ہے کہ مبالغہ فن کی روح ہے Exangeration is the Soul of Art لیکن آرٹ صرف مبالغہ نہیں کچھ اور بھی ہے، بہت کچھ اور ہے۔''[4]

ایک بند میں انیس نے یوسف و یعقوب کی تلمیح استعمال کر کے ایک پیار بھری اور درد بھری کیفیت اور پر کشش احوال کا ذکر کیا ہے۔ انیس نے انبیا کی تلمیحات معرکۂ کربلا میں رونما ہونے والے واقعات کی رعایت سے استعمال کی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ کسی کربلائی واقعے کو بیان کر رہے ہوتے ہیں تو بیچ میں تشبیہاً ان تلمیحات کو بھی لے کر آجاتے ہیں۔ یہ ہنر انیس کے علاوہ نظر نہیں آتا، ایک واقعے کے لیے الفاظ

انیس نے کمالِ مہارت سے تلمیحی الفاظ کو کلام میں برتا ہے اور اس کے ذریعے انھوں نے اپنے کلام میں سحر آفرینی سے کام لیا ہے۔ انیس کے کلام کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں ہمیں الفاظ کا باہمی تناسب دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ انھیں الفاظ پر اکتفا کرتے ہیں کہ جتنے الفاظ سے معانی ادا ہو جائیں۔ اسی لیے فصاحت و بلاغت جس قدر انیس کے یہاں ہے، وہ نہ بعد والوں کے یہاں ہے اور نہ ہی پہلے والے مرثیہ گو شعرا کے یہاں ملتی ہے۔

اور نازک خیالی کا جتنا استعمال ان کے یہاں پایا جاتا ہے کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ مثلاً یہ بند دیکھیں۔

اے یثرب و بطحا ،ترے والی کی ہے آمد
اے رتبۂ اعلیٰ ،شۂ عالی کی ہے آمد
عالم کی تغیری پہ بحالی کی ہے آمد
کہتے ہیں چمن ،ماہ جلالی کی ہے آمد
یہ خانۂ کعبہ کے مباہات کے دن ہیں
یعقوب سے یوسف کی ملاقات کے دن ہیں

اس بند میں ایک واقعے کو دوسرے واقعے سے جوڑ کر وہی درد وغم کی کیفیت پیدا کردی گئی ہے جو حضرت یعقوب کو یوسف کے کھو جانے اور ان کے فراق میں آنسو بہا بہا کر اپنی آنکھیں کھو دینے پر پیدا ہوئی تھی۔ اہل بیت کے اسی درد کا اظہار انیس نے کربلا میں کیا۔ اوپر والا بند اور نیچے والا بند اس بند سے درد وغم والی کیفیت کے مشابہ ہے کہ جب یعقوب ،یوسف کی خبر پاتے ہیں تو کس قدر خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح میدان کربلا میں بھی عون ومحمد کی خبر سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایسی نزاکت بیان اور نزاکت کلام انیس نے جس طرح سے پیش کی ہے وہ بالکل منفرد چیز ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب 'روح انیس' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''جو نازک سے نازک خیال دل میں پیدا ہو اور لطیف سے لطیف کیفیت طبیعت پر طاری ہو، اسے لفظوں میں بیان کر دیں۔ وہ جیسا خیال ظاہر کرنا چاہتے ہیں اس کی مناسبت سے ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی آواز، اپنے ربط باہمی اور اپنے متعلقات معنوی سے اس خیال کی کامل ترجمانی کرتے ہیں اور سامع کے دل میں وہی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو شاعر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مختلف طبقوں اور مختلف طبیعتوں کے لوگوں کے طرز کلام میں جو فرق ہوتا ہے، انیس اس کو ملحوظ رکھتے ہیں ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے ادا کر سکتے ہیں۔ اختصار اور طول پر بھی ان کو پورا اختیار ہے۔ ان کے پاس لفظوں کا اتنا بڑا خزانہ موجود ہے جس سے زائد شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوا ہو۔''[5]

انیس تشبیہاً جو الفاظ لے کر آتے ہیں، ان میں معنوی ربط بڑا ہی لطیف ہوتا ہے۔ اس بند میں حسین کو قرآن سے تشبیہ دی پھر مماثلت کے طور پر سر کو رحل کی مناسبت سے استعمال کیا۔ یہی وہ کمال مہارت فن ہے کہ جہاں الفاظ تخیل کی وادی سے نکل کر حقیقت کی شکل اختیار کر کے ایک معنی خیز رنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔

> مختلف طبقوں اور مختلف طبیعتوں کے لوگوں کے طرز کلام میں جو فرق ہوتا ہے، انیس اس کو ملحوظ رکھتے ہیں ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے ادا کرسکتے ہیں۔ اختصار اور طول پر بھی ان کو پورا اختیار ہے۔ ان کے پاس لفظوں کا اتنا بڑا خزانہ موجود ہے جس سے زائد شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوا ہو۔

اسی طرح کا ایک اور بند ملاحظہ ہو۔

جاں آگئی یعقوب نے یوسف کو جو پایا
قرآں کی طرح رحل دوزانو پہ بٹھایا
منہ ملنے لگے منہ سے بہت پیار جو آیا
بوسے لیے اور ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا
دل ڈھل گیا جب کی نظر سینہ و سر پر
چوما جو گلا، چل گئی تلوار جگر پر

انیس کے یہاں قرآنی تلمیحات میں مصحف قرآن، خضر، جبریل، میکائیل، اسرافیل، کشتی نوح، شب معراج، ابلیس، سورۂ عادیات، آیۃ الکرسی، والشمس، والضحیٰ وغیرہ تلمیحی الفاظ ملتے ہیں۔ ایک بند میں میکائیل اور جبریل کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے۔

وہ نور قمر اور در افشانی انجم
تھے جس کے سبب روشنی دیدۂ مردم
وہ چہچہے رضواں کے وہ حوروں کا تبسم
آپس میں وہ ہنس ہنس کے فرشتوں کا تکلم
میکال شگفتہ ہوئے جاتے تھے خوشی سے
جبریل تو پھولوں نہ سماتے تھے خوشی سے

ایک بند میں جبرئیل کی تلمیح سے کیا خوب منظر کشی کرتے ہیں۔ یہ بند ملاحظہ کریں۔

فرمایا محمد نے کہ اے فاطمہ زہرا
کیا مرضی معبود سے بندے کا ہے چارہ
خالق نے دیا ہے اسے وہ رتبۂ اعلیٰ
جبریل سوا کوئی نہیں جاننے والا
میں بھی ہوں فدا اس پہ کہ یہ فدیۂ رب ہے
یہ لال ترا بخشش امت کا سبب ہے

مکانی تلمیحات میں خانۂ کعبہ، مدینہ، ارم، کوہ صفا، سنگ حرم، رکن یمانی، بیت مقدس، دریائے فرات، عرب و روم، مصر، شام، کربلا وغیرہ الفاظ قابل ذکر ہیں۔ جن میں بہت سی تلمیحات کا اوپر کے بندوں میں ذکر ہو چکا ہے۔ مکانی تلمیحات کسی خطے کی کیفیت اور وہاں ہونے والے واقعات کی مکمل عکاسی کرتی ہیں۔ مثلاً مدنیہ یا یثرب، کعبہ اور بیت مقدس یہ تلمیحی الفاظ ان جگہوں کے اندر رونما ہوئے سارے احوال کی منظر کشی کر دیتے ہیں۔ اب شعر میں ان کا استعمال جس طریقے سے کیا جائے گا تو اس کا اثر قاری پر ویسا ہی ہوگا۔ شاعر جس منظر کی عکاسی کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے لیے اسی طرح کے الفاظ استعمال کرے گا۔ ایک مثال ملاحظہ کریں۔

اے کعبۂ ایماں تری حرمت کے دن آئے
اے رکن یمانی، تری شوکت کے دن آئے
اے بیت مقدس، تری عزت کے دن آئے
اے چشمۂ زمزم ،تری چاہت کے دن آئے
اے سنگ حرم ، جلوہ نمائی ہوئی تجھ میں
اے کوہ صفا ، اور صفائی ہوئی تجھ میں

> مکانی تلمیحات کسی خطے کی کیفیت اور وہاں ہونے والے واقعات کی مکمل عکاسی کرتی ہیں. مثلاً مدنیہ یا یثرب، کعبہ اور بیت مقدس یہ تلمیحی الفاظ ان جگھوں کے اندر رونما ہوئے سارے احوال کی منظر کشی کر دیتے ہیں.

حضرت علی کی مدح اور ان کی شجاعت کو بیان کرنے میں انیس کا یہ بند کیا ہی خوبصورت ہے۔ لیکن علی کا اسد سے استعارہ اور آہو سے مدمقابل کا استعارہ شعری طور پر درست معلوم نہیں ہوتا۔ جب کہ شعر میں حضرت علی کی صرف شجاعت دکھانا مقصود ہے مگر شیر کی ایک خاصیت بے رحمانہ رویہ بھی ہوتی ہے اور آہو کی خاصیت کمزوری اور معصومیت ہے۔ یعنی علی بے رحم ہیں جو اپنے معصوم دشمنوں کو قتل کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے یہاں ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا ہے بلکہ صفتِ شجاعت اور صفتِ بزدلی دکھانے کے لیے انیس نے اسد اور آہو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس بند میں شعری لوازمات کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ بند ملاحظہ کریں۔

خندق کی دغا، عمرو سیہ کار کی وہ دھوم
تھراتا تھا تلوار سے جس کی عرب و روم
رد کر کے جو حربوں کو بڑھا خاصۂ قیوم
جھپٹا اسد آہو پہ، یہ سب کو ہوا معلوم
اک ضرب میں نہ گرز، نہ مغفر تھا، نہ سر تھا
خندق کے ادھر لاش، سرِ نحس اُدھر تھا

عسکری تلمیحات میں، کربلا، بدر و حنین، غزوۂ احزاب، جنگ احد، معرکۂ صفین، فتح خیبر وغیرہ الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ لڑائی اور اس کے اطراف و جوانب کے احوال کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ عسکری تلمیحی الفاظ میں ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ ہمارے جذبات اور جسمانی اعصاب پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ قبائل عرب کی آپسی لڑائی یا جنگ کے میدان میں جب دونوں جانب سے رزمیہ اشعار پڑھے جاتے تھے تو اس وقت ان کے جذبات کی شدت بہت بڑھ جاتی تھی۔

انیس کی شاعری میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ مراثی کے حوالے سے بہت ہی جامع ہیں۔ الفاظ کی رعایت کو مناسبات کے ذریعے پیش کر کے کمال مہارت فن کی اعلیٰ مثال پیش ہے۔ صالحہ عابد حسین اس حوالے سے لکھتی ہیں:

''انیس کے پاس محاوروں، کہاوتوں، تشبیہوں، استعاروں، کنایوں اور بے تکلف بولے جانے والے الفاظ کا بے کراں خزانہ تھا۔ ان کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ لاکھوں جواہر پارے اس کلام کے جوہری کے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ جس وقت جس کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اٹھا کر صحیح جگہ پر بٹھا دیتا ہے۔ ایسا کہ جیسے انگوٹھی پر ہیرا جڑ دیا گیا ہو۔ خیال اور لفظ کا حسین امتزاج بھی انیس کے کمال شاعری کا ایک بڑا اہم جز ہے۔ وہ نازک سے نازک اور مشکل سے مشکل مقام کی تصویر کشی اس خوبی اور چابک دستی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے منظر کھنچ جاتا ہے۔''[6]

انیس کے یہاں الفاظ و معانی کے ذخیرے جس قدر اپنی تراشیدہ شکل میں ملتے ہیں وہ کسی اور شاعر کا کمال نہ بن سکا۔ شعری وجدان، شعری کیفیت اور شعری احساس کی دوسروں تک ترسیل، اس طرح کہ جس طرح شاعر چاہتا ہے کہ دوسرے ویسا ہی سمجھیں، انیس کے سوا کم شعرا اس نہج پر گامزن رہ پائے۔ انیس کی شعری تکمیل ان کے شعوری حصہ کی وہ سطح ہے کہ جس کا استعمال بھی شعرا کم کرتے ہیں۔ طبیعت کی افق تابی، نوانجی وجدانیات اور عرفان ذات کی کشش کو شعری جامہ پہنانا خداداد صلاحیت سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ انیس کے کلام میں معانی تہہ در تہہ پیوست نظر آتے ہیں۔ ایک لفظ کو جیسے ہی دوسرے سے مناسبت حاصل ہوتی ہے تو وہ اپنے اصل معانی کے علاوہ دیگر معانی بھی دینے لگتا ہے۔ بے جان الفاظ میں روح معانی پھونک دینا بھی شعرا کے کمال مہارت کی آماجگاہ ہوتا ہے جہاں

شاعر اپنی قوتِ ادراک اور قوتِ ارادی سے الفاظ کے ان گہرے معانی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ انیس کا اس اعتبار سے کوئی ثانی نہیں ہے۔ بے بدل شاعری ہی شاعر کی ابدی پہچان ہوتی ہے۔

حواشی

1. محمود نیاز، تلمیحات، مقدمہ، شمیم انہونوی، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، 1964، ص 11-12
2. رشید حسن خاں، انتخاب مراثی انیس و دبیر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011، ص 8
3. کلیم الدین احمد، میر انیس، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، 1988، ص 11-12
4. ایضاً، ص 15
5. مسعود حسن رضوی ادیب، مقدمہ، روح انیس، کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ، طبع اول، 1931، ص 30
6. صالحہ عابد حسین، انیس کے مرثیے، جلد اول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن، 1990، ص 57

■

Dr. Naseeb Ali Choudhry
Asst. Professor, JNU
New Delhi- 110067
Mob.:9622069794
nasibali546@gmail.com

حاشیائی اردو خاکے

اردو میں حاشیائی ادب سے عام طور پر ہمارا ذہن افسانوی ادب کی طرف جاتا ہے۔ یہ غلط بھی نہیں کیونکہ افسانوں میں اس طبقے کو بطور خاص موضوع بنا کر بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ حاشیائی ادب کے بہت سے کردار ان افسانوں کی وجہ سے بھی زبان زد خاص و عام ہوگئے ہیں۔ نثر میں افسانوں کے علاوہ خاکہ ایک ایسی صنف ہے جس میں بہت سے شخصی خاکے نہایت معمولی لوگوں پر لکھے گئے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق محنت کش طبقے سے رہا ہے۔ خاکہ جس پر لکھا جاتا ہے وہ اپنے عہد کا ایک حوالہ بن جاتا ہے اور اس تناظر میں بہت سی چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک اکیلا شخص اپنے معمولی کاموں اور بعض خوبیوں کے سبب لوگوں کی توجہ اور کشش کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایک شخص سے بسا اوقات بہت سے چہرے اور اس زمانے کے بعض دوسرے کردار بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ ہماری ادبی تاریخ میں بعض بہت ہی معمولی لوگ محض خاکوں کی وجہ سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

خاکہ کسی شخص سے متعلق نہ معلومات کی کھتونی ہے اور نہ محض اپنے تعلق کا اظہار یہ۔ دراصل یہ ایک نوع کی قلمی تصویر کشی ہے، جسے چلتی پھرتی مجسمہ سازی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، جس میں مہارت کے ساتھ کم لفظوں میں بہت کچھ بیان کر دینا ہی خاکہ ہے، مطالعہ، مشاہدہ اور فہم و ادراک کی بہت سی پرتیں اس بیانیے کا حصہ بنتی ہیں۔ یہ آمیزش بہت سے تجربوں کا نچوڑ اور کسی شخص کے جوہر کو ایک دو جملوں میں بیان کر دینے کا نام ہے۔ خاکوں کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ جس کا خاکہ لکھا جاتا ہے اس سے ہمدردی اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تاثراتی خاکے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ صنف ایک بے جان عبارت بن کر رہ جائے۔ خاکوں میں تجریدی آرٹ یا بہت زیادہ فلسفیانہ انداز و اسلوب کی گنجائش نہیں ہوتی۔ دراصل اس کا بھی بیانیہ لکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح آغاز کرتا ہے اور واقعات و حادثات کو کس طرح پیش کرتا ہے کہ ایک چلتی پھرتی تصویر آنکھوں میں رقص کرنے لگے اور اس شخصیت سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو جائے۔ اس سے ہمدردی اور غم گساری کے جذبات ابھرنے لگیں اور یہی خاکہ نگار کی کامیابی ہے۔

"اردو خاکوں کی دنیا اس لحاظ سے ثروت مند کہی جاسکتی ہے کہ وہ افراد جن کی عام شہرت اس صنف کے حوالے سے رہی ہے انھوں نے حاشیے پر رہنے والوں کا خاکہ لکھ کر انھیں شہرت دوام عطا کردی ہے۔"

اردو خاکوں کی دنیا اس لحاظ سے ثروت مند کہی جاسکتی ہے کہ وہ افراد جن کی عام شہرت اس صنف کے حوالے سے رہی ہے انھوں نے حاشیے پر رہنے والوں کا خاکہ لکھ کر انھیں شہرت دوام عطا کردی ہے۔ مولوی عبدالحق کا 'نام دیو مالی' اور رشید احمد صدیقی کا 'کندن' کون بھول سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کا خاکہ چچی اور روشن دان والے جاوید صدیقی کا لکھا ہوا خاکہ جیانی بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ امیری اور بدھو بھیا کے نام سے جو خاکہ لکھے گئے انھیں بھی اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ آخر الذکر دونوں ایک تعلیمی ادارے میں ملازم تھے اور وہیں انھوں نے آخری سانس لی۔ سماج نے کبھی انھیں وہ اہمیت نہ دی مگر ان تحریروں کے سبب ان کی خدمات اور ان کے کاموں کا ذکر دیر تک ہوتا رہے گا۔

مولوی عبدالحق کی عام شہرت تو ان کی مقدمہ نگاری ہے مگر وہ ایک خاکہ نگار کے طور پر بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جس کا خاکہ لکھا، اسے ایک نئی زندگی دے دی۔ ان کے مشہور ترین خاکوں میں ایک خاکہ 'نام دیو مالی' کا بھی ہے۔ مولوی عبدالحق نے نام دیو مالی کے تعارف میں لکھا ہے کہ وہ ایک نیچ قوم سے تعلق رکھتا تھا مگر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔ اس خاکے میں نام دیو کی محنت، لگن اور کام سے غیر معمولی شوق کو دکھایا گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ فن باغبانی کی اس نے کہیں تعلیم نہیں پائی تھی مگر اسے اپنے کام سے حد درجہ لگاؤ تھا۔ خدمت ہی اس کی پہچان تھی چاہے وہ انسان ہو یا جانور یا پیڑ پودے۔ نام دیو مالی کے کام کے بارے میں مولوی عبدالحق نے لکھا کہ:

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی

اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے، روشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر جھاڑنا بہارنا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

(چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، 1959)

یہ بات قابل غور ہے کہ نام دیو مالی گرچہ شاہی باغ کا مالی تھا اور اسے بڑی مہارت بھی حاصل تھی مگر مولوی عبدالحق کے ایک خاکے کی بدولت وہ آج تک زندہ ہے اور اس کی خوبیاں لوگوں کو مہمیز کرتی ہیں۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا تھا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے زیادہ مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

(ایضاً، ص230)

رشید احمد صدیقی نے اپنی تحریروں میں علی گڑھ کے بہت سے کردار کو زندہ کر رکھا ہے۔ انھیں میں ایک کندن بھی ہے۔ رشید احمد صدیقی کا یہ خاکہ بہت زیادہ مشہور ہے۔ یہ خاکہ علی گڑھ کی سماجی زندگی کا استعارہ کہا جاسکتا ہے کہ وہاں پر کام کی بدولت کیسے کیسے لوگوں کو اعتبار حاصل تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا ہندی رسم خط سے معمولی آشنائی تھی۔ قوت حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ یونیورسٹی کے ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے اسے جو وقار اور مرتبہ حاصل تھا وہ اس خاکے سے خوب عیاں ہے۔ اب نہ رشید صاحب ہیں اور نہ کندن مگر اس خاکے کی بدولت دونوں ہی یونیورسٹی کے ایک متحرک کردار کی صورت ادب میں زندہ ہیں۔ کندن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گھنٹہ بجاتا تھا اور گھنٹہ بجاتے بجاتے وہ دنیا سے چلا گیا۔ کندن کی ایمانداری، محنت اور کام کے تئیں لگن ہی اس کی پہچان تھی۔ رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ اس کا حلیہ اور نقشہ اتنی خوب صورتی سے کھینچا ہے کہ کندن کی شخصیت پوری طرح عیاں ہوگئی ہے۔

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی جثہ، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پاٹ دار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ۔ کس بلا کا مستعد اور محنتی شخص تھا۔ نہ دن دیکھتا نہ رات، نہ سردی نہ گرمی نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا کندن بوڑھے ہوا تنی محنت نہ کیا کرو تو وہی کلمہ دہرا دیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا یعنی حضور کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے۔

(ہم نفسان رفتہ، رشید احمد صدیقی: انڈین بک ہاؤس 1966، ص 169)

غزل کے عشقیہ اشعار میں بالعموم محبوب کی طرف ہی جھکاؤ رہتا ہے اسی طرح خاکوں میں بھی خاکہ نگار جس کا خاکہ کھینچتا یا لکھتا ہے اس کی شخصیت کو اس طرح پیش کردیتا ہے کہ اس کی بعض کمیوں اور کوتاہیوں سے ایک نوع کی ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ رشید احمد صدیقی ایک جگہ کندن کے بارے میں لکھتے ہیں:

مولوی عبدالحق کی عام شہرت تو ان کی مقدمہ نگاری ہے مگر وہ ایک خاکہ نگار کے طور پر بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جس کا خاکہ لکھا، اسے ایک نئی زندگی دے دی۔ ان کے مشہور ترین خاکوں میں ایک خاکہ 'نام دیو مالی' کا بھی ہے۔

"کندن کی ایمان داری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر ہی کا نہیں دوسرے سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ کام بے تکلف سپرد کردیے جاتے تھے۔ کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔"

(ایضاً، 1965)

اس کے لیے یہی سب سے بڑا انعام تھا۔

ڈاکٹر اسلم پرویز دلی والے تھے۔ ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ 'گھنے سائے' کے نام سے ہے۔ 'میں اور شیطان' کے نام سے ڈاکٹر خلیق انجم پر ان کا لکھا ہوا خاکہ زیادہ مشہور ہوا۔ ان کا ایک خاکہ چچی کے نام سے ہے جو کافی دلچسپ ہے۔ ان کا اصل نام تو محمد النسا تھا مگر چچی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ اپنے اصل نام کو وہ ٹھہر کر یا روانی کے ساتھ کبھی درست نہیں پڑھ سکیں۔ اسلم پرویز کے بقول انھیں سوائے نماز کے اور کچھ پڑھنا نہیں آتا تھا۔ پرانے رسم و رواج، تعویذ، گنڈے، ٹونے ٹوٹکے، توہمات، جنوں اور پریوں کے قصوں کی فضا میں وہ پیدا ہوئی تھیں اور تاعمر اسی میں سانس لیتی رہیں۔ ان کے پاس نہ تعلیم تھی اور نہ دولت چند گھروں اور پاس پڑوس میں کروفر کے ساتھ کام کرکے زندگی گزار دی۔ ان کی سب سے بڑی دولت وہ عقیدہ اور یقین تھا جس کے سہارے اس طرح کے لوگ سخت سے سخت مراحل طے کرلیتے ہیں یعنی جو لکھا ہے وہ پورا ہونا ہے۔ اسلم پرویز کے بقول:

چچی شاید لوح محفوظ کی حقیقت سے واقف تو نہیں تھیں لیکن یہ فقرہ البتہ ان کی گفتگو میں تکیہ کلام کا سا درجہ رکھتا تھا کہ 'بوا لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا' چچی نے بھی لکھے کو مٹانے کی کوشش نہیں کی انھوں نے لکھے کے آگے سر جھکا کر ہی اپنی ساری زندگی گزاری۔

(گھنے سائے: اسلم پرویز، دلی کتاب گھر نئی دہلی 2010، ص63)

خدمت خلق کا جذبہ چچی کے یہاں بہت تھا۔ دکھ سکھ میں وہ اپنے پرائے سب کے یہاں شریک رہتیں۔ چچی کو ہر بات جاننے یا سن گن لینے میں ملکہ حاصل تھا۔ آپ کوئی بات بتائیں یا نہ بتائیں لیکن کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ جس کے گھر جاتی ایک نظر میں سب حال معلوم کرلیتی۔ بڑی بوڑھیوں والے نسخے اور علاج تو ان کے پاس بے شمار تھے۔ وقت بے وقت کسی کی بھی طبیعت خراب ہوتی چچی حاضر رہتیں اگر کسی کو ڈاکٹر کے یہاں جانا یا دوا لانا ہوتو یہ خدمت بھی وہ بجالاتیں۔ گھر کے قریب ایک ڈاکٹر کی نئی نئی دکان کھلی تو اس کو فوراً آزما لیا اور پھر یہ تبصرہ کیا کہ "بوا ہے تو ٹٹ پونجیا مگر دوا اچھی دیتا ہے۔"

چچی کو سینے پرونے میں کمال حاصل تھا۔ "اپنی سوئی کی نوک سے وہ کپڑے پر خط گلزار کے وہ نمونے پیش کردیا کرتی تھیں کہ جو بڑے بڑے خطاط اور خوش نویس قلم کے قط سے نہیں کرسکتے۔ جب تک وہ سہاگن تھیں طرح طرح کے جوڑے اپنے ہاتھ سے بناتی

تھیں۔ یہی مہارت اب ان کی زندگی کی امید اور سہارا ہے۔ خاکے کی یہ سطریں ملاحظہ کریں:

''ہاتھ کی تر پائی کے مقابلے میں اس موئی سنگر مشین کی حیثیت چچی کے نزدیک وہی تھی جو اکبر بادشاہ کے نزدیک خطاطی کے مقابلے میں چھاپہ خانے کی تھی۔ چچی اگر چہ انسان کے چاند پر پہنچنے کے بھی دس برس بعد اللہ کو پیاری ہوئیں لیکن سلائی مشین کے ہینڈل کو ان کا ہاتھ مرتے دم تک چھو کر نہیں گزرا۔ وہ سلائی کا باریک سے باریک کام بڑی مہارت سے کرتی تھیں۔ ان کے کام میں لاگت برائے نام اور محنت اور کاریگری پوری ہوتی تھی... وہ سلائی کے کرتوں، ساڑیوں اور دوپٹوں پر کیکری کے کٹاؤ کا بہترین کام بنا دیا کرتی تھیں... چچی کے پاس کام کی کمی نہیں تھی مگر اس کام سے ان کا بمشکل ہی گزارا ہوتا تھا۔'' (ایضاً، ص63)

سائنسی ایجادات سے چچی کو الجھن تھی۔ بس اور موٹر سے انھیں چکر آتے تھے۔ بائیسکوپ پسند نہیں تھا۔ ریڈیو سے طبیعت اکتاتی تھی۔ ٹیلی ویژن کھلتے ہی وہ برقع اٹھا کر اس گھر کی راہ لیتیں جہاں ٹی وی نہیں ہوتا۔ بیوگی اور دقیانوسی خیالات کے باوجود انھیں جینے کا ڈھب آتا تھا۔ وہ سیدانی تھیں مگر اس کی پروا کیے بغیر کوشش کی کہ بیٹیاں جس قدر جلد ممکن ہو اپنے گھر کی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ چچی نے ایک بھرے پرے سماج میں اپنی موجودگی کا احساس درج کرایا۔ عورت ہونے کے باوجود گھر کی تمام ذمے داریوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ ادا کیا۔ شکوہ اور شکایت کے بجائے شکر گزاری کا جذبہ ہی ان کا رہنما بن گیا۔ دلی دروازے کے باہر نئے قبرستان میں بہت سی گمنام قبروں میں ایک قبر ان کی بھی ہے۔

جاوید صدیقی کے خاکوں کا مجموعہ 'روشن دان' کے نام سے ہے۔ اس کے بعض خاکے تو شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک خاکہ جیانی کے نام سے ہے۔ یہ دراصل ایک حویلی کی کہانی ہے جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی شان وشوکت سے محروم ہوتی چلی گئی اور یہاں تک کہ اس کے مکینوں کو فاقوں تک کی نوبت آ گئی۔ جب حویلی میں غربت کا دور شروع ہوا تو ملازموں کا حساب کتاب صاف کر کے انھیں رخصت کر دیا گیا وہ دعائیں دیتے چلے۔ مگر جیانی نے جانے سے انکار کر دیا۔ تھیں تو وہ نوکرانی مگر حویلی میں حکم ان کا ہی چلتا تھا۔ جیانی حویلی میں بہت کم عمری میں آئی تھیں یہیں وہ

حاشیائی ادب کی خاکہ بندی میں اردوادب کے لازوال خاکے اپنی کیفیت اور کمیت میں کسی بھی زبان کے ادب کے مدمقابل رکھے جانے کے لائق ہیں۔ معمولی انسان کے گرد یہ خاکے کچھ اس خوبی سے قدروں کی شمع روشن کرتے ہیں کہ انسانیت کا سربلند ہوجاتا ہے اور خالق کائنات کے منشا کی درست تعبیر بھی سامنے آجاتی ہے۔ قدریں اگر آفاقی ہوتی ہیں تو کہنے دیجیے کہ اردوادب کے دامن میں آباد حاشیائی زمرے کے ان خاکوں کا آفاق ہمیشہ روشن رہے گا۔

جوان ہوئیں۔ شادی کی خوشی اور جوانی میں بیوگی کا دکھ اسی حویلی میں کاٹ دیا۔ جیانی نے حویلی کی شان وشوکت کا دور بہت قریب سے دیکھا تھا مگر اب دور زوال تھا۔ چیزیں بک رہی تھیں۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گلو بند تو بہت پہلے بک چکا تھا۔ فصلیں، پھل یہاں تک کہ مرغیاں بھی بیچ دی گئیں۔ اب گھر کے سامان کی باری تھی۔ ان کی فہرست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے:

''اونچی اونچی الماریاں جن میں جرمن کانچ لگے ہوئے تھے۔ ٹی سٹ اور ڈنر سٹ جن کے اوپر جارج پنجم اور ملکہ میری کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ہاتھ کے بنے ہوئے کانچ کے گلاس جن کے اوپر سنہری کام کیا ہوا تھا، ہاتھی دانت کے پایوں والی مسہری، تانبے پیتل کے برتن اور نہ جانے کیا کیا۔''

(روشن دان، جاوید صدیقی، 2012)

رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آ گیا جب پانچ ہزار گز والی اس حویلی میں کوئی ایسی چیز نہیں بچی تھی جسے بیچ کر پاؤ بھر آٹا منگایا جا سکتا۔ رات کچے پکے امرود کھا کر گزاری گئی۔ صبح جیانی غائب تھی۔ دوپہر تک تلاش ہوتی رہی۔ جب وہ آئی تو اپنے ساتھ دو تھیلے میں کھانے پینے کا سامان اپنے بیٹے کے یہاں سے لائی جو نواب صاحب کے یہاں 'خاص باغ پیلس' میں پہریداری کرتا تھا۔ کھانا جب تیار ہو گیا تو دسترخوان لگا دیا گیا۔ اس کے بعد جاوید علی صدیقی لکھتے ہیں:

''اور پھر جب مدارالمہام، سردار ڈیوڑھی، افسر ذات خاص حافظ احمد علی خاں بہادر کی بہو اور تحصیل دار اشرف علی خاں صاحب بہادر کی بیوہ نے چار وقت کے فاقے کے بعد روٹی کا ٹکڑا توڑا تو اچانک رک گئیں انھوں نے جیانی کی طرف دیکھا جو پاس ہی کھڑی تھیں۔ تو بھی بیٹھ جا جیانی تو نے بھی تو کچھ نہیں کھایا ہوگا۔'' (ایضاً، ص39)

کرب والم کی یہ ایک غیر معمولی تصویر ہے۔ کیونکہ بڑی بیگم نے نوالہ منہ میں رکھنے سے پہلے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا تھا کہ 'اس نمک کا حق کیسے ادا ہوگا مولا'۔

کسی بھی معاشرے کا نشیب و فراز بہت کچھ سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ زوال کے اس لمحے میں ایک معمولی نوکر کا کردار کس طرح نمایاں ہوتا ہے جس سے محض اس کی عزت و توقیر میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ سماج کی اکائی میں بہت سے کردار ہوتے ہیں جو اپنے اپنے وقت پر کام آتے ہیں۔ کچھ یہی حال جیانی کا بھی تھا۔

حاشیائی ادب کی خاکہ بندی میں اردوادب کے لازوال خاکے اپنی کیفیت اور کمیت میں کسی بھی زبان کے ادب کے مدمقابل رکھے جانے کے لائق ہیں۔ معمولی انسان کے گرد یہ خاکے کچھ اس خوبی سے قدروں کی شمع روشن کرتے ہیں کہ انسانیت کا سر بلند ہو جاتا ہے اور خالق کائنات کے منشا کی درست تعبیر بھی سامنے آ جاتی ہے۔ قدریں اگر آفاقی ہوتی ہیں تو کہنے دیجیے کہ اردوادب کے دامن میں آباد حاشیائی زمرے کے ان خاکوں کا آفاق ہمیشہ روشن رہے گا۔

■

Dr. Omair Manzar
Assistant Professor, Dept of Urdu
Maulana Azad National University
(Lucknow Campus)
Lucknow- 226020 (UP)
oomairmanzar@manuu.edu.in

محمد شہباز عالم

اردو زبان و ادب کے فروغ میں منشی نول کشور کا حصہ

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے حوالے سے

منشی نول کشور (1836-1895) برصغیر کی علمی و ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں، جنھوں نے اردو، فارسی، عربی، اور سنسکرت زبانوں کی اشاعت اور علمی ورثے کے تحفظ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 1858 میں ان کے ذریعے قائم ہونے والا نول کشور پریس نہ صرف برصغیر، بلکہ پوری دنیا میں مشرقی ادب کے تحفظ، اشاعت، اور فروغ کا اہم ذریعہ بنا۔ اس پریس نے نایاب کتابوں اور مخطوطات کو شائع کر کے انھیں نئی زندگی بخشی۔ ان کا مطبع انیسویں صدی کے علمی اور ادبی ورثے کے تحفظ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

منشی نول کشور 3 جنوری 1836 کو متھرا کے ایک گاؤں ریڑھا میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا، منشی بالمکند، آگرہ میں سرکاری خزانچی تھے، جبکہ ان کے والد منشی جمنا داس ایک کاروباری شخص تھے۔ نول کشور نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں حاصل کی جہاں انھوں نے عربی اور فارسی پڑھی۔ بعد میں وہ آگرہ کالج میں داخل ہوئے۔ مطالعہ ان کا جنون تھا اور جلد ہی وہ مضامین لکھنے لگے جو آگرہ سے شائع ہونے والے معروف اردو اخبار 'صفیر' میں چھپنے لگے۔ 17 سال کی عمر تک وہ ایک مشہور قلمکار بن چکے تھے۔ انگریزی، سنسکرت اور ہندی میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔

مطبع کا قیام

1858 میں وہ لکھنؤ پہنچے اور وہاں ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں لیتھو پریس خرید کر کاروبار شروع کیا۔ ابتدائی طور پر نصابی کتب اور مذہبی کتابیں چھاپیں جو جلد فروخت ہو گئیں۔ ان کا اصل مقصد ایک اخبار نکالنا اور علمی و ادبی کام شائع کرنا تھا۔

'اودھ اخبار' کی اشاعت

نومبر 1858 میں انھوں نے لکھنؤ سے 'اودھ اخبار' جاری کیا جو برصغیر کی اردو صحافت کا سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس پر برطانوی حکومت کی حمایت کا الزام بھی لگا، لیکن 'اودھ اخبار' اردو صحافت کا ایک اہم ستون ثابت ہوا۔

نادر مخطوطات کا تحفظ

منشی نول کشور نے 1857 کے بعد ہندوستانی نادر مخطوطات کے تحفظ کے لیے بڑی محنت کی۔ انھوں نے نایاب نسخے خریدے، ماہرین سے ان کی تدوین کروائی اور انھیں شائع کیا۔ ان کا یہ کام نہ صرف علمی خزانے کو محفوظ کرنے کا باعث بنا، بلکہ ان محققین کے لیے روزگار کا ذریعہ بھی بنا جو 1857 کے بعد بے روزگار ہو چکے تھے۔

اردو اور دیگر زبانوں کی خدمات

انھوں نے اپنے مطبع سے اردو داستانوں جیسے 'امیر حمزہ'، 'طلسم ہوشربا'، 'بوستان خیال' وغیرہ کو شائع کیا۔ عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کے نایاب نسخے شائع کیے۔ ان کی غیر متعصب سوچ کے تحت رامائن، مہابھارت، گیتا کے ساتھ قرآن، حدیث اور اسلامی کتب بھی ان کے مطبع سے شائع ہوئیں۔

انتقال

47 سال کے مختصر عرصے میں بے مثال خدمات انجام دینے والے منشی نول کشور 19 فروری 1895 کو

اچانک انتقال کر گئے۔ لیکن اردو زبان وادب اور مشرقی علوم کے فروغ کے لیے ان کا چھوڑا ہوا ورثہ ناقابل فراموش ہے۔

منشی نول کشور کا مقصد ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کرنا تھا جو علمی، ادبی، اور ثقافتی ورثے کو محفوظ کر سکے۔ ان کا ادارہ ہندوستان کا پہلا پریس تھا جس نے نہ صرف اردو زبان، بلکہ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، اور دیگر زبانوں میں کتابیں شائع کیں۔ آہستہ آہستہ یہ پریس جدید طباعتی ٹیکنالوجی سے لیس ہوا اور اپنے وقت کے اعلیٰ معیار کے مطابق کتابوں کی اشاعتیں کیں۔

نول کشور پریس کی خدمات

1858 میں لکھنؤ میں قائم ہونے والے نول کشور پریس نے مشرقی علوم وفنون کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس مطبع نے نہ صرف اسلامی علوم، جیسے قرآن، حدیث، تفسیر، اور فقہ، بلکہ سنسکرت، ہندی، اور فارسی کے نادر و نایاب مخطوطات بھی شائع کیے۔ مطبع نے اردو، عربی، فارسی اور ہندی میں تقریباً 3,000 کتابیں شائع کیں، جن میں زیادہ تعداد اردو کتابوں کی تھی۔

اس مطبع کی ایک بڑی کامیابی داستانِ امیر حمزہ کی 46 جلدوں کی اشاعت ہے، جسے شمس الرحمٰن فاروقی ناقابل فراموش قرار دیتے ہیں:

"اگر نول کشور پریس داستانِ امیر حمزہ شائع نہ کرتا تو یہ ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جاتی۔"

پریس نے دیگر ادبی اور مذہبی کتابوں کے ساتھ ساتھ کئی کلاسیکی اور جدید موضوعات پر مبنی کتب شائع کیں، جنھوں نے برصغیر کے علمی ورثے کو محفوظ رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

نول کشور پریس اور اردو زبان کا فروغ

اردو زبان برصغیر کی تہذیبی اور ثقافتی وراثت کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ مختلف تہذیبوں، ثقافتوں، اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کی علامت بھی ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں اردو کا کردار مرکزی رہا ہے، اور اس کردار کو پروان چڑھانے میں مختلف افراد اور اداروں نے اپنا حصہ ڈالا ہے۔ ان میں منشی نول کشور کا نام ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ ان کے قائم کردہ نول کشور پریس نے اردو ادب کے فروغ میں ایک انقلابی کردار ادا کیا۔ یہ پریس نہ صرف اردو ادب کی اشاعت کا مرکز بنا، بلکہ اس نے مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے ادبی شاہکاروں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

اشاعتی مقاصد

اردو ادب کے کلاسیکی اور جدید ذخیرے کو عام قارئین تک پہنچانا۔

مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں کی اشاعت کر کے بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینا۔

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرنا۔

مختلف زبانوں کے ادبی شاہکاروں کو ایک دوسرے کے قریب لانا۔

اردو ادب کی ترویج میں نول کشور پریس کا حصہ

1. **شاعری کی اشاعت**: اردو شاعری کی ترقی میں نول کشور پریس کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اس پریس نے اردو شاعری کے کلاسیکی شعرا کے دیوان نہایت عمدہ طباعت کے ساتھ شائع کیے۔

دیوانِ غالب: غالب کی شاعری کو بہتر ترتیب اور معیار کے ساتھ پیش کیا۔

دیوانِ میر: میر تقی میر کی شاعری کو نئی نسل تک پہنچایا۔

دیوانِ سودا: سودا کی طنزیہ اور فکری شاعری کو دوبارہ زندہ کیا۔

2. **نثری ادب کی اشاعت**: نول کشور پریس نے اردو نثر کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان کے شائع کردہ مشہور ادبی کارنامے درج ذیل ہیں:

باغ و بہار: میر امن دہلوی کی اس داستان کو شائع کر کے اردو نثر کے حسن کو اجاگر کیا۔

فسانہ آزاد: پنڈت رتن ناتھ سرشار کے اس ناول کو شائع کیا جو اردو نثر کی ابتدا کا اہم سنگ میل ہے۔

داستان امیر حمزہ: داستانوی ادب کے اس شاہکار کو بڑے پیمانے پر عام کیا۔

3. **تراجم**: نول کشور پریس کی سب سے اہم خدمات میں مختلف زبانوں کے ادبی شاہکاروں کے تراجم شامل ہیں۔

سنسکرت سے اردو: رامائن اور مہابھارت جیسے ہندو دھرم گرنتھوں کو اردو زبان میں منتقل کیا۔

فارسی سے اردو: فارسی کے مشہور ادبی شاہکار جیسے شاہنامہ فردوسی کو اردو قارئین کے لیے پیش کیا۔

عربی سے اردو: اسلامی علوم، تفسیر، حدیث، اور دیگر مذہبی کتب کو اردو میں ترجمہ کیا۔

4. **مذہبی ادب**: نول کشور پریس نے مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے مختلف مذاہب کی کتابوں کو شائع کیا:

اسلامی ادب: قرآن مجید کے اردو تراجم، احادیث و تفاسیر کی اردو کتب، اور فقہ پر مبنی اردو کتابیں۔

ہندو دھرم گرنتھ: بھگوت گیتا اور دیگر ہندو مقدس کتب کے اردو تراجم۔

دیگر مذاہب: عیسائی اور سکھ مذہب کی کتابوں کی اردو زبان میں اشاعت۔

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے فروغ میں نول کشور کا کردار

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے میل جول کا ایک مظہر ہے۔ نول کشور پریس

> نول کشور پریس نے مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی شائع کردہ کتابیں مختلف مذاہب کے مقدس نظریات کو قارئین تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔

نے اس تہذیب کے فروغ میں درج ذیل طریقوں سے کردار ادا کیا:

زبانوں کی یکجہتی: اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں کتابیں شائع کر کے لسانی ہم آہنگی کو فروغ دیا۔

ثقافتی پہلو: ہندو اور مسلم ثقافتوں کے مشترکہ پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

مشترکہ موضوعات: ایسی کتابوں کی اشاعت کی جو دونوں مذاہب کے لیے اہم تھیں، جیسے مذہبی اخلاقیات اور سماجی موضوعات پر کتب۔

بین المذاہب ہم آہنگی: نول کشور پریس نے مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی شائع کردہ کتابیں مختلف مذاہب کے مقدس نظریات کو قارئین تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔

نول کشور پریس کی خصوصیات:

اعلیٰ طباعت: نول کشور پریس نے جدید طباعتی تکنیک کے ذریعے اعلیٰ معیاری کتابیں شائع کیں۔

دلکش سرورق: ان کی کتابوں کے سرورق دیدہ زیب اور خوبصورت ہوتے تھے۔

معیاری مواد: مواد کی ترتیب اور اشاعت میں معیاری اصولوں کا خیال رکھا گیا۔

جدید تحقیق میں نول کشور پریس کی اہمیت

آج بھی نول کشور پریس کی شائع کردہ کتابیں تحقیق کے لیے ایک اہم ذریعہ سمجھی جاتی ہیں۔

ڈیجیٹلائزیشن: جرمنی کی ہائیڈلبرگ یونیورسٹی اور دیگر اداروں نے نول کشور پریس کی کتابوں کو ڈیجیٹلائز کیا ہے۔

لائبریریوں میں موجودگی: دنیا کی بڑی لائبریریوں میں نول کشور پریس کی کتابیں موجود ہیں۔

تحقیقی ذرائع: اردو ادب، تاریخ، اور تہذیب پر تحقیق کے لیے ان کتابوں کو بنیادی ذرائع سمجھا جاتا ہے۔

نول کشور پریس کی مقبولیت

1858 میں، منشی نول کشور کا قائم کردہ مطبع جلد ہی برصغیر کے بڑے علمی و ادبی مراکز میں شمار ہونے لگا۔ یہ مطبع ان کے عزم، محنت، اور دیانت کا آئینہ دار تھا۔ سر رابرٹ منٹگمری اور کرنل ایبٹ کی سرپرستی نے ان کے کام کو مزید عروج بخشا۔ نول کشور کی دیانت داری، قابلیت، اور اشاعت کے اصولوں نے انھیں علمی دنیا میں منفرد مقام عطا کیا۔

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

”ان کی دیانتداری اور اصول پسندی نے مطبع نول کشور کو ہندوستان اور ایشیا کا ایک نمایاں علمی مرکز بنا دیا۔“

عبدالحلیم شرر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

”نول کشور پریس نے مشرقی ادب کو زندہ کر دیا۔ یہ ایک ایسا مرکز بن گیا جس کی علمی خدمات وسط ایشیا کے کاشغر و بخارا سے لے کر افغانستان و ایران تک محسوس کی گئیں۔“

نول کشور پریس کی بین الاقوامی اہمیت:

نول کشور پریس کی شہرت برصغیر سے باہر بھی پہنچی۔ ان کی مطبوعات دنیا کی بڑی لائبریریوں، جیسے برٹش لائبریری، ہارورڈ، اور آکسفورڈ یونیورسٹی کی لائبریریوں میں شامل ہوئیں۔ معروف یورپی جرنل Libri نے بھی ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور انہیں مشرقی ادب کے تحفظ کا ایک سنگ میل قرار دیا۔

منشی نول کشور اردو زبان و ادب کے وہ معمار ہیں جنھوں نے اردو کے فروغ کے ساتھ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی بقا میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔ ان کا ادارہ مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ نول کشور پریس نے جو خدمات انجام دیں، وہ آج بھی اردو ادب، ہندوستانی تہذیب، اور علمی و ادبی حلقوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کے کام کا تسلسل ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے وجود کو تقویت دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

حوالہ جات:

1. رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو (ہسٹری آف اردو لٹریچر)، منشی نول کشور، لکھنؤ
2. نیر مسعود: لکھنؤ کا عروج و زوال، نامعلوم تنظیم۔
3. شمس الرحمٰن فاروقی: اردو کا ابتدائی زمانہ، آج کی کتابیں، کراچی، 2009
4. مرزا غالب: خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور، 1962
5. شبلی نعمانی: مقالات شبلی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
6. Merket-Hilf, Nicole "naval Kishore Press: hidden Treasures" Heidelberg Unversity Library, 2018
7. مرزا خلیل احمد بیگ: اردو زبان کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1995
8. ضیاء الرحمٰن صدیقی: اردو ادب کی تاریخ، لاہوتی پریس، دہلی، 2018
9. منشی نول کشور: فہرست کتب خانہ تجارتی منشی نول کشور، منشی نول کشور پریس، لکھنؤ، 1930
10. امیر حسن نورانی: سوانح منشی نول کشور، خدا بخش لائبریری، 1995
11. امیر حسن نورانی: منشی نول کشور اور ان کے خطاط و خوش نویس، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1994
12. ڈاکٹر آصفہ زمانی: منشی نول کشور اور ان کی ادبی خدمات، روہتا شو پرنٹرس، لکھنؤ، 2000
13. آر ایس ورما: تعمیر ہریانہ (منشی نول کشور نمبر)، جولائی، اگست، شمارہ نمبر 008۔ 007، 1979

■

Mohammad Shahbaz Alam
Head, Department of Arabic
Sitalkuchi College, Sitalkuchi, Cooch Behar-736158 (West Bengal)
Mobile: 9064502370
Email: shahbazslkc@gmail.com

ادارہ

عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کی ثقافتی سرگرمیاں

3 فروری 2025: قلم کار کا ادبی سفر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پران چڑھانے کے لیے بھارت منڈپم عالمی کتاب میلہ کے ہال نمبر 2 قومی اردو کونسل کے اسٹال Q-7 پر 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' مرکزی عنوان کے تحت 2 سے 9 فروری تک تہذیبی اور ثقافتی پروگراموں کا انعقاد کیا گیا۔ اسی کے تحت آج قلم کار کا ادبی سفر کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں بطور تخلیق کار ڈاکٹر فیضی، دہلی، شہناز رحمان، علی گڑھ اور حنیف خان، علی گڑھ نے شرکت کی۔ اس نشست کی صدارت پروفیسر اخلاق احمد آہن نے کی۔

اس موقعے پر قلم کاروں نے اپنے ادبی اور تخلیقی سفر، عصری منظرنامے، نئی نسل کے تخلیقی رجحانات وغیرہ پر گفتگو کی۔ اس نشست کی نظامت نایاب حسن نے کی۔ اس موقعے پر صدارتی خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اخلاق احمد آہن نے کہا کہ اس گفتگو کے دوران قلم کاروں نے اہم نکات اور تجربات پیش کیے۔ انھوں نے اردو شعر و نثر کی تخلیق کے تاریخی تناظر پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ کسی بھی زبان کی تخلیق کو تخلیق کار کے بجائے تمام اہل زبان سے وابستہ کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال بھی موجود رہے اور انھوں نے تمام شرکا کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہی اردو زبان کا مستقبل ہیں، آپ حضرات کی گفتگو اچھی رہی اور موضوع کے تمام پہلوؤں پر قابل غور نکات سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نوجوانوں کو پرکھنا، سمجھنا اور آگے بڑھا میری پلاننگ کا حصہ ہے، میرا مقصد یہی ہے کہ ہم ابھرتے ہوئے قلمکاروں کو موقع دیں اور ان کی صلاحیتوں کو نکھاریں۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل کو مسلسل سیکھتے رہنا چاہیے اور کبھی اپنے آپ کو مکمل نہ سمجھیں، تبھی آپ حقیقی معنوں میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

3 فروری 2025: محفل شعرو سخن اور مصنفین سے ملاقات

3 فروری 2025 کو بھارت منڈپم (پرگتی میدان) میں لیکھک منچ پر میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں بطور مصنف ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا اور ڈاکٹر رضوان الحق نے شرکت کی جبکہ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی

نے کی۔ اس موقعے پر مصنفین نے اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے تخلیقی سفر کے حوالے سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر رضوان الحق نے کہا کہ قلمکار کو کرداروں میں ڈھل کر کہانی لکھنی چاہیے، تبھی ہم اچھے تخلیق کار بن سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے تخلیقی سفر میں فلموں اور فلمی گانے کا اہم کردار رہا۔ میں نے فلموں سے متاثر ہوکر ہی تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ آج بچوں کے لیے لکھنا بھی ضروری ہے، ہمارے اوپر منحصر ہے کہ بچوں کی تربیت کیسے کریں اگر گھروں میں ہم اردو کا ماحول بنائیں تو اردو کبھی ختم نہیں ہوسکتی، اگر ہم اردو میں کہانیاں سنائیں گے تو ہمیشہ اچھے اثرات مرتب کریں گی، بچوں کے قلمکاروں کو بچوں کی ذہنی ساخت اور نفسیات کو سامنے رکھ کر کہانی لکھنی چاہیے۔ قبل ازاں دوپہر دو بجے سے ساڑھے تین بجے تک قومی اردو کونسل کے اسٹال پر محفل شعروسخن کے عنوان سے نوجوان شاعروں کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس میں صدام حسین مضطر علی گڑھ، خوشبو پروین، دہلی اور سفیر صدیقی دہلی نے شرکت کی۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ثاقب فریدی نے کی جبکہ صدارت ڈاکٹر رحمان مصور نے کی۔

4 فروری 2025: ترجمے کی اہمیت پر مذاکرہ اور مشاعرہ

قومی اردو کونسل کے زیراہتمام عالمی کتاب میلے میں آج دو پروگراموں کا انعقاد ہوا۔ پہلا پروگرام قومی اردو کونسل کے اسٹال پر ترجمے کی اہمیت کے عنوان سے ہوا جس میں نئی نسل کے مترجمین ڈاکٹر احسن ایوبی، ڈاکٹر نوشاد منظر اور ڈاکٹر جاوید عالم نے بطور مہمان شرکت کی اور انھوں نے ترجمہ نگاری کے تعلق سے اپنے تجربات شیئر کیے۔ انھوں نے ترجمے کے حوالے سے نئے رجحانات پر بھی گفتگو کی۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر سرورالہدیٰ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں نئی نسل کے ترجمہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ صدی کثیر لسانی ثقافت سے شناخت کی جاتی ہے، ایسے میں نئی نسل کے لیے مختلف زبانوں اور علوم سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ نئی نسل کا مختلف زبانوں کی طرف بڑھتا ہوا رجحان خوش آئند ہے۔ نظامت ڈاکٹر عبدالباری نے کی۔

بعدازاں قومی اردو کونسل کے زیراہتمام 'لیکھک منچ' میں ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر چندر بھان خیال نے کی۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج کل مشاعرے تو بہت ہورہے ہیں لیکن اس کا معیار و وقار دن بدن گرتا جارہا ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے جس طرح کی کوششیں ہونی چاہئیں وہ آج کل کے مشاعرے میں ناپید ہیں۔ سنجیدہ مشاعرے کے انعقاد کے حوالے سے قومی اردو کونسل کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔ ان کے علاوہ اس مشاعرے میں اقبال اشہر، نصرت مہدی، پاپولر میرٹھی، اور آلوک یادو نے خوبصورت اشعار پیش کیے۔ نظامت معین شاداب نے کی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر عبدالباری نے انجام دی۔

مشاعرے کے منتخب اشعار پیش ہیں:

دل میں جب جستجو کے شرارے چلے
میری انگلی پکڑ کر ستارے چلے

(چندر بھان خیال)

کھلی آنکھوں ہی رخصت ہوگئی وہ
مجھے آنے میں دیری ہوگئی تھی
(اقبال اشہر)

میں کہاں اپنی کسی فکر کے اظہار میں تھی
میں تو ہر دور میں سونپے ہوئے کردار میں تھی
(نصرت مہدی)

جذبۂ انسانیت سے اپنا رشتہ توڑ کر
ڈاکو کو کیا مل گیا شاعر کا جبڑا توڑ کر
(پاپولر میرٹھی)

نئی نسلوں کے ہاتھوں میں بھی تابندہ رہے گا
میں مل بھی جاؤں گا مٹی میں قلم زندہ رہے گا
(آلوک یادو)

افلاک تو کیا ملتے زمیں کا نہ رہوں گا
میں تیرے بھروسے پہ کہیں کا نہ رہوں گا
(معین شاداب)

6 فروری 2025: محفل افسانہ خوانی

6 فروری کو عالمی کتاب میلے میں 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' کے تحت محفل افسانہ خوانی کا انعقاد ہوا جس میں نئی نسل کے فکشن نگاروں ڈاکٹر نورین علی حق، ڈاکٹر محمد عرفان اور ڈاکٹر سفینہ بیگم نے شرکت کی اور افسانہ نگاری کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی صدارت معروف فکشن نقاد پروفیسر ابوبکر عباد، صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے کی۔ انھوں نے صدارتی خطاب میں کہا کہ نئے افسانہ نگاروں سے بہت توقعات ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ نئی نسل کے افسانہ نگار نئے موضوعات اور عصری تقاضوں کے تحت افسانے لکھ رہے ہیں اور ان کے یہاں امکانات کی ایک دنیا آباد ہے۔ این سی پی یو ایل کا یہ قدم لائق تحسین ہے کہ عالمی کتاب میلے میں نئے تخلیق کاروں کو پلیٹ فارم مہیا کیا ہے جہاں وہ اپنے جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات کو عام قاری سے شیئر کر رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ نئی نسل کے تخلیق کاروں کے تعلق سے بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں تحفظات اور تعصبات بھی ہیں مگر قومی اردو کونسل نے انھیں موقع فراہم کرکے نئی نسل کے تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض فیضان الحق نے انجام دیے۔

7 فروری 2025: 'میری پسندیدہ کتاب' اور 'پارلیمانی بحثوں اور عدالتی فیصلوں میں اردو کا رنگ و آہنگ'

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام عالمی کتاب میلے میں 7 فروری کو دو پروگراموں کا انعقاد ہوا۔ پہلا پروگرام کونسل کے اسٹال پر میری پسندیدہ کتاب کے عنوان سے ہوا جس میں ڈاکٹر جاوید حسن اور ذبیح اللہ نے شرکت کی اور انھوں نے اپنی پسندیدہ کتابوں کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر متھن کمار شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل کا یہ اقدام خوش آئند ہے، یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ سنجیدہ کتابیں سماج کو روشنی دیتی ہیں اور ان کے مطالعے سے انفرادی و اجتماعی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔ اس پروگرام کی نظامت نصرت جہاں نے کی۔

بعد ازاں کونسل کے زیر اہتمام تھیم پویلین میں 'پارلیمانی بحثوں اور عدالتی فیصلوں میں اردو کا رنگ و

آہنگ' کے عنوان سے مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں اعجاز مقبول سینیر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ، پروفیسر خواجہ محمد شاہد سابق پرو وائس چانسلر مانو اور پروفیسر نزہت پروین خان، سابق ڈین فیکلٹی آف لا جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شرکت کی۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے انجام دیے۔

اس موقعے پر استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اپنی بات کو پر اثر بنانے کے لیے پارلیمانی بحثوں اور عدالتی فیصلوں میں اردو شاعری اور اردو محاوروں کا شروع سے ہی استعمال ہوتا رہا ہے، اب بھی ہوتا ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا۔

اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر نزہت پروین خان نے کہا کہ زبان تہذیب وثقافت کی ترجمانی کرتی ہیں، پارلیمنٹ میں مجاہدین آزادی، وزرا اور سینیر ممبران نے ہمیشہ اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے اشعار استعمال کیے ہیں۔ انہوں نے مختلف مواقع پر پارلیمنٹ اور عدالت میں پیش کیے گئے متعدد اشعار بھی کوٹ کیے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اردو شاعری کی خوبصورتی ہے کہ اسے اپنی بات آسانی سے اور موثر انداز میں پیش کرنے کے لیے ہر طبقے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عدالتی فیصلوں میں بھی اردو کا بہت استعمال ہوتا ہے، ایف آئی آر میں بھی اردو کے بہت سے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ سینیر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ اعجاز مقبول نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری ہمیشہ سے وطن دوستی اور محبت کو فروغ دیتی آئی ہے، انھوں نے بھی متعدد عدالتی فیصلوں میں مستعمل معنی خیز اردو اشعار کے حوالے دیے۔ پروفیسر خواجہ محمد شاہد نے کہا کہ اردو شعروں میں معنوی وسعت ہوتی ہے، اپنی بات شعری پیرایے میں خوبصورتی سے کہی جا سکتی ہے، یہ اس زبان کی خوبی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پارلیمنٹ کی کچھ بحثوں کو سنیں تو بے شمار اشعار کا استعمال ملتا ہے اور ہر سال کتنے اشعار استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ ان کی نمبر شماری بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی خوبی یہ ہے کہ چند مصرعوں میں پوری بات کہی جا سکتی ہے، اسی وجہ سے ہمارے سیاسی لیڈران اکثر و بیشتر اردو اشعار کے ذریعے اپنی بات کو مدلل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب پارلیمنٹ یا عدالت میں بحث ہوتی ہے تو ایک شعر پورے منظر کی ترجمانی کر دیتا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ اور موجودہ وزیر اعظم نریندر مودی وغیرہ کے ذریعے پارلیمانی بحثوں میں استعمال کیے گئے متعدد اشعار بھی پیش کیے۔ آخر میں این بی ٹی کے ایڈیٹوریل اسسٹنٹ لیاقت علی نے رسم شکریہ ادا کی۔

8 فروری 2025: ادب اطفال

8 فروری 2025 کو عالمی کتاب میلے میں ادب اطفال کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد ہوا، جس میں ڈاکٹر امیر حمزہ اور ڈاکٹر غزالہ فاطمہ نے شرکت کی۔

انھوں نے موجودہ دور میں ادب اطفال کی اہمیت و افادیت، زبان و اسلوب اور ادب اطفال کی صورت حال کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس پروگرام کی صدارت ڈاکٹر بھانو پرتاپ شعبۂ اردو، ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی نے کی۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اردو میں بچوں کے ادب پر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے، نئی نسل کے مصنفین اور تخلیق کاروں کو سیکھنا ہوگا کہ بچوں کے لیے کیسے لکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ آج کا بچہ پہلے کے بچے سے بہت مختلف ہے، آج بچوں کی ترجیحات بدل رہی ہیں، اس لیے لکھنے والوں کو بھی اپنی ترجیحات بدلنی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ اردو میں زبان کی سطح پر توجہ ہے مگر لکھنا کیا ہے اس پر توجہ نہیں ہے، اس لیے ادب اطفال پر ہمیں بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ بچوں کے لیے اگر اچھا ادب نہیں تخلیق کیا گیا تو ادب عالیہ کی بھی تخلیق نہیں ہو پائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ بچوں کے لیے جب ہم مواد تیار کرتے ہیں تو آس پاس کے ماحول کو بھی دیکھنا چاہیے، ہندوستان جو کثیر لسانی اور ثقافتی ملک ہے، یہاں بہت سے ثقافتی اور تہذیبی مراکز ہیں اور بہت سی اہم سماجی، سیاسی اور علمی شخصیات ہیں ان پر بچوں کے لیے لکھنا چاہیے، وہ جب ہندوستان کی مختلف زبانوں، مذاہب اور تہذیبوں کو پڑھیں گے تو ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے نوجوان تخلیق کاروں سے بہت امیدیں ہیں، ان کی زبان بھی اچھی ہے، ہم نئی نسل کو آنے والی نسل سے متعارف کرانا چاہتے ہیں جس کے لیے ہم مختلف سطحوں پر کوششیں کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر بھانو پرتاپ نے اپنے صدارتی خطاب میں نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ یہاں نوجوان نسل کی طرف سے تشفی بخش جوابات آئے، بچوں کی علمی اور اخلاقی تربیت کے لیے ادب اطفال تخلیق کیا جاتا ہے، ہم ٹیکنالوجی کے دور میں جی رہے ہیں اس لیے بچوں کی موجودہ نفسیات کو ملحوظ رکھ کر ادب تخلیق کیا جانا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچے ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کریں تو ان کو ان کی سمجھ کے مطابق مواد دینا ہوگا، آنے والے دور کے مطابق بچوں کو ڈھالنا آسان کام نہیں ہے، بچہ جس دور میں ہے وہ بھی اور جس دور میں ہم اسے لے جانا چاہ رہے ہیں وہ بھی اہم ہے، اس لیے ہم سب کو مل کر اچھے ادب کی تخلیق میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ قومی اردو کونسل کا یہ اقدام خوش آئند ہے۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاداب شمیم نے انجام دیے۔

9 فروری 2025: معاصر ادبی صحافت

9 فروری کو عالمی کتاب میلے کے آخری دن معاصر ادبی صحافت کے عنوان سے مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ یہ پروگرام قومی اردو کونسل کے اسٹال پر منعقد کیا گیا جس میں نئی نسل کے قلم کار ڈاکٹر خان محمد رضوان، ڈاکٹر محمد ریحان اور ڈاکٹر شاہد حبیب فلاحی نے بطور مہمان شرکت کی اور ادبی صحافت کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے موجودہ حالات میں اسے درپیش چیلنجز اور امکانات پر بھی روشنی ڈالی۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر محمد کاظم شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے نوجوانوں کو تبادلۂ خیال کے لیے اتنا اہم پلیٹ فارم مہیا کیا۔ انھوں نے مذاکرے میں شریک مہمانوں کو بھی مبارک باد پیش کی۔ پروفیسر کاظم نے مزید کہا کہ ٹیکنالوجی کے زمانے میں ہمیں زیادہ ذمے دار ہونے کی ضرورت ہے، آج کا مسئلہ یہ ہے کہ جو پیش کر رہے ہیں وہ اور جو ایویلیویٹ کر رہے ہیں وہ دونوں کی طرف سے غیر ذمے داری کا سامنا ہے۔ ادبی رسائل کی ادارت کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ رسالہ نکالنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے، اس کے لیے ایک ٹیم کا ہونا ضروری ہے، زبان کا جاننا الگ ہے ادب کا جاننا الگ ہے اور ادارت کا جاننا الگ چیز ہے، اس لیے ایک معیاری ادبی رسالہ اسی صورت میں کامیابی کے ساتھ شائع ہوسکتا ہے جب ایک باصلاحیت ادارتی ٹیم اس پر اپنی محنت و استعداد خرچ کرے۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر مسرت نے انجام دی۔

■

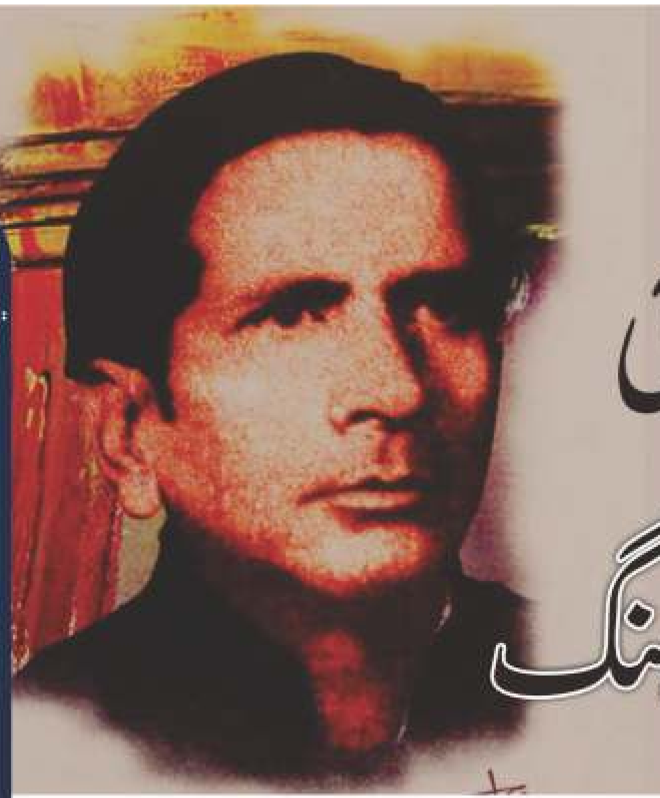

مجاز کی نظموں کا صوتی آہنگ

ناز بیگم

شاعری میں ایسے پیرائے اظہار یا اسلوب کا اہتمام کرنا جو محض ادائے مطلب کے لیے ضروری نہیں بلکہ کلام میں مزید حسن و لطافت اور معنی پیدا کرے صنعت کہلاتا ہے۔ صنعتیں بذات خود شاعری کا مقصد نہیں ہوتیں لیکن شاعری کا مقصد ان کے بغیر پورا بھی نہیں ہوتا کیونکہ ان کے ذریعے شعر کے تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ بعض علمائے بدیع نے ان خوبیوں کو کلام کے حسن عارضی سے تعبیر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظوں کی ان خوبیوں کی وجہ سے نہ صرف کلام دلکش ہوجاتا ہے بلکہ بعض اوقات یہی لفظی خوبیاں کلام کے فکری اور معنوی اوصاف کو بھی چمکا دیتی ہیں۔ بہت سی لفظی اور معنوی صنعتوں کی بنیاد اصوات کی تکرار اور ترتیب پر قائم ہے۔ شاعر جب اپنے کلام میں اصوات کی خاص ترتیب و تنظیم قائم کرتا ہے تو نہ صرف کلام میں مخصوص صوتی آہنگ پیدا ہوتا ہے بلکہ شاعر کے جمالیاتی انبساط کا بھی پتا چلتا ہے۔

مجاز کے کلام میں اصوات کی تنظیم اور ان کی تکرار کو خاص دخل ہے۔ وہ شعوری طور پر الفاظ میں صوتی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ مجاز ترقی پسند شاعر ہیں لیکن ترقی پسندی ان کے رومانی مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ انھوں نے غزلوں سے زیادہ نظمیں لکھیں ہیں۔ یہاں غزلوں سے قطع نظر ان کی نظموں میں لفظی خوبیوں اور صوتی ہنرمندیوں کی نشان دہی مقصود ہے۔ مجاز کی نظم 'نذر علی گڑھ' کے دو اشعار کے مختصر ترکیبی تجزیے اور اس کے بعد دیگر نظموں کے متفرق اشعار یا مصرعوں میں صوتی تنظیم اور لفظی صنعتوں کی نشان دہی سے ان کی نظموں میں صوتی آہنگ کی امتیازی خصوصیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ 'نذر علی گڑھ' کا پہلا شعر ہے۔

سرشار نگاہ نرگس ہوں پابستہ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

شعر میں بلبل، اور سنبل، اصل قافیے ہیں چمن مزید قافیہ کا حکم رکھتا ہے اس کی تکرار نے آہنگ میں ایک کھنک اور گونج پیدا کردی ہے۔ س اور رائے مہملہ کی بکثرت تکرار ہے جس سے روانی اور تسلسل میں اضافہ ہوا ہے۔ مصرعوں کے دونوں ٹکڑوں میں وقفہ دے کر آواز میں مدو جزر بھی لایا گیا ہے۔ اس طرح کی خوبیاں پوری نظم میں ملتی ہیں۔ نظم کا ایک اور شعر ہے۔

اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں اس بزم میں خنجر چومے ہیں
اس بزم میں گر کر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھومے ہیں

شعر کی پہلی خوبی یہ ہے کہ دونوں مصرعوں کے الفاظ ہم وزن ہیں۔ چھوٹی بڑی آوازوں کی جو ترتیب مصرع اول کے الفاظ میں ہے وہی ترتیب مصرع ثانی میں بھی ہے۔ دوسری ہنرمندی یہ ہے کہ اصل قافیہ 'چومے' اور 'جھومے' ہے لیکن مصرع اول کے دو مزید قافیے 'پھینکے' اور 'خنجر' کے جواب میں مصرع ثانی میں بالترتیب 'تڑپے' اور 'پی کر' مصرعے کے درمیان میں لائے گئے ہیں اس کی ردیف 'ہیں' ہے۔ اس کے علاوہ ایک فقرہ 'اس بزم میں' چار بار لایا گیا ہے۔ آہنگ سازی کا یہ انداز مجاز کا مخصوص حربہ ہے۔ ر، ز اور م کی آوازیں مکرر لائی گئی ہیں۔ گویا پوری نظم میں ایک طرح کا داخلی توازن اور آرائش کارفرما ہے۔

صوتی تکرار کی وجہ سے شعر کی نغمگی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کا شمار محاسنِ شعری میں کیا جاتا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم صاحب لکھتے ہیں:

''ہر زبان کے علم بدیع میں ایسی بہت سی لفظی صنعتیں اور بعض معنوی صنعتیں ملتی ہیں جن کا مقصود ہی اصوات کی تکرار ہے یا جن کا استعمال بیشتر صورتوں میں تکرار اصوات کا باعث ہوتا ہے۔''

(درست بلاغت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص 121)

اردو میں متعدد لفظی صنعتیں ہیں۔ ان میں سے چند ذو قافیتین، مع الحاجب، تضمن المزدوج، تکریر مطلق، تکریر مع الوسائط، رد العجز علی الحشو مع التکرار، واسع الشفتین، صنعت تفریع اور صنعت ترصیع وغیرہ۔ یہ سب دراصل صوتی صنعتیں ہیں۔ مجاز کے کلام میں مذکورہ بالا تمام صنعتیں استعمال کی گئی ہیں ان کے علاوہ مجاز کے کلام میں تکرار و اصوات کے ایسے کئی نمونے ملتے ہیں جن کے لیے علم بدیع میں کوئی نام نہیں دیا گیا ہے۔

لفظ آواز سے بنتے ہیں اور لفظوں کی تکرار یعنی آوازوں کی تکرار سے آہنگ پیدا

مجاز کے یہاں آزاد نظموں کی تخصیص نہیں۔ انھوں نے آزاد نظمیں نہیں لکھیں۔ ان کی نظمیں پابند اور نیم پابند ہیئت میں ہیں۔ ان میں قافیوں کی پابندی ہیئت کے مطابق کی گئی ہے لیکن نظموں کے اکثر بندوں، اشعار اور مصرعوں میں اندرون قافیہ کی کارفرمائی ہے جس سے کلام کی خوش آہنگی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

ہوتا ہے۔ آہنگ کا ایک خاص نظام ہو تو وہ نظم ہوتی ہے۔ نظم کا ایک خاص جزو قافیہ ہے۔ قافیہ شعر کو خوش آہنگ بنانے کا لطیف ترین طریقہ ہے۔ اکثر شعرا ایک شعر یا مصرع میں ایک سے زیادہ قافیے لاتے ہیں۔ شعر یا مصرعوں کے بیچ میں کسی خاص ترتیب سے لائے جانے والے دو یا زیادہ قافیوں کو علم بدیع میں صنعت ذوقافیتین کا نام دیا گیا ہے۔ اندرون قافیہ کے ذریعے نظم کا صوتی آہنگ مزید دل کش ہو جاتا ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اندرون قافیہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

''شعر کے اندر آنے والے قافیاتی لفظ کے ذریعہ شاعری، خاص کر آزاد شاعری کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔'' (ایضاً ص 121)

حقیقت یہ ہے کہ مجاز کے یہاں آزاد نظموں کی تخصیص نہیں۔ انھوں نے آزاد نظمیں نہیں لکھیں۔ ان کی نظمیں پابند اور نیم پابند ہیئت میں ہیں۔ ان میں قافیوں کی پابندی ہیئت کے مطابق کی گئی ہے لیکن نظموں کے اکثر بندوں، اشعار اور مصرعوں میں اندرون قافیہ کی کارفرمائی ہے جس سے کلام کی خوش آہنگی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ مجاز کی نظموں میں اندرون قافیہ یا ذوقافیتین کی ایک شکل وہ ہے جہاں ایک ساتھ دو قافیوں کا التزام کیا گیا ہے۔ مثلاً

اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی پروین سے رشتے جوڑے ہیں

اس شعر میں 'تارے' اور 'توڑے' کے جواب میں مصرع ثانی میں رشتے اور جوڑے قافیے ہیں۔

جب دو قافیوں کے درمیان ردیف لائی گئی ہو، صنائع لفظی کی رو سے ایسا پیرایہ بیان صنعت ذوقافیتین مع الحاجب کا حکم رکھتا ہے۔ مجاز کے کلام سے اس کی مثال ملاحظہ ہو

تجھ پہ یہ بار غلامی کا گراں ہے کہ نہیں   جسم میں خون جوانی کا رواں ہے کہ نہیں

جس طرح دو قافیوں کے درمیان ایک ردیف کا التزام کیا گیا ہے اسی طرح دو ردیف کے درمیان ایک قافیے کا التزام بھی مجاز کا مخصوص انداز ہے۔ مثلاً

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو

ذوقافیتین کی ایک شکل صنعت تضمین المزدوج کی ہے جہاں اصل قافیے کے علاوہ بھی کچھ ہم قافیہ الفاظ کا التزام کیا گیا ہے۔ علم بدیع میں ایسے ہم آواز الفاظ باقاعدہ قوافی کا حکم تو نہیں رکھتے لیکن صوتی یکسانیت کے لحاظ سے قافیہ کا نام دیا گیا ہے۔ کلام مجاز میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اسلام کے اس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آزر بھی
تہذیب کے اس مے خانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

کوئی بتائے عظمت خاک وطن کہاں ہے اب
کوئی بتائے غیرت اہل وطن کو کیا ہوا

میزان جوانی میں اسے تول رہی ہے
لب ساکت وصامت ہے نظر بول رہی ہے

وہ تسکین دل تھی سکون نظر تھی
نگار شفق تھی جمال سحر تھی

یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں، یاں ہم نے شب خون مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں، یاں ہم نے تاج اتارے ہیں

مجاز کے کلام میں اندرونِ قافیہ کی ایسی صورتیں بھی ملتی ہیں جن کا شمار لفظی اور صوتی صنائع میں نہیں ہوتا۔ اس تنظیم میں شعر کے کسی ایک مصرعے کے پہلے دو ٹکڑے میں یا دونوں مصرعوں کے پہلے ٹکڑوں میں اصل قافیے کے ہم قافیہ الفاظ لائے گئے ہیں۔ مثلاً

یہ دشت جنوں دیوانوں کا یہ بزم وفا پروانوں کی
یہ شہر طرب رومانوں کا یہ خلدِ بریں ارمانوں کی

ہر سرو سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا، غیروں کے چمن پر برسے گا

اس گل کدہ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں، پھر برق کڑکنے والی ہے

قافیے کے استعمال کی ایک صورت یہ ہے کہ شعر میں مقفیٰ الفاظ کسی خاص ترتیب کے بغیر لائے جائیں۔ مجاز کے کلام میں اندرونی اور غیر منظم قافیوں کی وجہ سے اصوات کی تکرار میں خاصا تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً

رقصاں چلا گیا، نہ غزل خواں چلا گیا   سوز و گداز و درد میں غلطاں چلا گیا
وہ انجیل پڑھ کر سناتی تھی مجھ کو   ہنسائی تھی مجھ کو رلاتی تھی مجھ کو

آہنگ سازی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ شعر کے دونوں مصرعوں کے تمام الفاظ ہم وزن رکھے جائیں۔ ایسا التزام صنعت ترصیع کا حکم رکھتا ہے۔ مجاز کے کلام میں اس کی مثالیں جا بہ جا ملتی ہیں۔ مثلاً

1	2	3	4	5
کسی	کی	حسرتیں	پامال	کرتی

1	2	3	4	5
کسی	کی	حسرتیں	ہمراہ	لے کر

1	2	3	4	5	6	7	8	9
مجھ	کو	تیرے	سحرِ	موسیقی	سے	کب	انکار	ہے
1	2	3	4	5	6	7	8	9
مجھ	کو	تیرے	لحنِ	داؤدی	سے	کب	انکار	ہے

1	2	3	4	5	6
ساونت	ہیں	ہم	بلونت	ہیں	ہم
1	2	3	4	5	6
مزدور	ہیں	ہم!	مزدور	ہیں	ہم

پہلے شعر کے مصرع اول میں پہلے لفظ کی آواز ایک چھوٹی ایک بڑی ہے۔ دوسرے لفظ کی ایک بڑی آواز ہے۔ تیسرے لفظ کی ایک بڑی ایک چھوٹی اور ایک بڑی آواز ہے۔ چوتھے لفظ کی دو بڑی ایک چھوٹی اور آخری لفظ کی دو بڑی آوازیں ہیں۔ آوازوں کی یہی ترتیب مصرع ثانی میں بھی ہے۔ بقیہ اشعار میں بھی ہم وزن الفاظ کا التزام کیا گیا ہے۔ نظم 'پہلا جشن آزادی' کے بیشتر بند کے دو دو مصرعے ہم وزن الفاظ پر مشتمل ہیں۔

جب کسی شعر یا فقرے میں ایسے الفاظ لائے جائیں جن میں کسی بھی لفظ کی ادائیگی میں لب سے لب نہ ملے تو اس میں صنعت واسع الشفتین کی خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجاز کے کلام میں ایسے متعدد اشعار یا مصرعے ہیں جن میں اس صنعت کی خوبی موجود ہے۔ مثلاً

سر راہ گذر کچھ سنائے چلا جا ہنسائے چلا جار لائے چلا جا
کیسی سندر ہے کیا کہیے ننھی سی اک سیتا کیسے

اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں

دو الفاظ جو ایک ہی معنی رکھتے ہوں شعر یا مصرعوں میں برابر جمع کیے جائیں تو ایسے پیرائے بیان کو صنعت تکریر یا تکرار کہتے ہیں۔ اس کی مختلف شکلوں میں ایک تکریر مطلق ہے جس میں لفظ مکرر لائے جاتے ہیں مجاز کے کلام میں ایسے اشعار اور مصرعے کثرت سے ہیں جن میں صنعت تکرار کی خوبی ہے۔ مثلاً

اک اک ادا میں سیکڑوں پہلوئے دل دہی اک اک نظر میں پرسش پنہاں لیے ہوئے
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبرائی ہوئی
بستی بستی لوٹ مچی ہے سب بنیے ہیں سب بیو پاری

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ مے خانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل

صنعت تکریر کی دوسری قسم صنعت تکریر مع الوسائط کی ہے جس میں دو مکرر لفظوں کے درمیان کوئی اور لفظ موجود ہو۔ مجاز کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کشمکش سی کشمکش میں ہے مذاق عاشقی کامراں سی کامراں ہر سعی امکانی ہے آج
دل مجروح کو مجروح تر کرنے سے کیا حاصل؟ تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتی تو اچھا تھا

اس طرف ہاتھوں میں شمشیریں ہی شمشیریں ہیں
اس طرف ذہن میں تدبیریں ہی تدبیریں ہیں

ہماری زبان میں ایسی کئی صنعتیں ہیں جن کی وجہ سے پورے لفظ کی تکرار کسی خاص ترتیب و تنظیم کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب شعر میں وہ لفظ جو عجز میں آئے وہی لفظ حشو میں ہو اور وہ لفظ تجنیس کی رعایت کے بغیر دہرایا جائے تو صنعت رد العجز علی الحشو مع التکرار ہوتی ہے۔

ان مکرر الفاظ کے ذریعے نہ صرف آہنگ میں لطافت پیدا ہو گئی ہے بلکہ زور بیان بھی دوبالا ہو گیا ہے۔ صنعت تکریر مع الوسائط کی ایسی مثالیں مجاز کے کلام میں بکثرت ہیں۔

ہماری زبان میں ایسی کئی صنعتیں ہیں جن کی وجہ سے پورے لفظ کی تکرار کسی خاص ترتیب و تنظیم کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب شعر میں وہ لفظ جو عجز میں آئے وہی لفظ حشو میں ہو اور وہ لفظ تجنیس کی رعایت کے بغیر دہرایا جائے تو صنعت رد العجز علی الحشو مع التکرار ہوتی ہے۔ مجاز کے کلام میں اس کی مثالیں ہیں لیکن کم۔ ایک مثال ملاحظہ ہو

کبھی اس کی شوخی میں سنجیدگی تھی کبھی اس کی سنجیدگی میں بھی شوخی

شعر میں لفظ 'شوخی' حشو اور عجز میں لایا گیا ہے۔

مجاز نے چند ایسے اشعار بھی نظم کیے ہیں جن میں صدر کے لفظ کا آخری حرف عجز کے لفظ کے آخری حرف کے موافق ہوتا ہے۔ یہ ایک مشکل فن ہے لیکن اس کی مثالیں مجاز کی نظموں میں ملتی ہیں۔ مثلاً

محرم درد و مسرت راز دارِ صبح و شام محفل فطرت کی خاموشی ہے تجھ سے ہم کلام
خوں کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں ڈوب جائیں گی چٹانیں خوں کے طوفاں میں

پہلے شعر کے صدر محرم کا آخری حرف 'م' عجز 'کلام' کے موافق ہے۔ دوسرے شعر کے صدر 'خوں' کا 'ں' عجز 'میں' کے نون غنہ کے موافق ہے۔

شعر یا مصرعے میں کوئی لفظ مکرر آتا ہے تو گویا اس لفظ کی تمام آوازیں (مصوتے اور مصمتے) ایک خاص ترتیب و تنظیم سے دہرائی جاتی ہیں لیکن بعض اوقات لفظ کی تکرار کسی ترتیب و تنظیم کے بغیر لائے جاتے ہیں۔ مجاز کے کلام میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر
با چشم نم ہے آج زلیخائے کائنات زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا

یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیت چھین لیتی ہے
یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے

ہم دیکھتے ہیں کہ اصوات کی تکرار میں مجاز کو بہت دلچسپی ہے۔ ان کے کلام میں ایسے بہت سے الفاظ اور مرکبات ملتے ہیں جن میں صوت یا اصوات کی منظم یا غیر منظم

تکرار ہیں۔ الفاظ اور مرکبات میں منظم اصوات تکرار کی چند صورتیں یہ ہیں:

(1) لفظ یا مرکب جس مصمتے سے شروع ہو وہی مصمتہ آخر میں بھی آئے۔ مثلاً رخسار، نگہبان، نشیمن، معصوم مریم، مظالم

(2) مرکبات میں تکرار اصوات کی ایک صورت یہ ہے کہ ہر جزو کی یا ایک سے زیادہ اجزا کی ابتدا ایک خاص مصمتے سے ہو مثلاً (ت) تب و تاب، تاب و توانائی، (د) در و دیوار، دشت و در، (س) سوز و ساز، ساز و سامان، سرو سمن، (ش) شان شایان، شراب و شبستاں، (ل) لطیف لہجہ، (م) محرومی و مجبوری، منزل مقصود، (ن) نگاہ نرگس، نرم و نازک، ناشاد و ناکارا، نرگس ناز، (ع) عیش و عشرت، (ز) زنجیر زنداں۔

(3) تکرار اصوات کی دوسری صورت وہ ہے کہ جس میں ہر جزو خاص مصمتے پر ختم ہوتا ہے مثلاً (ب) آب و تاب، (ر) دختر نیک اختر، در بدر، شور محشر، خمار کوثر، گوہر بار، (م) خرام ورم، دم بدم، بزم عام (ہ) رخشندہ و تابندہ (ش) دوش بدوش، (ت) ساکت و صامت، دشت ظلمات، ساغر سرشار۔

(4) ایک صورت یہ ہے کہ پہلا جز جس مصمتے پر ختم ہو دوسرا جزو اسی مصمتے سے شروع ہو مثلاً (ت) بہشت ترکمانی، عشرت تنہائی، (ب) قلب بلبل (د) سرود دل نشیں، (ز) ساز زیست (ع) شمع علم و فن (ن) سکونِ نظر، تمکینِ ناز، (چ) چشمِ مخمور (ر) سرِ رہ گذر۔

اصوات کی تکرار اور ان کی ترتیب سے پیدا ہونے والے صوتی آہنگ سے مجاز کی غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ کہنا چاہیے کہ وہ الفاظ کے انتخاب میں بالعموم صوتی مماثلت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کے بیشتر مصرعوں میں ایک اصوات ایسی ہوتی ہیں جن کا تکرار سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً

(i) ہر شام ہے شام مصر یہاں، ہر شب ہے شب شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

اس شعر میں (الف) پندرہ بار، (ہ) دس بار، (ر) چھ بار، (ل) چھ بار، (یائے معروف اور یائے مجہول) پانچ پانچ بار، (ش) پانچ بار (س) چار بار اور (ر)، (م)، (ب) مکرر لائے گئے ہیں۔

(ii) زمانے کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانین کہن، آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

اس شعر میں (ہ) آٹھ بار، (ن) چھ بار، (ک) چار بار، (و) پانچ بار، (ے) پانچ بار، اور (م)، (الف)، (ز)، (د) مکرر آئے ہیں۔

اصوات کے استعمال کے سلسلے میں مجاز کے کلام میں ایک میلان یہ نظر آتا ہے کہ وہ شعر یا بند کے کسی مصرعے کے کسی جزو میں ایسے الفاظ یک جا کر دیتے ہیں جن میں ایک یا زیادہ اصوات مشترک ہوتی ہیں۔ اصوات کے ایسے اجتماع اور تکرار سے مجاز کے کلام میں جو متنوع صوتی صورتیں بنتی ہیں وہ بڑی دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ مصمتوں سے ترتیب پانے والی چند صورتیں ملاحظہ ہوں۔

آج بھی ساز ہے مرے گرمیِ بزم سرکشی (ش)
آج بھی آتش سخن شعلہ فشاں شرر فشاں (ش ش ش)
پھر خبر گرم ہے وہ جانِ وطن آتا ہے (ن ن)
پھر وہ زندانی زندانِ وطن آتا ہے (ز ن ن ز ن ن ن)
مکھی بھنگے بھن بھن کرتے (ھ ھ ھ ن ھ ن)
ڈھونڈے ہیں مکڑی کے جالے (ھ)

مجاز کے کلام میں (س)، (ش)، (ہ)، (ر)، (الف)، (ت)، (و) اور نون غنہ کی بہت تکرار ہے۔ ماہر اصوات نے لکھا ہے کہ (س)، (ز)، (ش) کی صفیری آوازوں سے سرگوشی، خاموشی، سناٹا، سکون اور رازدارانہ کیفیات کے اظہار میں مدد

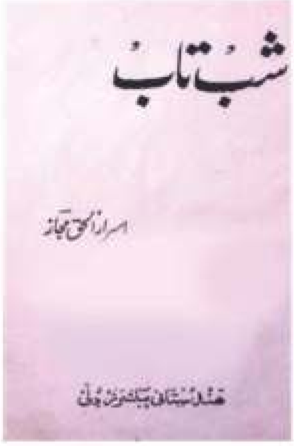

ملتی ہے اور یہ کہ مظاہر فطرت اور قدرتی بیان میں یہ آواز میں بکثرت استعمال ہوتی ہیں۔ مجاز کی نظموں کے صوتی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں (س) اور (ش) کی اصوات جنگ، غیظ و غضب، بے اطمینانی اور اضطراری کیفیت کی ترجمانی کے لیے زیادہ استعمال ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں (ش) سے بننے والے زیادہ تر الفاظ انھیں کیفیات سے متعلق ہیں مثلاً لشکر، شمشیر، مشیت، شکنجوں، نشیمن، خوں آشام، حشر، محشر، شب، شام، نشتر، شعلہ، شرر، وحشت، ناشاد، آشفتہ اور سنگ وحشت وغیرہ۔

(م) اور (ن) جیسے انفی مصمتے موسیقیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کے صوتی آہنگ سے شعر کی نغمگی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ مجاز کی بیشتر نظموں میں 'م' اور 'ن' کی آوازیں کثرت سے سنائی دیتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

درس سکون و صبر بہ ایں اہتمامِ ناز — نشتر زنیِ جنبشِ مژگاں لیے ہوئے
رنگِ گل ہائے گلستانِ وطن تم سے ہے — شورشِ نعرۂ زندانِ وطن تم سے ہے
نشۂ نرگسِ خوبانِ وطن تم سے ہے — عفتِ ماہ جبینانِ وطن تم سے ہے
تم ہو غیرت کے امیں تم ہو شرافت کے امیں — اور یہ خطرے میں ہیں احساس تمھیں ہے کہ نہیں

مجاز کی نظموں میں صوتی مطالعے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مجاز کی شاعری میں صوتی آہنگ ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ جس کے سبب اپنے موضوع کی اہمیت سے قطع نظر خود آوازوں کی سطح پر ان کا کلام انتہائی خوش آہنگ ہو گیا ہے۔ سماعت پر نغمے کا یہ خوش گوار اثر کلام مجاز کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ہے۔

■

Dr. Naz Begum
Assistant Professor, Urdu, Incharge Urdu Section
MMV, Banaras Hindu University
Varanasi- 221005 (UP)
Mob. 6393494769, email id- nazb985@gmail.com

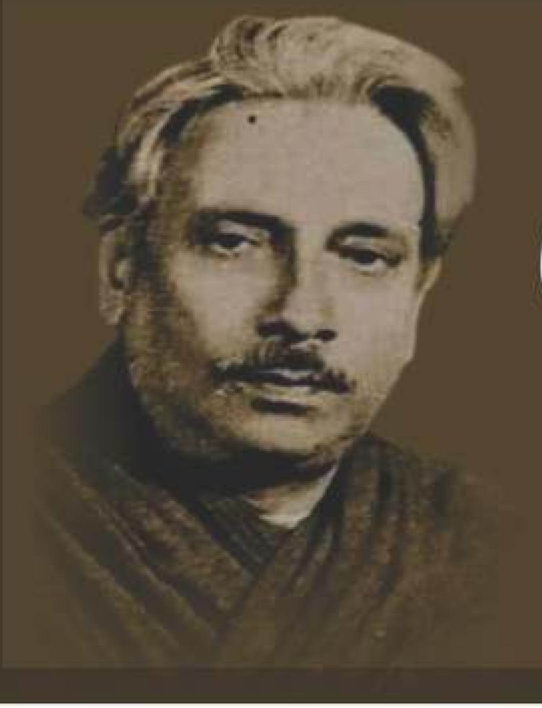

جمیل مظہری کی شاعرانہ خصوصیات

اسلم رحمانی

جمیل مظہری (2 ستمبر 1904، 23 جولائی 1979) کا نام اردو شاعری میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ باکمال شاعر تھے۔ ان کی شاعری معنی آفرینی، جدت طرازی اور متنوع مضامین کا احاطہ کرتی ہے۔ جمیل مظہری ان کم یاب و کامیاب شاعروں میں ہیں جن کی مقبولیت کا سبب فن کی سچائی اور تخلیقیت کی وہ سطح ہے جہاں تخلیق اور تخلیق کار اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ تخلیق اپنے خالق کا آئینہ اور تخلیق کار اپنی تخلیق کا عکس بن جاتا ہے۔

جمیل مظہری کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں انسانی جذبات کی گہرائی اور سچائی ہوتی ہے، جو قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔ مظہری نے اپنی شاعری میں نئے اور منفرد موضوعات کو چھیڑا ہے، جیسے محبت، زندگی کے مسائل اور معاشرتی موضوعات۔ ان کی شاعری میں خوبصورت تصویریں اور تشبیہیں ہوتی ہیں، جو قاری کو ایک نئے تجربے میں لے جاتی ہیں۔ ان کا رومانی انداز اور محبت کی خوبصورت تعبیرات انھیں خاص مقام عطا کرتی ہیں۔ یہ عوامل مل کر جمیل مظہری کی شاعری کو مقبول بناتے ہیں، اور اردو ادب میں ایک اہم مقام عطا کرتے ہیں۔

جمیل مظہری کا ایک نمایاں وصف ان کی بہت سی غزلوں کا بے حد ذاتی ہوتے ہوئے بھی غیر ذاتی ہونا ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ اکثر ان کے اپنے ذاتی درد و داغ کی داستان ہے، اس لیے اس میں تجربے کی سچائی اور جذبے کی وہ گرمی موجود ہے جو فرد کے نجی اوصاف کی مرہون منت ہوتی ہے۔ فنکاری یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے میں قاری و سامع کو اس طرح شریک رکھتے ہیں کہ وہ درد اس کو اپنا سا محسوس ہوتا ہے۔ شاعرانہ فنکاری کا مطلب ہے شاعری میں تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال۔ اس میں چند اہم عناصر شامل ہیں:

(الف) زبان اور الفاظ کا انتخاب: شاعر کو الفاظ کا ایسا انتخاب کرنا ہوتا ہے جو جذبات اور خیالات کو بہتر انداز میں پیش کرے۔

(ب) تخیل: شاعر اپنے خیالات کو منفرد اور جاذب نظر انداز میں پیش کرنے کے لیے تخیل کا استعمال کرتا ہے۔

(ج) غنائیت اور موسیقیت: شاعری میں ایک خاص ردم اور قافیہ کی اہمیت ہوتی ہے جو اسے موسیقی کی طرح جاذب بناتی ہے۔

(د) پیکر تراشی: شاعری میں الفاظ کے ذریعے بصری، سمعی یا حسی تجربات کو زندہ کرنا، تاکہ پڑھنے والا احساسات میں ڈوب جائے۔

(ہ) مضامین اور موضوعات: شاعری میں مختلف موضوعات جیسے محبت، فطرت، زندگی، موت وغیرہ کو پیش کیا جاتا ہے۔

یہ عناصر مل کر شاعری کو ایک منفرد اور دلکش شکل دیتے ہیں، جو پڑھنے والوں کے دلوں کو چھو لیتی ہے۔ جب ہم جمیل مظہری کی شاعری بالخصوص غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی شاعری فنکارانہ معیار پر کھری اترتی ہے۔ عام طور پر شاعری میں اور خاص طور پر غزل اور نظم میں فکر کی صلابت اور جذبے کی حلاوت کا متناسب امتزاج قائم رکھنا آسان نہیں ہے۔ صلابت کا مطلب ہے مضبوطی اور ثابت قدمی، جبکہ توانائی زندگی کی شدت اور جوش وخروش کی علامت ہے۔ غزل میں یہ عناصر عشق، جدوجہد، اور استقامت کے ساتھ مل کر گہرائی اور اثر پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، عشق میں صلابت کا اظہار وفاداری اور عزم کے ذریعے ہوتا ہے، جبکہ توانائی اس عشق کی شدت اور خلوص کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ دونوں کیفیتیں شاعری کی تخلیق میں ایک خاص چاشنی اور اثر پیدا کرتی ہیں، جو قاری کو متاثر کرتی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کی ہمت دیتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جمیل مظہری نے یہ مراحل شخصی تہہ داریوں اور تخلیقی باریکیوں کے ساتھ کامیابی سے طے کیے ہیں۔ ورنہ غزل اور نظم میں دانشوری کے اتنے سراب زدہ مواقع آتے ہیں کہ اگر دل دردمند، ظرف تربیت یافتہ، جذبہ سچا، زبان، متعلقات زبان پر عبور اور آنکھوں میں خواب نہ ہوں تو نہ شعر کے کلام موزوں بننے میں دیر لگتی ہے اور نہ آدمی کے نام نہاد نقاد بننے میں۔ مسائل و مقاصد کو ذات میں جذب کر کے جس شعری سطح پر جمیل مظہری نے غزلوں اور نظموں میں نبھایا ہے اس کی مثال شاعری کے موجودہ منظرنامے میں خال خال ہی ہے بطور مثال چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بس ایک احساس نارسائی نہ جوش اس میں نہ ہوش اس کو
جنوں پہ حالت ربودگی کی خرد پہ عالم غنودگی کا

ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغ منزل
کہیں سر راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا
خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں یہی نہ معنی ہے اس کے واعظ
وہ ابر کا منتظر کھڑا ہو مکان جلتا ہو جب کسی کا
وہ لاکھ جھکوا لے سر کو میرے مگر یہ دل اب نہیں جھکے گا
کہ کبریائی سے بھی زیادہ مزاج نازک ہے بندگی کا
جمیل حیرت میں ہے زمانہ مرے تغزل کی مفلسی پر
نہ جذبۂ اجتبائے رضوی نہ کیف پرویز شاہدی کا

جمیل مظہری کے شعری فن پاروں میں معاشرتی بحران کا انعکاس بخوبی ہوا ہے۔ انھوں نے موجودہ دور کا انتشار، اضطراب، تجسس، ہیجان اور پیچیدگیاں شعوری اور لاشعوری طور پر برتا ہے۔ جمیل مظہری نہ صرف ادبی حسن رکھتے ہیں بلکہ معاشرتی مسائل کی گہرائی میں جا کر ان کی تشریح کرتے ہیں، جو کہ معاشرتی بحران کی صورت حال کی عکاسی ہے۔ ان نظموں میں بیان کی خطابت نہیں بلکہ اظہار کی صلابت ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری چکا چوندھ سے پاک ہے۔ چکا چوندھ سے پاک شاعری کا مطلب ہے ایسی شاعری جو سادگی، شفافیت اور خلوص پر مبنی ہو۔ اس میں الفاظ کی بھاری بھرکم استعمال سے گریز کیا جاتا ہے، اور خیال کی وضاحت اور صفائی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس طرح کی شاعری میں انسانی جذبات، تجربات اور حقیقتوں کی عکاسی کی جاتی ہے، جس میں گہرائی ہوتی ہے لیکن پیچیدگی نہیں۔

جمیل مظہری نے اپنی شاعری میں عمیق احساسات کو سادہ اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کے روایتی مضامین اور خاص کر معاملہ بندی اور وادیٔ عشق کے عامیانہ موضوعات ان کے یہاں نہیں ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

خلاف رسم تغزل غزل سرا ہوں میں
رباب وقت کی بگڑی ہوئی صدا ہوں میں
فضائیں دیں نہ جگہ میری بے قراری کو
ہوائیں مجھ کو سلا دیں کہ جاگتا ہوں میں
جمیل خنکیٔ مرہم کا میں نہیں قائل
جراحتوں کو نمک داں دکھا رہا ہوں میں

جمیل مظہری کی شاعری میں ان کا انداز عموماً قدرے انفرادی ہوتا ہے اور ان کے تخلیقی وجدان میں حقیقت پسندی کی جو فکری سرشاری ہوتی ہے وہ ان کی شاعری میں بالکل نئی اور عجیب و غریب اہمیت کی حامل بنتی محسوس ہوتی ہے۔ اور اسی سے ان کی شاعری میں زندگی کی حرارت اور توانائی بھی پیدا ہوتی ہے۔

مظہری کی شاعری میں بھی حرارت اور توانائی ہے، ان کی نظم نگاری ہو یا غزل گوئی ان کے یہاں صرف الفاظ کی اداکارانہ ترتیب اور قافیہ پیمائی کا نام شاعری نہیں ہے بلکہ فکر و تخیل، تجربات و مشاہدات اور احساسات و جذبات کے تخلیقی حسن کے ساتھ فنی اظہار کا نام شاعری ہے اور ہر اچھی اور قابل قدر شاعری میں ان خصوصیات کا ہونا ناگزیر بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فکری ریاضت اور فنی مزاولت بھی شاعر کے لیے درکار ہوتی ہے، کیونکہ شاعری لفظوں میں زندگی کی حرارت اور اندرونی سوز کی آنچ لفظی پیکروں میں ڈھال دینے سے وجود میں آتی ہے اور یہ وہ اوصاف ہیں جو فکری اور فنی زرخیزی کے ساتھ تہذیب اور تمدنی روایات و اقدار اور عرفان کے بغیر ممکن نہیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ ماضی کے عرفان، حال کی معرفت اور مستقبل کے امکان سے شاعری میں حیرت انگیزی، کشش، جاذبیت، اور تاثیر در آتی ہے اور شاعری کے ان تمام اسرار و رموز سے جمیل مظہری پورے طور پر واقف نظر آتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں، خیالات کے ارتقا میں جو ربط و تسلسل ہوتا ہے وہ دراصل زندگی کے ماضی حال اور مستقبل کے ربط و تسلسل سے عبارت ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں کی معنویت میں بھی ایک مخصوص قسم کی ضابطگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزل کو روایتی لہجے اور لفظیات سے الگ رکھا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہت مشکل ہے پاس لذت درد جگر کرنا
کسی سے عشق کرنا اور وہ بھی عمر بھر کرنا
سر محفل ترا وہ پرسش زخم جگر کرنا
مری جانب بمشکل اک نظر کرنا مگر کرنا
مسلّم ہو گئی ہے بے اختیاری جذب باطن کی
محبت اس سے کرنا جس سے نفرت اس قدر کرنا
بڑھا کر ہاتھ تارے آسماں سے کون توڑے گا
جمیل اک کار ناممکن ہے تقلید قمر کرنا

جہاں تک بات جمیل مظہری کی شاعری کے فنی اوصاف کی ہے تو ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلام میں تراکیب، مغلق الفاظ اور اضافت کی کثرت سے گزرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا نظام بھی بہت ہی فطری ہے۔ الفاظ نہایت سادہ اور عام فہم ہیں۔ الفاظ کی نشست میں فنکاری ملتی ہے۔ کلام میں روانی اور سوز و گداز بہت ہے۔ یہاں تک کہ اکثر اشعار اپنی بے ساختگی اور روانی کی وجہ سے ضرب المثل بن چکے ہیں۔ سہل ممتنع کی بیشتر مثالیں ان کے کلام میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ حالانکہ سادگی کے باوجود معنی کی بلندی اور تاثیر کلام ہاتھ سے نہیں جاتی، زبان کی سلاست، کلام کی پختگی اور مضامین کی بہتات نے بجا طور پر انھیں استاد کا مرتبہ عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں مختلف شعری فنون کا خوبصورت استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی غزلوں کی فنی خصوصیات میں کئی اہم عناصر شامل ہیں:

1. موضوعات کی وسعت: ان کی غزلیں انسانی جذبات، عشق، وطن، فلسفہ اور خودی جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان کی شاعری میں روحانی اور معاشرتی پہلوؤں

جمیل مظہری کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں انسانی جذبات کی گہرائی اور سچائی ہوتی ہے، جو قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔ مظہری نے اپنی شاعری میں نئے اور منفرد موضوعات کو چھیڑا ہے، جیسے محبت، زندگی کے مسائل اور معاشرتی موضوعات۔ ان کی شاعری میں خوبصورت تصویریں اور تشبیہیں ہوتی ہیں، جو قاری کو ایک نئے تجربے میں لے جاتی ہیں۔ ان کا رومانی انداز اور محبت کی خوبصورت تعبیرات انھیں خاص مقام عطا کرتی ہیں۔

کی جھلک ملتی ہے۔

2. تشبیہات واستعارات: ان کی شاعری میں تشبیہات اور استعارے کی خوبصورتی نمایاں ہے۔ وہ قدرتی مناظر، تاریخی شخصیات اور فلسفیانہ تصورات کو استعمال کرتے ہیں۔

3. موسیقیت: ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی موسیقیت ہے، جو پڑھنے یا سننے میں دلکش لگتی ہے۔ اس کے لیے وہ مخصوص بحر اور قافیہ بندی کا خیال رکھتے ہیں۔

4. خودی کا تصور: ان کی شاعری میں اقبال کی طرح 'خودی' کا فلسفہ بھی نمایاں ہے، جو خود اعتمادی اور خود شناسی کی ترغیب دیتا ہے۔

5. زبان و بیان: ان کی زبان میں سادگی اور پیچیدگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کا اسلوب بامحاورہ اور عمیق ہوتا ہے، جس میں فلسفیانہ نکتہ چینی کی جھلک ملتی ہے۔

6. نئے تجربات: انھوں نے روایتی غزل کی حدود کو توڑ کر نئے تجربات کیے، جیسے جدید خیالات اور متنوع شکلوں کا استعمال۔

یہ فنی خصوصیات جمیل مظہری کی شاعری بالخصوص غزلوں کو منفرد بناتی ہیں اور ان کے شاعری کے عالمی معیار کو بلند کرتی ہیں۔ اشعار دیکھیں۔

کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیرگی سے مجھے
ڈرا دیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے
سفینہ شوق کا اب کے جو ڈوب کر ابھرا
نکال لے گیا دریائے بے خودی سے مجھے
ہے میری آنکھ میں اب تک وہی سفر کا غبار
ملا جو راہ میں صحرائے آگہی سے مجھے
خرد انہی سے بناتی ہے رہبری کا مزاج
یہ تجربے جو میسر ہیں گمرہی سے مجھے

شاعری میں اضطراب ایک معیاری موضوع ہے، جو شاعر کے ذہنی اور جذباتی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔

ادب کی تنقید میں اضطراب کی کیفیت کو اکثر اہمیت دی جاتی ہے، کیونکہ یہ انسانی جذبات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مددگار ہوتی ہے۔ شاعری میں اضطراب انسانی تجربات کی عکاسی کرتا ہے، اور یہ ایک ایسا عنصر ہے جو قاری کو شاعر کی داخلی دنیا میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ کچھ مشہور شعرا جیسے غالب، اقبال، اور فیض احمد فیض نے اضطراب کو اپنے کلام میں باریک بینی سے بیان کیا ہے، جو انسانی تجربات کی پیچیدگیوں کو واضح

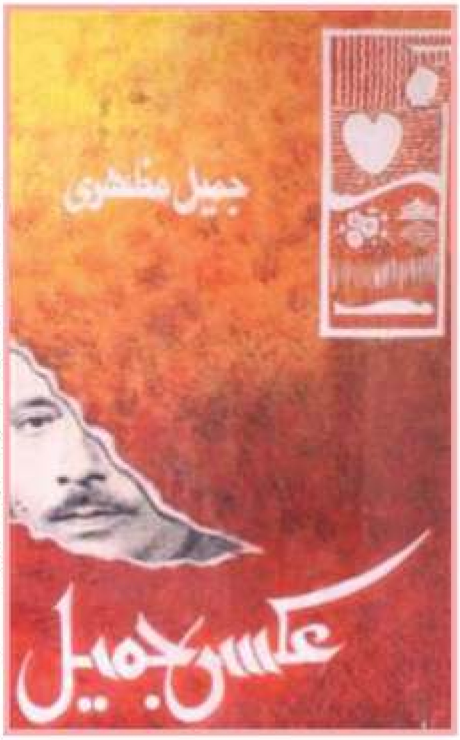

کرتا ہے۔ اسی طرح جمیل مظہری کی شاعری میں بھی اضطراب ایک مرکزی موضوع ہے جو ان کی اندرونی کشمکش اور زندگی کی تلخیوں کو نمایاں کرتا ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی کی بے یقینی، عشق کی ناکامی، اور وجود کی تلاش کے عناصر ملتے ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں کہ:

''جمیل مظہری کی نظموں میں اضطراب اور الجھن کی کیفیت نمایاں ہے۔ یہ اضطراب ان کی تشکیک کا نتیجہ ہے۔''

(ذکر جمیل، ناشر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ص45)

مظہری کی غزلوں میں اکثر ایسے لمحات پیش کیے جاتے ہیں جہاں انسان اپنے احساسات کی گہرائیوں میں غرق ہوتا ہے، اور یہ اضطراب اس کی شناخت کا حصہ بن جاتا ہے۔ اور یہ اضطراب ان کی تشکیک کا نتیجہ ہے۔ اشرفی مزید لکھتے ہیں کہ:

''جمیل مظہری کی تشکیک انھیں خون کی آنسو رلاتی ہے۔ وہ مسلسل کرب اور کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان کا ہیجان انھیں کوئی منزل عطا نہیں کرتا بلکہ بیچ راستے میں ایک کھوئے ہوئے مسافر کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ نتیجتاً تشکیک ہی کے نہیں بلکہ تضادات کے بھی پیکر بن جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنا تعارف خود اس طرح کرایا ہے۔

دو جمیل اک جمیل کے اندر
یہ تضاد اور یہ دوئی کیوں ہے
یعنی جب وہ ہے منکر ادیان
ذہن پھر اس کا مذہبی کیوں ہے

جمیل مظہری کی شاعری میں یہ اضطراب ایک ایسی قوت کے طور پر بھی نظر آتا ہے جو تخلیق کا باعث بنتا ہے، جہاں درد اور خوشی کی باریکیوں کو ایک ساتھ محسوس کیا جاتا ہے۔ اس طرح جمیل مظہری کی شاعری میں اضطراب صرف ایک احساس نہیں بلکہ فن کا ایک حصہ بھی ہے۔

جمیل مظہری کے تعلق سے یہ نظریہ بھی مشہور ہے کہ وہ تشکیک کے شاعر ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری کے متعلق قاری اپنے ذہن میں منفی رائے قائم کر لیتا ہے۔ جب کہ شاعری میں تشکیک ایک اہم موضوع ہے جو فلسفیانہ اور وجودی سوالات پر مبنی ہے۔

تشکیک شاعری میں گہرائی اور بصیرت کا ایک عنصر ہے، جو قاری کو نہ صرف متن کے بارے میں بلکہ زندگی کے بارے میں بھی غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے سفر کی مانند ہے جہاں قاری نئے خیالات اور تجربات کی تلاش میں نکلتا ہے۔ جمیل مظہری کی شاعری میں تشکیکی رویے پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیک کے موضوعات کو اپنے کلام میں بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں الجھن کا عنصر بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ سوالات، وجودی مشکلات اور انسانی تجربات کی پیچیدگیاں واضح ہوتی ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں مختلف جذبات اور خیالات کو پیش کرتے ہیں، جو پڑھنے والے کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مظہری کی شاعری میں الفاظ کا انتخاب اور تشبیہات کا استعمال اس الجھن کو مزید گہرا کرتا ہے، جس سے قاری کو ایک نئی بصیرت ملتی ہے۔ ان کے خیالات کی کثرت اور گہرائی ان کی تخلیقات کو خاص بنا دیتی ہے، جہاں کبھی زندگی کی سادگی اور کبھی اس کی پیچیدگیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

■

Aslam Rahmani
P.O.:Ramna, Mohammadpur Kazi
Musahri, Muzaffarpur - 842002 (Bihar)
Mob: 6201742128
Email: rahmaniaslam9@gmail.com

شخصیات

ہوش صاحب

عبداللہ خالد

میانہ قد، گندمی رنگت، باوقار چہرہ اور پرعزم وتابناک آنکھوں والے ہوش نعمانی صاحب کی پیدائش 22 مارچ 1933 کو رامپور کے محلہ ٹھوٹر میں ہوئی تھی۔ اُن کے والد سعادت یار خاں سلطانی ریاست رامپور میں کسی معمولی عہدے پر تھے۔ والی رامپور کی ناراضگی کے سبب ملازمت سے برطرف کردیے گئے تو گھر سے آسودگی بھی رخصت ہوگئی، تنگی کے اسی دور میں ہوش صاحب کی پیدائش ہوئی۔ شرافت یار خاں نام رکھا گیا، ہوش سنبھالا تو تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ چند درجات تک حصولِ تعلیم کے بعد حالات کی سختی مانع آئی اور اعلیٰ تعلیم کا خواب پورا نہ ہوسکا۔ البتہ علم وادب سے ایسا شغف تھا کہ مطالعے اور علمی مجلس سے بہت کچھ سیکھا۔ نوعمری سے ہی شاعری کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد رامپور کے نامور استاد شاعر جلیل نعمانی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ جوانی کی عمر میں معاش کا مسئلہ درپیش آیا تو چند ملازمتیں کیں، مختلف اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے لیکن جب مشاعروں میں خوب شرکت کرنے لگے اور مشاعروں سے معاش کا مسئلہ بھی حل ہونے لگا تو ساری غیرادبی نوکریاں چھوڑ کر مستقل ملازمتِ سخن ہی اختیار کرلی۔ رفتہ رفتہ وہ دن بھی آئے کہ ہوش صاحب مشاعروں کے مقبول اور کامیاب شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ مشاعروں سے الگ انھوں نے نہ جانے کتنی شعری وادبی انجمنیں قائم کیں، بے شمار سخن دوست افراد اور نومشق شعرا کو ادبی سرگرمیوں میں شامل رکھا....اور نہ جانے کیا کیا۔ میں 1996 میں جب ان کا شاگرد ہوا تو اُن کی مذکورہ ادبی سرگرمیاں بڑی حد تک کم ہوچکی تھیں۔ کبھی وہ دور بھی تھا کہ مسلسل مشاعروں میں شرکت کے سبب اہلِ خانہ کئی کئی دن بعد ان کا دیدار کرتے تھے اب یہ حال کہ زیادہ تر گھر میں رہتے۔ لیکن ارادوں میں مضبوطی اور قوتِ عمل میں وہی تازگی تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت مطالعے، شعرگوئی اور تلامذہ کی تربیت میں صرف ہوتا تھا اور ان مشغولیات میں کچھ وقت وہ بھی تھا جب احباب، سخن دوست اصحاب اور مقامی شعرا کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا۔ لوگوں کی مسلسل آمدورفت اور پیہم ربطِ خاص ہوش صاحب کی شخصیت کے سحر کا اثر تھا، نہ جانے کب اور کن مراحل سے گزر کر انھوں نے اپنی انا کو اتنا دبا دیا تھا کہ وہ تقریباً معدوم ہوکر رہ گئی تھی۔ دل نوازی وانکساری سے آراستہ ان کی گفتگو مخاطب کو ایسا باندھ لیا کرتی تھی کہ پھر کبھی نہیں چھوٹتا تھا۔ انکساری محض شخصیت اور سماجی مراسم کا حصہ ہی نہ تھی بلکہ ان کی شاعری میں بھی اس کا نمونہ نظر آتا ہے۔ یہ انکسار کا مظہر ہی تو ہے کہ ایک شعر تمام زندگی میں انھوں نے ایسا نہیں کہا جس سے تعلّی کا رنگ جھلکتا ہو، پھر سب کی تعریف اور حوصلہ افزائی کی خوبی بھی ان میں موجود تھی۔ تعریف اتنے بھرپور انداز میں، ایسی صداقت اور خلوص کے ساتھ کرتے تھے کہ احمق تو احمق، باشعور آدمی کا دماغ بھی گھنٹوں آسمان میں پرواز کرتا تھا۔ کوئی طنزیہ لہجہ اختیار کرے یا کسی معاملے میں اعتراض، ہوش صاحب انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتے اور اپنی شانِ دلنوازی میں کمی نہ آنے دیتے تھے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ کبھی ان کی کسی سے معاصرانہ یا منافرانہ چشمک نہیں رہی۔ صلح کل کی پالیسی، منکسر المزاجی اور شخصی وقار ہمیشہ اس قسم کے مراحل سے ان کو بچالیتا: بنیادی طور پر وہ 'چشمک دار' شاعر نہیں تھے۔

> رفتہ رفتہ وہ دن بھی آئے کہ ہوش صاحب مشاعروں کے مقبول اور کامیاب شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ مشاعروں سے الگ انھوں نے نہ جانے کتنی شعری وادبی انجمنیں قائم کیں، بے شمار سخن دوست افراد اور نومشق شعرا کو ادبی سرگرمیوں میں شامل رکھا۔

ہوش نعمانی صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ غزل سے ہی آغازِ سخن کیا تھا اور ان کی آخری کاوش بھی غزل ہی کی شکل میں یادگار ہے۔ بقول ہوش صاحب ان کا پہلا شعر یہ تھا۔

جب بھی ہم آشیاں بناتے ہیں
اک تغیر فضا میں پاتے ہیں

ابتدا میں روایتی شاعری کا زور رہا، پھر مطالعے و مشاہدے نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ زمانے کے سرد وگرم، زندگی کے تجرباتِ نو بہ نو اور

حادثات و واقعات نے بھی غزل میں جگہ پانا شروع کی۔ اُن کا ذہن اپنے آس پاس کے ماحول، سماجی صورت حال، شہر، وطن اور دنیا کے حالات کی جستجو سے لبریز تھا۔ ٹی وی اور ریڈیو پر مستقل خبریں سننا، پابندی سے اخبار کا مطالعہ کرنا، گھر، باہر، محلّہ، پڑوس ہر جگہ حالات و کیفیات اور ساکن و متحرک رجحانات پر نظر رکھنا اور ان کو اپنے اشعار کا حصہ بنانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ شاید اسی لیے رامپور کے شعرا میں شاد عارفی کے بعد سماج، حالات و واقعات اور نئے رجحانات پر مشتمل اشعار ہوش صاحب کے کلام میں سب سے زیادہ ہیں۔ روایت کے قدر دان تھے لیکن جدت کے لیے بھی ان کا دروازۂ فکر کھلا ہوا تھا۔ نہ صرف موضوعات بلکہ لسانی حوالے سے بھی کشادہ ذہن تھے اسی لیے ان کی شاعری میں ٹھیٹھ ہندی اور انگریزی کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ انھوں نے بے تکلفانہ طور پر 'تلک، چندن، آرسی، پجارن، سمے، استھان، اسنان' اور خالص انگریزی الفاظ 'گٹر، کور، بلب، سگریٹ، سوئچ' وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔

تمھارا شہر بنارس نہیں کہ بس جاؤں
تلک لگا کے یہیں پر برہمنوں کی طرح

یہ لاش اصل میں ہے قاتلوں کی لاچاری
یہاں قریب میں کوئی گٹر نہیں ہوگا

غزل کے علاوہ انھوں نے تقریباً سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، حمد و نعت و مناقب' منظومات، قطعات، مدس، مخمس، مستزاد، تضمین، رباعی، مرثیہ، قصیدہ، چہار ابیات، ہائیکو، گیت، دوہے اور تاریخ گوئی کے نمونے ان کے مجموعہ ہائے کلام میں موجود ہیں۔

ہوش صاحب انتہائی قادرالکلام شاعر تھے، مسلسل مشق نے انھیں اس مرحلے تک پہنچا دیا تھا کہ ان کے لیے شاعری عام بول چال کی طرح ہوگئی تھی۔ تقریباً روزانہ ہی انھیں کچھ نہ کچھ اپنے یا دوسروں کے لیے کہنا پڑتا تھا۔ جو یہ سب ان کی آمدنی کا ذریعہ بھی تھے، پھر تلامذہ اور استفادہ کرنے والوں کے کلام پر اصلاح و مشورہ وغیرہ۔ غرض ان کا سارا دن اسی طور سے بسر ہوتا، تلامذہ کے علاوہ اُن سے استفادہ کرنے والوں میں ایسے بھی تھے جن کے اساتذہ کو گزرے ہوئے زمانہ ہو چکا تھا، مرحوم اساتذہ کے زندہ شاگردوں میں سے کچھ ہوش صاحب کا حق محنت ادا کر کے سبک دوش ہو جاتے اور کچھ اُن سے مشورۂ سخن کا اعتراف کر کے پیسے بچا لیتے تھے۔ خفیہ استفادہ کرنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی بلکہ ان میں دو ایک تو ایسے بھی تھے کہ ہوش صاحب کی زود گوئی کے سہارے خود اپنے شاگردوں کی تعداد میں اضافہ کرتے رہتے اور ہوش صاحب کا دم اُن کے لیے ایسا غنیمت تھا کہ شرمندگی سے بچے رہتے تھے۔

ہوش صاحب کے تلامذہ کی تعداد بھی کثیر تھی، کچھ نے شاعری چھوڑ کر دنیاداری سے دل لگا لیا اور کچھ ہوش صاحب کی بے پناہ ہمت افزائی اور تعریف سے پھول کر 'اپنی استادی' کے مدعی ہوگئے۔ حسب عادت ہوش صاحب نومشقوں کی اتنی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ اکثر لوگ شکایت بھی کرتے 'آپ نومشقوں کا دماغ خراب کر رہے ہیں' مگر وہ کسی کو کوئی صفائی دیے بغیر اپنی روش پر تاعمر قائم رہے۔ کتنے ہی نوواردانِ سخن اُن کی حوصلہ افزائی کے سبب پر اعتماد ہو کر شعر کہنے لگے اور مشہور بھی ہوئے۔

ہوش صاحب کے مقامی و بیرونی تلامذہ کی صحیح تعداد لکھنا تو مشکل ہے مگر راقم الحروف کے علاوہ آزر نعمانی، طاہر کنول نعمانی، عتیق جیلانی سالک، حسن اقبال،

ہوش نعمانی کے منتخب اشعار

خیر اب تو مری آنکھیں ہیں تمھاری آنکھیں
ہاں مرے بعد نظر آئے گی دنیا تم کو

لہو بہت ہے، لہو کی کمی نہیں ہے مگر
سوال یہ ہے کہ ہندوستاں کا کیا ہوگا

صرف میں رہ جاؤں گا، دیوار و در رہ جائیں گے
سچ اگر بولا تو رشتے ٹوٹ کر رہ جائیں گے

گمنام خط کو اُن کی مہک نام دے گئی
جن انگلیوں سے بند لفافہ کیا گیا

اب مجھے لوگ سمجھنے لگے سوداگرِ غم
جو بھی ملتا ہے نئے غم کا پتہ دیتا ہے

اُس کے گھر میں کئی معصوم فرشتے ہوں گے
جو یہ کہتا ہے کہ گھر جانے کو جی چاہتا ہے

نیلام ہو رہا تھا عدالت کے سامنے
مقتول کے بدن سے اتارا ہوا لباس

اس قدر مجھ پر نہ ڈالو خوشنما خوابوں کا بوجھ
ورنہ میں بھی آج کا ہندوستاں ہو جاؤں گا

ہمارے سامنے جو طنز کی صورت میں آتا ہے
ہم ایسے جام کو ساقی کے منھ پر مار دیتے ہیں

اے ہوش! زندگی ہے مشینوں کے درمیاں
فرصت کا ایک لمحہ کسی سے نہ مانگیے

صندل سا ہاتھ ماتھے پہ، سرخم جھکی نظر
آداب یوں کروگے تو ہم مر نہ جائیں گے

چھوڑ کر ساری پریشانیاں دروازے پہ
گنگناتے ہوئے، ہنستے ہوئے گھر میں جانا

اُسے اب ان کے بچے دونوں ہاتھوں سے لٹائیں گے
جو لُوٹا ہے امانت میں خیانت کرنے والوں نے

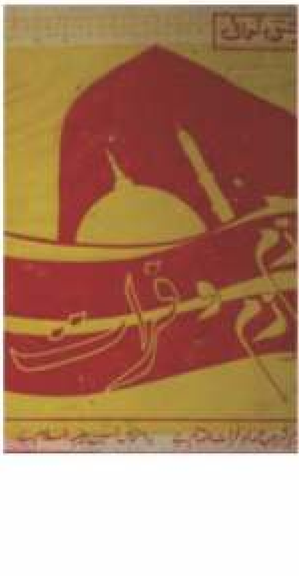

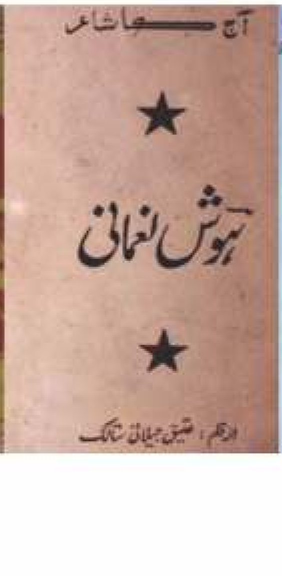

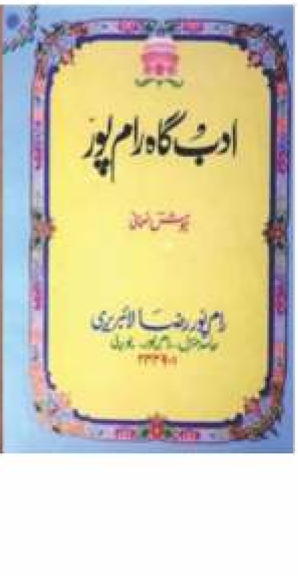

شارق نعمانی اور ہاشم نعمانی تادمِ حیات اُن کے رابطے میں رہے۔

ہوش نعمانی صاحب کی بارہ تصانیف ان کی حیات ہی میں منظرِ عام پر آگئی تھیں: 'اندر دھنش (شاعری 1968)، میرا وطن (تذکرہ، اردو نثر 1974)، گھاؤ شبدوں کے (ہندی، منظومات وغزلیات اور گیت، 197)، زمزم وفرات (1987)، کائنات (1986)، شہادت نامہ (1994)، ادب گاہِ رامپور (1997)، انجانی راہیں، 'چھیڑ خوباں سے(2004)، آئینۂ مسدس (2006)، بیاں اپنا (غزلیات، (2008)، اتمام(منظومات وغزلیات 2009)۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اتمام یعنی آخری مجموعۂ کلام کی اشاعت کے بعد انھوں نے اپنے انتقال تک محض دو ایک غزلیں اور ایک نظم ہی کہی جن کی اشاعت روزنامہ رامپور کا اعلان میں ہوگئی تھی۔ اُن کی شخصیت وفن پر تین کتابیں ''آج کا شاعر ہوش نعمانی از عتیق جیلانی سالک، 1986 اور 'شناخت (ہوش نعمانی اور ان کے چند تلامذہ کا کلام وتعارف) مرتبہ تبسم نشاط مرحوم، 1996 اور آزر نعمانی کی کتاب 'ہوش نامہ' 1999 میں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ ہوش نعمانی شخص وشاعر کے عنوان سے ایک کتاب زیرِ تکمیل ہے جس کے مصنف رضوان لطیف خاں ہیں۔

ان کی زود گوئی کا اصل رنگ میں نے اس وقت دیکھا جب وہ 'ادب گاہِ رامپور' کی تکمیل کر رہے تھے، ایک ایک نشست میں ڈیڑھ سو، دوسو اشعار کہنا عام بات تھی یہاں تک کہ وہ بولتے جاتے اور میں لکھتے لکھتے تھک جاتا تو ہاتھ روکنے کے بہانے کہتا ''ہوش صاحب! پان کھالیجیے کافی دیر سے نہیں کھایا آپ نے۔'' ہوش صاحب اچھا کہہ کر اُٹھ جاتے اور اس طرح کچھ دیر مجھے آرام کا موقع مل جاتا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کی زود گوئی نے انھیں کسی حد تک نقصان بھی پہنچایا، ظاہر ہے کہ انھیں وقت ہی میسر نہ آسکا کہ اپنے کلام پر نظرِ ثانی یا ترمیم کرسکیں جس کی وجہ سے بہت سے ایسے اشعار بھی ان کی غزلیات ومنظومات میں در آئے جو اُن کے معیارِ سخن سے کم تر تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے غزل کو کئی عمدہ اور یادگار اشعار دیے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے بالخصوص ذیل کے دو اشعار تو ادبی دنیا میں کافی مشہور ہیں۔

وہ تو بتا رہا تھا کئی روز کا سفر
زنجیر کھینچ کر جو مسافر اتر گیا

جسم تو خاک ہے اور خاک میں مل جائے گا
میں بہرحال کتابوں میں ملوں گا تم کو

اول الذکر شعر صبا افغانی رامپوری کے اچانک انتقال پر کہا تھا اور دوسرا شعر ماہنامہ الحسنات رامپور کے 'مولانا مودودی نمبر' کے ٹائٹل کے لیے فی البدیہہ کہا۔

ہوش صاحب کا بچپن کشمکش سے بھرا ہوا ضرور رہا ہوگا لیکن جوانی سے بڑھاپے تک کی عمر انھوں نے کسی قدر سکون وعافیت کے ساتھ گزاری۔ ان کی اہلیہ زیب النساء بیگم انتہائی خدمت گزار اور شوہر پرست خاتون تھیں۔ اولاد میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا بلاغت یار خاں المعروف بان نعمانی بھی ان سے بہت محبت کرنے والے تھے۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے بڑے فخر سے کہتے تھے کہ: دنیا کچھ کہے، کچھ مانے، لیکن میرے لیے یہی بہت ہے کہ خود میرے گھر میں بہ حیثیت شاعر مجھے بہت عزت حاصل ہے۔'' حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ مقامی ادبی حلقوں میں اُنھیں بہت اعتبار اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا وہ ایسے شاعر تھے جن کا کلام بے شمار عام وخاص لوگوں کو یاد تھا۔ ایک بار ایک رکشہ والا بڑی مستی کے عالم میں رکشہ چلاتے ہوئے شعر گا رہا تھا۔

چاندی کے چراغوں سے نہ جل جائے جوانی
ماٹی کے دیے چھوڑ کے گاؤں سے نہ جاؤ

میں نے کہا: ''شعر تو بہت اچھا ہے، کس کا ہے؟'' بولا: '' مجھے کیا پتہ؟ نمائش کے مشاعرے میں سنا تھا۔'' میں نے بتایا کہ ہوش نعمانی صاحب کا شعر ہے تو بولا: ''ارے وہ، جو بجوڑیوں (محلہ باجوڑی ٹولہ رامپور) میں رہتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''ہاں وہی۔'' اسی طرح مزدور طبقہ' دوکاندار' چائے کے ہوٹل والے' اور کئی پھیری والے ایسے تھے جن کو ہوش صاحب کے اشعار یا گیت یاد تھے۔

2013 کی بات ہے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے: 'اتنی لمبی زندگی یوں ہی شاعری میں برباد کردی، سب لاحاصل.....نہ کوئی جانتا ہے، نہ مانتا ہے ... ہائے افسوس۔'' یہ سن کر لمحہ بھر کو مجھے سکتہ سا ہوگیا۔ ہمت کرکے انھیں تسلی دینے کے لیے بہت کچھ کہا مگر ان کو مطمئن نہ کرسکا۔ البتہ اس روز مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہوش صاحب کو اپنی موت کا یقین ہو چلا ہے۔ واقعی اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ شکستگی سے دوچار ہوتے چلے گئے، رامپور میں کئی ڈاکٹروں کو دکھایا پھر علی گڑھ میڈیکل کالج میں زیرِ علاج رہے جہاں ڈاکٹروں نے پیٹ میں آخری اسٹیج کا کینسر ہونے کی نشاندہی کردی۔ سعادت مند اکلوتے بیٹے نے اپنا کاروبار چھوڑ کر ان کا علاج اور بہت خدمت کی، وفا شعار اہلیہ ہمہ وقت سرہانے موجود رہیں۔ احباب مسلسل ان کو دیکھنے جاتے اور تسلیاں دیتے۔ دعائیں ہوئیں، ممکنہ دوائیں کی گئیں مگر کچھ کارگر نہ ہوسکا۔ پھر وہ دن (21 اگست 2014) بھی آیا کہ بولتی ہوئی آنکھیں بے جان، چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری اور مرد سراپا سخن ہمہ تن خاموش تھا۔ واقعی اُن کی موت ہوگئی تھی۔

■

Abdullah Khalid
Ghair Kate Bazar Khan
Rampur - 244901 (UP)
Mob.:9897496925
abdullahkhalidrmp@gmail.com

شخصیات

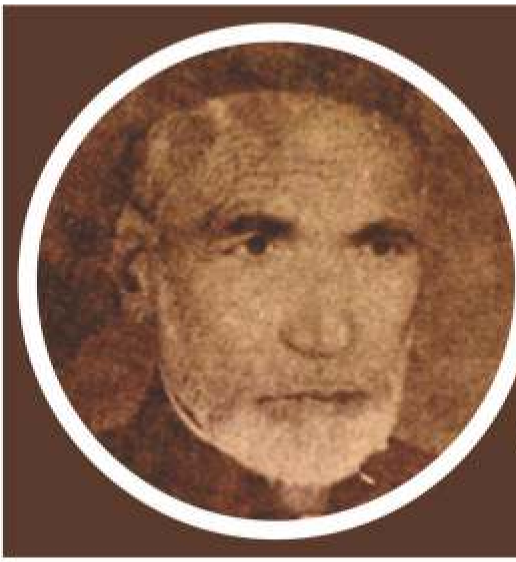

گورکھپور کا گوہر نایاب
مسلم انصاری

ذاکر حسین ذاکر

محی الدین انصاری موسوم بہ مسلم انصاری 1920-2012 کی ولادت گورکھپور کے ایک علمی خانوادے میں ہوئی تھی۔ان کے والد محمد خلیل انصاری انڈین نیوی میں کیپٹن تھے۔انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی ولادت پر شاندار جشن کا اہتمام کیا۔ان کی خوشی قابل دید تھی۔ان کی تنخواہ بہت اچھی تھی اس لیے مسلم کا بچپن نہایت آرام وآشائش میں گزرا، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جب ان کی عمر دس سال تھی ان کے والد کا اچانک انتقال ہوگیا۔عزیز واقارب کی بے گانگی اور کہیں سے کوئی امداد نہ ملنے کی وجہ سے ان کے گھر کی حالت مالی اعتبار سے خستہ ہوگئی۔ان کی والدہ نے استقامت کا ثبوت دیا اور عزم وحوصلے سے گھر کو چلایا۔ بیٹے کے تعلیمی اخراجات کی عدم ادائیگی کی صورت میں ان کی والدہ نے ان کا داخلہ مقامی انجمن اسلامیہ کے دارالیتامیٰ کے شعبے میں کرایا، جہاں سے مسلم انصاری نے فاضل ادب کی ڈگری حاصل کر کے میدان کارزار میں قدم رکھا۔انھیں عربی فارسی اور اردو پر عبور حاصل تھا۔وہ مزید پڑھنا چاہتے تھے مگر اپنے گھر آنگن سے افلاس اور تنگ دستی کے مہیب سائے کو ختم کرنے کے مقصد سے انھوں نے بہرائچ میں مدرسہ اسلامیہ مسعودیہ میں بطور فارسی ٹیچر ملازمت اختیار کر لی۔وہ بچپن سے ہی ذہین اور بے حد حساس طالب علم تھے۔انھیں علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔قیام بہرائچ کے دوران وہ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ہائی اسکول اور انٹر کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔1946 میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھیں جلد ہی ریلوے میں ملازمت مل گئی۔ ریلوے کی ملازمت سے وہ 1981 میں سبکدوش ہوئے۔صحیح معنوں میں ان کی ادبی زندگی کی شروعات ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد شروع ہوتی ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے حج کیا اور ان کے زنبیل میں جتنا شعری سرمایہ تھا انھیں شائع کرانا شروع کردیا۔اس دوران انھوں نے ہر سال ایک یا دو شعری مجموعے کی اشاعت کرائی اور دبستان گورکھپور پر بھی کام کرتے رہے۔

مسلم انصاری ایک زود گو شاعر تھے اور ہر موضوع پر شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔وہ امیر خسرو کی طرح بہت تیزی سے شعر کہنے والے شاعر تھے۔ اکثر وبیشتر دو دو اور تین تین زمینوں میں سعی فرماتے اور شام تک تین چار غزلیں مکمل کر لیتے۔ان کے خیال میں لامتناہی پروازیں پوشیدہ تھیں۔ ان کی فکر میں بلندی اور سوز و گداز تھا۔وہ نکتہ سنج، رمز شناس اور دانشورانہ مطمح نظر کے شاعر تھے اور ان کی فطرت میں بے انتہا تندی تھی۔ کائنات کی تبدیلیوں اور معاشرتی نظام پر مسلم انصاری کی گہری نظر تھی۔ان کے شعری سرمائے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کتنی باریک بینی سے سماجی بناوٹ پر نظر رکھتے تھے۔ایک تو ان کی ذہانت اور دوسری گورکھپور کی ادبی فضا نے انھیں شعروشاعری کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے سولہ سال کی عمر میں شعرگوئی شروع کردی تھی۔بعد میں شاعری ان کے خمیر میں داخل ہوگئی۔ اٹھتے بیٹھتے وہ شعری اکتسابات کی فکر میں لگے رہتے۔ ایک وقت ایسا آیا جب وہ شعر نہیں کہتے تھے بلکہ شاعری ان سے خود شعر کہلوانے کے لیے مجبور کرتی تھی۔ان کا سب سے اچھا اور قابل قدر مجموعہ 'دیروحرم' ہے، جس کی اشاعت چالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی۔دیروحرم کا عنوان انھوں نے مندرجہ ذیل شعر سے اخذ کیا ہے۔

دیروحرم میں بحث ہوئی دل کہاں رہے
آخر یہ فیصلہ ہوا بے خانماں رہے

اس وقت وہ حضرت مخمور دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کر رہے تھے۔دیروحرم کی غزلوں اور قطعات پر مومن اور میر کا براہ راست اثر دکھائی دیتا ہے۔مخمور دہلوی کی استادی کا ہی اثر تھا کہ ان کی غزلیں ایک کہنہ مشق شاعر کا پتا دیتی تھیں۔ان غزلوں میں ان کی جوانی کے تجربات کا نچوڑ دکھائی دیتا ہے۔ان دنوں ان کے افکار وخیالات میں بے انتہا تازگی وحرارت تھی۔اس کا اندازہ دیروحرم کی غزلوں سے لگایا جاسکتا ہے۔دیروحرم کی غزلوں میں بے انتہا روانی ، ترنم اور پرکیف لطافت کا احساس ہوتا ہے۔ان میں اتنی گرماہٹ اور تازگی ہے، جو ان کے بعد کے مجموعے میں عنقا ہے۔ دیروحرم میں وہ کیفیاتی تازگی ہے، جو ایک تجربے کار آدمی کی فکر میں ہونی چاہیے۔ ان دنوں غلام احمد فرقت کاکوروی سے ان کے شعری مراسم تھے۔شعری نکات پر ان سے بحث بھی ہوتی رہتی تھی۔

1981 میں حج کرنے کے بعد سفر حج کی تفصیلات کا ایک شعری گلدستہ 'گلہائے حرمین' شائع کیا۔یہ بہت اہم کتابچہ ہے، جس میں انھوں نے حج کے تمام ارکان کو قطعات میں پیش کیا ہے۔اس کے بعد اگلے پندرہ سالوں تک ہر سال ان کا ایک شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ 1986 میں 'تارنفس' منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کو انھوں نے اپنے استاد حضرت مخمور دہلوی کے نام معنون کرتے ہوئے انھیں کافی غمناک انداز میں یاد کیا ہے۔تارنفس میں ان کی مشہور نظم بھارت شامل ہے۔

یہاں کا ذرہ ذرہ مہ جبیں ہے
یہ بھارت کی مقدس سرزمیں ہے

1987 میں ان کے دو مجموعے ایک ساتھ شائع ہوئے ایک 'ضرب گل' اور دوسرا 'شہر غزل'۔ ان مجموعوں میں نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔ 1989 میں 'شعلہ تر' کی اشاعت عمل میں آئی۔ 1990 ہائیکو نظموں

کا مجموعہ 'مثلث' منظر عام پر آیا۔ 1992 میں 'حدیث درد' 1993 میں 'دیوارزنداں' شائع ہوا۔ 'ساحل ساحل' کی اشاعت 1998 میں ہوئی۔ دیوارزنداں کے دیباچے میں وہ دعوا کرتے ہیں کہ ''میرے ان شعری مجموعوں کا اگرآپ بغور مطالعہ فرمائیں تو جہاں ان کے بیشتر اشعار میں عصری تقاضوں کے نقوش اور تصورات ومحسوسات زندگی کے نشانات پائیں گے، وہیں میری سرسری کاوشات کی جھلکیاں اور بسیارگوئی کی پرچھائیاں بھی نظر آئیں گی' جو لائق تحسین بھی ہوسکتی ہیں اور قابل نفرین بھی' جس کا انحصار آپ کے مزاج اور مذاق پر ہے۔'' وہ آگے کہتے ہیں کہ ''اب تو میں عمر کی اس منزل پر پہنچ گیا ہوں جہاں سے آگے بڑھنے کے لیے ہر قدم سنبھل سنبھل کر رکھنا پڑ رہا ہے۔ کیوں کہ طبیعت میں نہ تو وہ پہلی سی جولانی ہے نہ افکار میں وہ پہلی سی روانی...''

(دیوارزنداں از مسلم انصاری فیضی آرٹ پریس گورکھپور 1993، ص 8[دیباچہ کہنے کی باتیں])

1988 میں ان کا ایک شعری مجموعہ 'عکس غالب' شائع ہوا۔ جس کے ذریعے انھوں نے اردو دنیا کے سامنے اپنی شعریات کا لوہا منوایا۔ عکس غالب مسلم صاحب کی جدت طرازی کا نتیجہ ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے غالب کے 208اشعار کی زمین پر نئے فکر وخیال کے ساتھ نئی غزل کہی ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ ان غزلوں کے خیالات غالب کے خیالات وافکار سے متصادم نہ ہوں۔ انھوں نے دعوا کیا کہ یہ مشق، غالب کی ہمسری اور برابری کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف مشق سخن ہے۔ یہ بہت انوکھی اور پرکشش پہل تھی۔ اس شعری مجموعے میں کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جو کہیں کہیں غالب کے اشعار سے زیادہ معنی خیز اور پر خیال ہیں۔ اس کتاب کو مسلم انصاری نے بہت اہتمام سے شائع کرایا تھا۔ موٹے گلیزڈ کاغذ پر ہر صفحہ رنگین، غالب کا شعر الگ رنگ میں بحروں کا کوئی الگ رنگ اور ان کی غزل مختلف رنگ میں۔ جیسے غالب کے دیوان کا پہلا شعر۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصوری کا

یہ بحر رمل کی غزل ہے۔ اس کی تقطیع ہے فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن رفاعلان

مسلم انصاری نے اسی بحر میں 6 اشعار کی ایک غزل کہہ دی ہے۔

مسلم انصاری ایک زود گوشاعر تھے اور ہر موضوع پر شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ امیر خسرو کی طرح بہت تیزی سے شعر کہنے والے شاعر تھے۔ اکثر وبیشتر دودواورتین تین زمینوں میں سعی فرماتے اورشام تک تین چار غزلیں مکمل کر لیتے۔ان کے خیال میں لامتناہی پروازیں پوشیدہ تھیں۔ ان کی فکر میں بلندی اور سوز و گداز تھا۔وہ نکتہ سنج' رمز شناس اور دانشورانہ مطمح نظر کے شاعر تھے اور ان کی فطرت میں بے انتہاتندی تھی۔

راز سربستہ نہ پوچھو دہر کی تعمیر کا
اک بہانہ تھا کسی کے حسن کی تشہیر کا
دیدہ و دل نے کہا مانا ہے کب تدبیر کا
کیجیے کس منہ سے شکوہ کاتب تقدیر کا
جھینی جھینی سی نگاہیں سمٹا سمٹا سا شباب
ہم نے دیکھا ہے وہ رخ بھی آپ کی تصویر کا
میرے جرم اولیں کو یوں تو مدت ہوگئی
ایک ہنگامہ ہے لیکن اب بھی داروگیر کا
لذت عصیاں سے جو اب تک رہے ناآشنا
وہ فرشتے جائزہ لیں گے مری تقصیر کا؟
دیکھیے کیا دن دکھاتا ہے یہ حسن التفات
پھر پیام آیا ہے مسلم اس بت بے پیر کا

ان کی شعری کائنات میں منافقت، بے راہ روی، فریب، بداخلاقی اور حالات حاضرہ جیسے عنوانات پر سیکڑوں اشعار موجود ہیں۔ ان کو الگ الگ زمرے میں شامل کیا جائے تو ان کا انتخاب بیش قیمتی ہوسکتا ہے۔ یہاں ان کی شعری کائنات پر بحث کرنا شاید مناسب نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی غزلوں کے بہترین اشعار کا ایک انتخاب قارئین کے لیے پیش کردیا جائے اور قارئین خود فیصلہ کریں کہ وہ کس پائے کے شاعر تھے۔

قفس میں تھے تو کبھی کھل کے ہنس بھی لیتے تھے
اب آشیاں میں تبسم بھی سازگار نہیں
کون قاتل ہے بتادیں گے ملاقات کے بعد
رہ گئے زندہ جو ہم اب کے فسادات کے بعد
جب اپنے شہر لوٹ کے مدت پہ آئے ہم
کتنوں سے اپنے گھر کا پتا پوچھنا پڑا

ترے بدن کا تصور بھی کچھ عجیب سا تھا
کہ دور رہتے ہوئے بھی بہت قریب سا تھا
میکدہ کا تو نام ہے بدنام
فتنے اٹھتے ہیں خانقاہوں سے
یوں ترا تیر نظر دل سے پرافشاں نکلا
میرا ہر تارنفس تاررگ جاں نکلا
دل سے اٹھتا ہے پھر دھواں سا کچھ
پھر زمانہ ہے بدگماں سا کچھ

گورکھپور کی تاریخ بہت قدیم ہے، مگر اس کی شناخت ہمیشہ سمٹی رہی۔ اسے مسلم انصاری نے نمایاں انداز میں پیش کیا۔ دبستان گورکھپور کے ذریعے ہم گورکھپور کے عروج وزوال کی تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔ دبستان گورکھپور دراصل تاریخ گورکھپور ہے، جس میں کتنے ہی بیش قیمتی ہیرے موتی اور پوشیدہ قیمتی جواہرات کو قارئین کے سامنے لاکھڑا کیا گیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اپنے اخذ واکتساب کی بنیاد پر لکھا ہے اور کسے کس طرح پیش کرنا ہے اس کا فیصلہ انھوں نے خود ہی کیا ہے۔ مواد کی عدم فراہمی کی صورت میں انھوں نے انتہائی جاں سوزی کے ساتھ اپنے خون جگر سے جس دبستان کی داستان لکھی ہے وہ انتہائی محبوب اور قابل ستائش ہے۔ انھوں نے جن شعرا کے حالات کا ذکر کیا ہے ان کے پس پشت جو کہانیاں ابھر کر سامنے آتی ہیں وہ گورکھپور کے تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی حالات کو بھی منظر عام پر لانے میں کامیاب ہیں۔ اس بات کی تائید پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے بھی کی ہے۔ ان کے خیال میں۔ ''گورکھپور کی علمی فنی اور ادبی خدمات کا ابھی تک جائزہ نہیں لیا گیا تھا، مسلم انصاری نے اس فرض سے عہدبرآ ہونے کا پروجیکٹ مرتب کیا جو دبستان گورکھپور کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے۔'' پروفیسر احمر لاری اس بات کو کچھ توسیع کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ''اردو کے دوسرے علاقوں اور مراکز کے ادبی کارناموں کے بارے میں مستند اور معتبر کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک گورکھپور کی جو انیسویں صدی کے اوائل ہی سے اردو زبان وادب کا ایک اہم مرکز رہا ہے، نہ تو کوئی قابل اعتماد ادبی تاریخ لکھی گئی ہے اور نہ ہی یہاں کے قلم کاروں کا کوئی معتبر تذکرہ شائع ہوا ہے۔ مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ مسلم انصاری صاحب نے اس کمی کو محسوس کیا، انھوں نے دبستان گورکھپور کے عنوان سے گورکھپور

کے قلم کاروں کا ایک ضخیم تذکرہ ترتیب دیا ہے۔"

(دبستان گورکھپور از مسلم انصاری فیضی آرٹ پریس گورکھپور 1997۔ [سرورق کے بعد پہلا اور دوسرا فلیپ۔])

دبستان گورکھپور نے گورکھپور کو ادبی افق پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اسے ایک نئی پہچان دی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مسلم انصاری کہتے ہیں۔ "لکھنؤ میں اردو شاعری جب اپنے شباب پر تھی برصغیر ہندو پاک کے تمام ممتاز مشاہیر شعرا و ادبا یہاں کی ادبی محافل کو اپنی شرکت سے نواز چکے تھے اور کلام بلاغت نظام سے عوام کو محظوظ و مستفیض فرما چکے تھے۔" (دبستان گورکھپور، ص 14)

انھیں گورکھپور کی ادبی اہمیت و افادیت کا خوب اندازہ تھا۔ "الغرض گورکھپور میں ادبی سرگرمیاں ہمیشہ شباب پر رہیں۔ سلاطین اودھ کے دور میں تو اس کو دبستان کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، جس کے روح رواں عبرت، عنبر، فانی، حامی، عجیب، ریاض، وسیم، فہیم، عمر، قاصر، ریحان، بدر، قمر وغیرہ جیسے ارباب فکر و فن تھے۔"

(دبستان گورکھپور، ص 14)

ڈاکٹر محمد اشرف کا خیال ہے کہ "شعر و سخن کے میدان میں درجنوں شعری گلدستے آراستہ کیے اور اس شعبے میں انھیں غیر معمولی مقبولیت بھی ملی، لیکن ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل 'دبستان گورکھپور' جیسی ضخیم کتاب شائع کر کے انھوں نے نثری ادب میں ایک الگ پہچان بھی بنائی، جس میں شہر کی علمی و ادبی شخصیتوں کے سوانحی خاکوں اور ان کی تفصیلات پر سیر حاصل بحث کر کے تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ اس سلسلے میں ان کی جتنی ستائش کی جائے ناکافی ہے۔"

(ادبی نشیمن سہ ماہی جرنل لکھنؤ۔ دسمبر 2024، فروری 2025 ڈاکٹر محمد اشرف کا مقالہ 'گورکھپور کی ادبی شخصیتیں: ماضی اور حال کے آئینے میں' ص 20)

مسلم انصاری نے دبستان گورکھپور میں گورکھپور کے 269 شعرا کا ذکر کیا ہے۔ اس میں چند نام ان ادیبوں کا بھی ہے، جنھوں نے شعر و شاعری نہیں کی مگر اپنی نثر اور شخصیت کی تابناکی سے گورکھپور کے ادبی افق کو خوب چمکایا۔ ان میں علامہ ابوالفضل احسان اللہ عباسی 1927-1865 'قاضی تلمذ حسین 1946-1880، مہدی افادی 1921-1868 اور عبدالقیوم رسا 1896-1984 کے نام شامل ہیں، انھوں نے اپنی عالمانہ نثر نگاری اور ادبی خدمات سے گورکھپور کے ادبی منظرنامے کو خوب روشن کیا۔ مسلم انصاری نے اس ضخیم تاریخ میں شعرا کے ساتھ ساتھ ان نثر نگاروں کی خدمات کا بہت اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے شعرا کا ذکر ان کے تخلص کے ردیفی ترتیب alphabatical سے کیا ہے۔ اس کے بھی دو باب متعین کیے۔ پہلے باب میں ان شعرا کا ذکر ہے، جو 1997 سے قبل وفات پا چکے تھے اور دوسرے باب میں باحیات شعرا اور ادبا کا ذکر ہے، جو گورکھپور میں یا ملک میں کہیں بھی کار ہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ گورکھپور کے حوالے سے

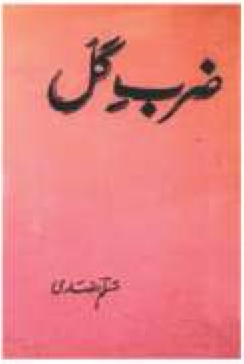

اردو شعر و ادب کی ترویج کی تاریخ بیان کرنے کے لیے انھوں نے ایک الگ باب خرچ کیا ہے، جس میں انھوں نے فورٹ ولیم کالج سے لے کر موجودہ گورکھپور کے جغرافیائی، ثقافتی اور تاریخی حصولیابیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ دبستان دلی، لکھنؤ اور گورکھپور کی تفصیل نیز اس کتاب کے لکھنے کے محرکات کے متعلق انھوں نے حرف در حرف کے باب میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت ان بے نام اور گمنام شاعروں کی بازیابی ہے، جو تاریخ کے دبیز پردے کے پیچھے کہیں روپوش ہو چکے تھے اور ان کی شخصیت پر گرد کی گہری تہہ جم چکی تھی۔ ان کی شخصیت پر جمی گہری پرت کو صاف کر کے انھیں ادبی دنیا سے روشناس کرانا ہی مسلم کا بڑا کارنامہ ہے۔ عام محقق کے لیے ایسے شاعروں پر ایک پیراگراف بھی لکھنا ممکن نہیں ہوتا ہے، ایسے میں مسلم انصاری نے ان گمشدہ شعرا کی شخصیت، شاعری اور ادبی خدمات پر بیس سے تیس صفحات تک لکھ ڈالے ہیں۔ ان پر مواد جمع کرنا ان کے پیش نظر کتنا جوکھم adventurous کارنامہ رہا ہوگا اس کا اندازہ لگانا قدرے مشکل نہیں ہے۔ یوں تو اس کتاب میں دو درجن ایسے شعرا ہیں جو زمانے کی گردشوں میں گم ہو چکے تھے۔ مگر دو نام جن کی بازیافت مسلم انصاری نے کی، وہ انتہائی اہم ہیں۔ اول منشی مادھورام مادھو اور دوئم مولوی عبدالرحیم تمنا گورکھپوری موسوم بہ عبدالرحیم دہریہ کے نام نامی شامل ہیں۔

کتاب کے تیسرے باب کو اضافی معلومات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ دبستان گورکھپور کو مسلم انصاری نے فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی دنوں سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس باب میں فورٹ ولیم کالج، اردو لغت نویسی، اردو بحیثیت سرکاری زبان، یوروپین اور اینگلو انڈین شعرا، گورکھپور کا اصلی نام، اردو کا اولین کارنامہ اردو صحافت، اردو پریس، اردو ادبی انجمنیں، اردو لائبریریاں، گورکھپور یونیورسٹی، باہمی گھریلو بول چال، اردو زبان و ادب کے معاونین، اردو مدارس اور مہانگر کے اعداد و شمار شامل کیے گئے ہیں۔ ان موضوعات پر مسلم انصاری نے مختصر مگر جامع معلومات فراہم کی ہے۔ فورٹ ولیم کالج اور اردو کے یوروپین شعرا کی تفصیل بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یوروپین شعرا کے زمرے میں تمام اینگلو انڈین شعرا کا ذکر بہت عرق ریزی سے کیا گیا ہے۔ ان کے اشعار نمونے کے طور پر دینا بہت بڑی کامیابی ہے۔ 62 یوروپین شعرا کا مختصراً ذکر ہے اور نمونہ کلام بھی دیا گیا ہے۔ اسی باب میں مسلم انصاری نے گورکھپور کی اردو صحافت پر بہت جامع معلومات فراہم کی ہے۔ اس میں انھوں نے کل 52 اخباروں اور رسائل کا ذکر کیا ہے مگر ظاہر ہے کہ ان کی شروعات ریاض خیرآبادی کے اخبار 'ریاض الاخبار' سے ہوئی اور اس سلسلے کو انھوں نے 'روزنامہ راپتی' پر ختم کیا ہے۔ راپتی کو ساجدی پریس کے مالک حامد علی انصاری نے 1995 میں جاری کیا تھا، لیکن گورکھپور کا اہم ترین اخبار مشرق تھا، جسے حکیم برہم نے 1906 میں جاری کیا تھا۔ ایک اہم اخبار اشتراک تھا جسے صحافی، شاعر اور افسانہ نگار ایم کوٹھیاوی راہی نے فراق گورکھپوری کی ایما پر 1967 میں جاری کیا تھا۔ اشتراک 8 صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ اس میں پورے ہفتے کی خبروں کا تجزیہ شامل ہوتا اور شعر و شاعری کی ترویج کے لیے خاص صفحات متعین کیے گئے تھے۔

■

Zakir Husain Zakir
Gulshan-e-Haider, Shanti Nagar
Ward No: 10
Distt.: Deoria- 274001 (UP)

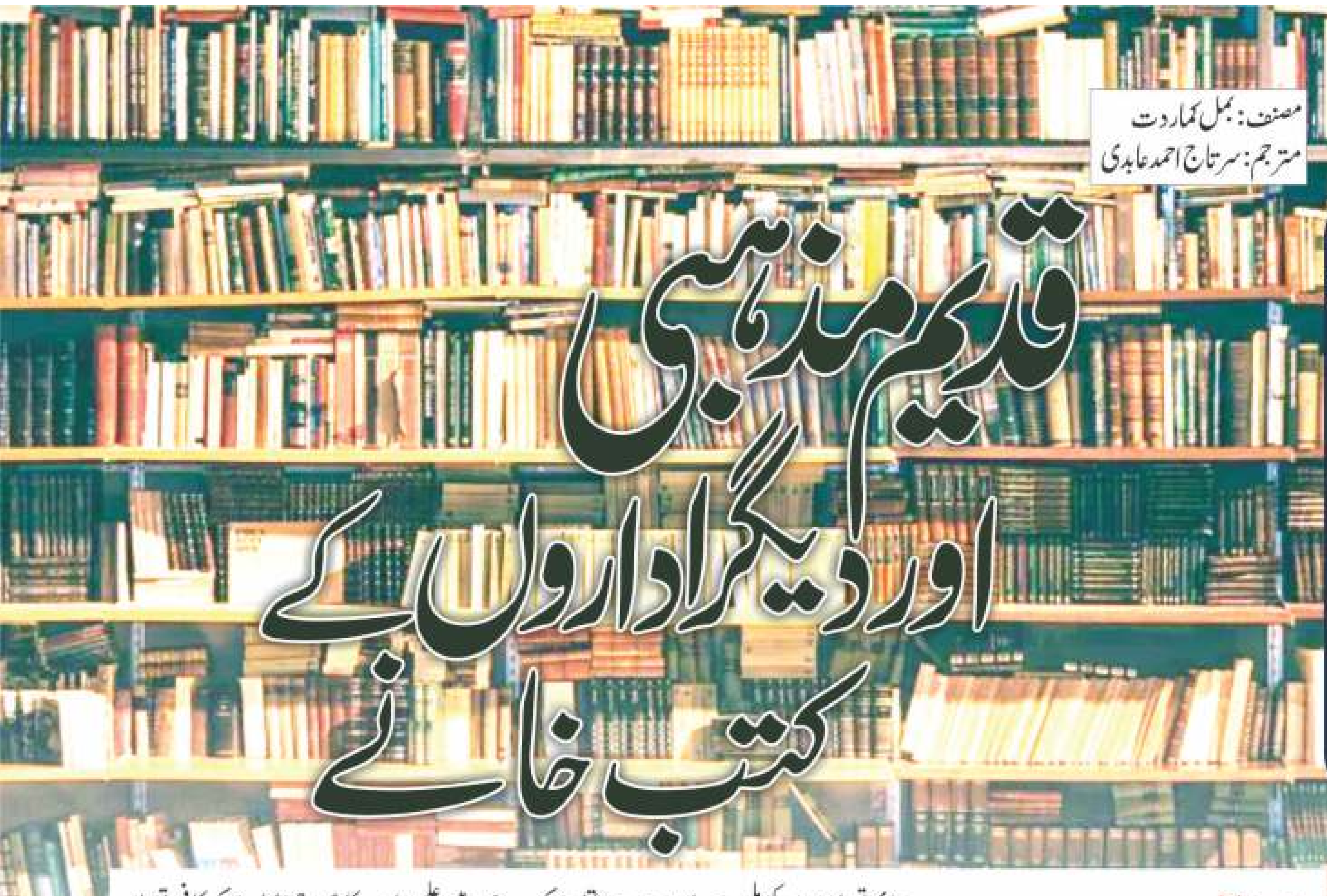

مصنف: بمل کمار دت
مترجم: سر تاج احمد عابدی

قدیم مذہبی اور دیگر اداروں کے کتب خانے

پس منظر

کتب خانوں کے ارتقا کی تاریخ، تہذیب و تمدن کے ذہنی نشو و نما کا ایک ضروری باب ہے اور لائبریری کے فروغ اور علم کی ترویج میں بہت قریبی رشتہ ہے۔ تحریر اور کتابوں کے ذریعہ تعلیم نے قدرتی طور پر کتابوں کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کو رواج دیا جس کی وجہ سے کتب خانے وجود میں آئے۔ چونکہ کتب خانوں کا ارتقا اس مفہوم میں کہ محفوظ معلومات کی دستاویزوں اور کتابوں کا وہ خزینہ ہے اور ہمیشہ وسیع پیمانہ پر ان پر علم کا انحصار رہا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس ملک کے تعلیمی نظام پر بھی زمانہ قدیم سے آخر سولہویں صدی تک جب چھاپہ خانوں کی ابتدا ہوئی نظر ڈالی جائے اور انیسویں صدی کے آغاز تک کا جب موجودہ تعلیم شروع ہوئی، مطالعہ کیا جائے۔

ہندوستان میں پہلے زبانی تعلیم کا طریقہ رائج تھا جس میں الفاظ کو رٹ کر یاد کرلیا جاتا ہے، یہ طریقہ برہمن، بدھ، جین اور اسلامی سبھی طریقہ تعلیم میں رائج تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ وادیٔ سندھ اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں کھدائی سے جس تہذیب کا پتہ چلا ہے اس میں دو دوا تیں ملی ہیں جس میں ایک موہن جوڈارو میں اور دوسری چنھو دارو میں ملی اور ایک بڑی تعداد مہروں کی ملی ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ ماقبل تاریخ میں ہندوستان میں فن تحریر سے لوگ واقف تھے۔ لیکن اس تصویری تحریر کو پڑھا نہ جاسکا جو کہ آریہ تہذیب کے عروج تک متروک ہوگئی ہوگی۔ 'وید اور ویدانگ یعنی اپنشد، برہمن اور ارنا نک' یقیناً ہند آریائی تہذیب کی قدیم ترین دستاویزیں ہیں، لیکن اب تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وید جنھیں 2000 قبل مسیح سے 600 قبل مسیح تک کا کہا جاتا ہے، اسی دور میں لکھے گئے یا نہیں اور نہ اس کی کوئی شہادت ہے کہ انھیں دائرہ تحریر میں لایا بھی گیا تھا یا نہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ انھیں کسی نہ کسی شکل میں تحریر کیا گیا ہوگا۔

کچھ کتبے ایسے ہیں جن کو اشوک اعظم سے قبل کا کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں عہد موریہ سے قبل عام طور سے فن تحریر سے واقفیت نہ تھی۔ اشوک کے کتبات کو جو ہندوستان کے بڑے حصے میں بانٹے گئے کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تحریر اس قدر ترقی یافتہ ہو ہی نہیں سکتی تھی جب تک یہ صدیوں استعمال میں نہ رہی ہو۔ بہت سے مضامین کی فہرستیں اور دستاویزوں کی فہرستیں اپنشد آشرموں اور بدھ وہاروں میں تعلیم کی طرف اشارہ کرتی ہیں یا پانی کے عہد میں علم و ادب کا عروج بتاتا ہے کہ کافی تعداد مخطوطات کی ہوگی جنھیں راہب، دانشور، مذہبی مرکزوں میں استعمال کرتے ہوں گے۔

جب ہم چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی کے دستاویزی مجموعہ کا خیال کرتے ہیں اور اشوک کے زمانہ میں انتظامی معاملات میں فن تحریر کے بکثرت استعمال کو دیکھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل نہیں رہتا کہ کتابیں اس سے زیادہ کثرت سے استعمال ہوتی تھیں جتنا آج کل یقین کیا جاتا ہے یا مذہبی مصنفین اور راہبوں کے استعمال میں آتی تھیں۔''

بیرات میں جو سنگی کندہ ہے اور جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اشوک نے ایک اجتماع میں راہبوں کو مندرجہ ذیل الفاظ میں مخاطب کیا تھا:

''میری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ راہب راہبائیں مندرجہ ذیل مذہبی کتابوں کو توجہ سے سنیں اور ان پر غور کریں۔ ونے، تھارشا، آریہ، انا گت بھیانی، منی گاتھا، مونیہ سوترم، اپاتشیہ پراسنے، اور راہول اوالواد، جو مہاتما بدھ نے غلط بیانی کے متعلق کہی تھی۔ اسی طرح مہاتما بدھ کے پیروؤں کو چاہے وہ مرد ہوں یا عورت کہ انھیں مقدس کتابوں کو دھیان سے سنیں اور ان پر غور کریں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کے وقت مہاتما بدھ کے اقوال دائرہ تحریر میں آچکے تھے اور وہ راہبوں کے روزانہ مطالعہ اور ورد میں تھے۔

پانینی کے عہد میں (چوتھی صدی عیسوی) ادبی کتابیں اور دستاویزیں وجود میں آکر رائج ہو چکی تھی، پانینی گرنتھوں کا ذکر کرتا ہے۔(iv.3.87,iv.3.116)۔ کئی قسم کے مصنفین کا تذکرہ ہے، منترکار، پدکار، سوترکار، گاتھاکار، شلوک کار، اور شبد کار (iii.23) کتابوں کو پہچاننے کے اصول جیسے کرت گرنتھ (iv.3 116) اور ادھیکرت، کرت گرنتھ، (iv.3.87) اور کتابوں کو لکھنے کا طریقہ یا تانتر یکتی (iv.3.87) وغیرہ ملتے ہیں۔ کوٹلیہ، چرک اور سسرتا کو بھی کتابیں ترتیب دینے اور لکھنے کا طریقہ معلوم تھا۔

مہابھارت کے زمانہ میں زبانی تعلیم کی سرپرستی کے باوجود مخطوطات پڑھنا رائج تھا۔ مہابھارت کے شانتی پرو میں وششٹھ نے مہاراجہ جنک سے کہا ''حضور والا (یعنی مہاراجہ جنک) آپ نے ویدوں اور دوسرے شاستروں کو مطالعہ کیا ہے لیکن آپ ان کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہے۔ آپ کے اس مطالعہ سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ جو صرف گرنتھوں کو پڑھتے، لیکن ان کے باطنی معنی اور اہمیت کو نہیں سمجھتے، ان کا مطالعہ بے سود ہے۔ وہ صرف کتابوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، لیکن ان لوگوں کا پڑھنا مفید ہے جو اس کے پوشیدہ مطالب سے آگاہ ہیں اور گرنتھوں کی مدد سے متعلقہ سوالوں کے جوابات دے سکتے ہیں۔

ہندوستان میں بدھ زمانہ میں تحریر استعمال میں لائی جاتی تھی اور مخطوطات کو کافی پڑھا جاتا تھا۔ تحریر اور سامان تحریر سے متعلق کافی حوالے ملتے ہیں اور ان دو الفاظ یعنی 'پتم وچیتی' کو جٹاکا کے مطالعہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ٹنڈیلا جٹاکا میں فیصلوں کی ایک کتاب لکھنے کا حوالہ ہے جس میں کہا گیا ہے ''اس کتاب کی روشنی میں تمھیں مقدمات فیصل کرنا چاہیے۔'' (iii:292) سیتا کیتو جٹاکا سے ہمیں ایک ٹھوس حوالہ ملتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخطوطات تھے اور استعمال بھی ہوتے تھے۔ اتفاق سے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مخطوطہ کو کس طرح لپیٹ کر رنگین کپڑے میں اور پالش شدہ اسٹینڈ پر کیسے رکھا جائے۔ (iii.235)۔

آثار قدیمہ اور ادبی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان یعنی چوتھی صدی قبل مسیح سے مخطوطات تحریر کیے جاتے تھے اور مطالعہ کیے جاتے تھے اور یہ مفروضہ بالکل قدرتی ہے کہ اہم علمی مراکز میں اور شخصی تحویل میں مخطوطات کے ذخیرے رہے ہوں گے، ان اہم مراکز میں جو شاہی عطیات سے بھی بہرہ ور تھے ہندوستان کے مختلف حصوں اور بیرونی ملکوں سے طالب علم فاضل استادوں سے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ جٹاکا میں ایسے دو اہم مرکزوں یعنی ٹکسلا اور بنارس کا حوالہ ملتا ہے۔ جہاں لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے آتے تھے اور یہ بھی یقینی ہے کہ ان مرکزوں کے مخطوطوں اور اصل کتابوں اور تفسیروں کے الگ الگ ذخیرے ہوں گے۔ اب تک آثار قدیمہ نیز بدھ اور برہمن کتابوں سے تحریر کا اور نئی کتابیں لکھنے کا جائزہ لیا گیا

آثار قدیمہ اور ادبی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان یعنی چوتھی صدی قبل مسیح سے مخطوطات تحریر کیے جاتے تھے اور مطالعہ کیے جاتے تھے اور یہ مفروضہ بالکل قدرتی ہے کہ اہم علمی مراکز میں اور شخصی تحویل میں مخطوطات کے ذخیرے رہے ہوں گے۔

ہے۔ اب ہندوستان میں زمانہ قدیم میں کتب خانوں کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ہمیں چینی سیاحوں کی تصانیف کو دیکھنا ہے وہ سیاح جنھوں نے بدھ مذہبی اداروں میں تعلیم حاصل کی اور مخطوطات نقل کیے۔ فاہیان، ہیوان سانگ اور انگ کی چونکہ ذاتی اور چشم دید شہادت ہیں اس لیے زیادہ مصدقہ مانی جائیں گی اور دوسری شہادتوں کی توثیق میں مددگار بھی ہوں گی۔

پانچویں صدی عیسوی کے کتب خانے (فاہیان کا بیان)

قدیم ہندوستان کے کتب خانوں کے بارے میں مشہور چینی سیاح فاہیان کا سفری روزنامچہ ایک عام دسترخوان کی حیثیت رکھتا ہے، وہ 399 میں ہندوستان آیا اور اس نے 414 تک قیام کیا۔ اس کی آمد کا مدعا یہ تھا کہ وہ مقدس مقامات کی زیارت کرے اور بدھ مقدس کتابیں جمع کرے تاکہ چینی عبادت خانوں میں بدھ طریقہ عبادت جاری ہو سکے۔

بہ حیثیت بدھ دیندار کے فاہیان نے شمالی ہند کے اہم بدھ مقدس مقامات کی زیارت کی۔ اس طرح اس کا سفری روزنامچہ بدھ عہد کے ہندوستان کی مختصر مگر صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ فاہیان خشکی کے راستہ کھوتان اور کاشغر ہوتا ہوا ہندوستان آیا۔ مندرجہ ذیل سطور کے ذریعہ اس نے بتایا کہ اس دور میں بدھ لوگ ہندوستان میں مخطوطات کا مطالعہ کرتے تھے:

''اس نقطہ سے مغرب کی طرف سفر کرو تو لوگ یکساں اور مشابہ ہیں۔ صرف تاتاری زبان جو وہ بولتے ہیں جداگانہ ہے۔ اس کے علاوہ جنھوں نے اپنی خاندانی زندگی ترک کردی ہے (یعنی پجاری اور راہب) وہ ہندوستانی کتابیں پڑھتے ہیں اور ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔''

شمال مغربی ہندوستان یعنی پنجاب اور متھرا سے ہوتا ہوا فاہیان وسطی علاقہ میں داخل ہوا۔ اپنے روزنامچہ میں اس نے وسط ہند کی سماجی مذہبی روایات کو بیان کیا ہے اور خاص طور سے مذہبی عبادت گاہوں کی دیکھ بھال اور مخطوطوں کے استعمال کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''جب مہاتما بدھ دنیا سے سدھارے تو بادشاہوں اور بزرگوں نے درگاہیں قائم کیں تاکہ راہبوں اور پجاریوں کو نذریں دی جاسکیں۔ انھیں زمین، مکان اور باغ دیے، آدمی اور بیل دیے تاکہ زراعت کرسکیں اور ان عطیات کی توثیق کے لیے ضبط تحریر میں لے آئے اور ایک کے بعد دوسرے بادشاہوں نے اس روایت کو برقرار رکھا۔''

اس کے علاوہ راہبوں کی زندگی کی دلچسپ تفصیلات ہمیں ذیل کی عبارت سے ملتی ہیں۔ ان مقامات پر جہاں پجاری رہتے ہیں۔ سری پتر کے اعزاز میں پگوڈا بنائے جاتے ہیں اور ملگن و آنند (یعنی آنے والے بدھ) اور ابھیدھرم کے لیے۔ ونے اور سوتر (بدھ مقدس اصول) کے لیے بھی پگوڈا بنائے جاتے ہیں۔ بدھ مقدس کتابوں کی بڑی عزت ہوتی تھی اور عبادت گاہوں میں

مذہبی استادوں اور کتاب کی یادگار کے طور پر استوپ بنائے جاتے تھے۔ استاد اور طالب علم جو ابھیدھرم، ونے اور سوتر وغیرہ کی تدریس سے متعلق تھے ان استوپوں پر نذریں گزارتے۔

اس کے باوجود زبانی تعلیم کی روایت شمالی ہند میں برقرار تھی، اسی لیے فاہیان جب ان مقامات پر گیا تو وہاں کیا مضامین پڑھائے جاتے تھے انھیں تحریری شکل میں حاصل نہ کرسکا۔''

''فاہیان بنارس سے پاٹلی پتر پہنچا جہاں وہ تین سال ٹھہرا اور سنسکرت (پالی) لکھنا اور بولنا سیکھا اور مختلف مضامین کے جو مخطوطات تھے ان کو نقل کیا۔''

'ونے' کا جو نسخہ یہاں دستیاب ہوا وہ تفصیلی اور مکمل تھا۔ پاٹلی پتر کی عبادت گاہ کی لائبریری سے اس نے 'ابھیدھرم' (فلسفیانہ اصولوں کا حصہ) کے اقتباسات لیے جو چھ ہزار پیراگراف پر مشتمل تھے۔

ایک مکمل نقل 'ین' (؟) کی۔ 'سوتر' کے دو ہزار پانچ سو پیراگراف اور 'دیپلیا پری نروان' کے پانچ ہزار پیراگراف نقل کیے۔

واپسی کے وقت وہ تملوک میں دو سال ٹھہرا جو ہگلی کے دہانہ پر ایک بندرگاہ ہے وہاں اس نے چوبیس عبادت گاہوں کا دورہ کیا، جن میں پجاری رہتے تھے اور 'سوتر' کی نقل کی اور بدھ بتوں کے قلمی خاکے تیار کیے۔

فاہیان کی تحریروں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں فن تحریر اور نقل نویسی سے واقفیت تھی۔ اہم مہایان عبادت گاہوں کے اپنے کتب خانے تھے۔ فاہیان پاٹلی پتر اور تملوک عبادت گاہوں کے کتب خانوں میں گیا اور اس نے چین کی بدھ خانقاہوں کے لیے مذہبی کتابیں جمع کیں۔

ساتویں صدی عیسوی کے کتب خانے

(ہیوان سانگ کا بیان)

فاہیان کے بعد دوسرا اہم چینی سیاح ہیوان سانگ تھا جو 629 سے 643 تک ہندوستان میں رہا یعنی اس کا قیام سولہ سال رہا، اس کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ مشہور زمانہ بدھ زیارت گاہوں کو دیکھے اور مہاتما بدھ نے جو دوسروں کی دست گیری کی اس کے شواہد جمع کرے.. مقدس کتابیں جمع کرے اور ہندوستان میں ان علوم کے جو پنڈت ہیں ان سے اصول دین سیکھے اور ان کے معنی و مطالب سمجھے۔

اس کا بیان بہت دلچسپ ہے اور اس زمانہ کی سماجی اور مذہبی حالت کو بیان کرتا ہے۔ وہ شمالی ہند میں 629ء، 645 تک مذہبی اداروں کے کتب خانوں کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ اس کے بیان میں پہلے ہندوستان کی عام حالت کا ذکر ہے۔ تحریر اور ہندوؤں کے سرکاری ریکارڈ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

''ان کا طرز تحریر برہما نے ایجاد کیا اور شروع میں 47 حرف بنائے۔ جیسے جیسے چیزیں سامنے آتی رہیں ان حرفوں کو ملا کر بڑے الفاظ بنائے گئے اور وہ پانی کے چشموں کی طرح پھیلتے چلے گئے اور ان میں جگہ اور مقام کے بدلنے سے تھوڑی تھوڑی تبدیلی آتی گئی۔

اس بیان سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ سنسکرت طرز تحریر استعمال ہوتا تھا اور لوگ کاغذات محفوظ رکھنے کے عادی تھے۔ ذیل کی سطور سے معلوم ہوگا کہ سرکاری ریکارڈ اور کاغذات کی دیکھ بھال ہوتی تھی بلکہ ان کو باقاعدہ محفوظ رکھا جاتا تھا۔ یہ بیان اس طرح ہے:

''قدیم مخطوطات اور ریکارڈوں کے لیے الگ الگ محافظین ہیں۔ سرکاری اور ملکی کاغذات کو مجموعی طور پر 'نیلو۔ پی۔ تو' کہا جاتا ہے۔ ان کاغذات میں بدنام اور نیک نام لوگوں کا ریکارڈ رہتا ہے اور عوام پر اثر انداز ہونے والی تباہیوں بربادیوں اور خوش آئند حالات کی تفصیل ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اس کے بیان میں ہمیں برہمن نظام تعلیم کی جھلک ملتی ہے یعنی ویدوں کو بدھ لوگ جنھوں نے برہمن ازم کو قبول کرلیا، کس طرح بذریعہ تحریر دستاویزوں کی شکل میں لائے۔

چینی سیاح سفر کرتا ہوا گندھار پہنچا جہاں اس نے ایک ہزار بدھ عبادت گاہوں کو خستہ حالت میں دیکھا۔ پروساپورا یا پشاور کا دہار جسے کنشک نے بنوایا تھا علوم کا مرکز تھا۔ جب سے یہ دہار تعمیر ہوا اس نے غیر معمولی قابل ہستیاں پیدا کی تھیں جنھوں نے ارہات اور شاستروں کو جنم دیا۔ اس وقت بھی ان کا اثر غالب تھا۔ اسی عبادت گاہ میں ابھیدھرم، کوش شاستر اور وبھاشالن جیسی کتابیں دسوبندھوا اور منورتھ نے تحریر کیں۔ یہ لوگ اسی عبادت گاہ میں تھے اور انھوں نے مشہور کتابیں تحریر کیں۔

اودیان، بولر اور ٹکسلا کو دیکھتا ہوا ہیوان سانگ کشمیر پہنچا۔ اس کی سوانح سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس نے ایک رات جیند ر عبادت خانہ میں بسر کی، دوسرے روز وہ شاہی دعوت نامہ پر محل میں داخل ہوا اور وہاں دو سال رہا۔ بادشاہ کشمیر نے بیسوں قابل بھدنتوں کو اس کی مدد کے لیے مقرر کیا اور اس کو دعوت دی کہ وہ مذہبی کتابوں کو پڑھے اور تفسیر بیان کرے اور بیس خوش نویس دیئے کہ وہ مخطوطات کی نقل کریں اور پانچ خدمت گار دیئے۔ ان سطور سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر کے دربار میں شاندار شاہی لائبریری تھی۔ مخطوطات کو عام طور سے پڑھا جاتا تھا اور ان کے نقل کرنے کا بھی سامان تھا۔

کنشک کی علم دوستی اور مطالعہ کے حوالہ سے وہ کہتا ہے ''یہ گندھار کا بادشاہ بڑا طاقتور تھا اس کا اثر عالمگیر تھا، اپنے فرصت کے اوقات میں وہ بدھ مقدس کتابیں پڑھتا تھا اور شاہی محل میں ہمیشہ ایک راہب رہتا تھا جو اسے مذہبی مشورہ اور ہدایت دیتا تھا۔''

بادشاہ کنشک بدھ مقدس کتابوں کی متضاد تفسیروں سے بہت پریشان ہوا اور صحیح تفسیر کے لیے اس نے حکم دیا کہ تمام ترپٹر کا کتب جمع کرلی جائیں اور تمام بدھ علماء کو مشاورت کے لیے طلب کیا۔ اس مجلس مشاورت

نے ایک لاکھ پیراگراف اپدیش شاستر کے مرتب کیے جو سوتر کو مفصل بیان کرتے ہیں۔ ایک لاکھ پیراگراف ونے وبھاشا شاستر کے تحریر کیے جو ونے کی تفصیل دیتے ہیں اور ایک لاکھ پیراگراف ابھیدھرو بھاشا شاستر کے ترتیب دیئے جو ابھیدھرم کی تشریح کرتے ہیں۔ ترپٹکا کی اس تفسیر کے لیے قدیم ترین نسخوں کا عمیق مطالعہ کیا گیا اور اس کے مفہوم اور زبان کو صاف اور واضح بتایا گیا اور اس کو پیروان مذہب اور شاگردوں کے لیے دور دور تک پہنچایا گیا۔ بادشاہ کنشک نے ان کتابوں کو تانبہ کی تختیوں پر کندہ کروایا اور انھیں پتھر کے صندوقوں میں بند کر کے ایک گنبد میں رکھوایا جو اسی مقصد کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔

اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گندھار کے علاقہ میں اہم عبادت گاہیں تھیں۔ یہ وہ مراکز تھے جہاں بدھ علما درس دیتے، نئی کتابیں تحریر کرتے اور اپنی اپنی لائبریریاں رکھتے تھے، اس کے علاوہ درباری وزراء اور امراء بھی اپنی ذاتی لائبریریاں رکھتے تھے۔ ہیوان سانگ شاہ کشمیر کی شاہی لائبریری میں دو سال رہا اور بادشاہ نے بڑی عنایت سے بیس خطاط مخطوطات کو نقل کرنے کے لیے مقرر کے مخطوطات کو پڑھنا اس دور میں عام تھا اور بادشاہ اور رؤسا بھی کسی عالم کی مدد سے ان کو پڑھا کرتے تھے۔ بادشاہ کنشک کا ترپٹکا کے نسخوں کو جمع کرنا اور ایک جامع تفسیر کو وجود میں لانا مندرجہ بالا حقائق کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔

مخطوطات تحریر کرنا ان کو جمع کرنا اور ان کو بطور تحفہ دینا ایک دستور بن چکا تھا اور اس سے قبل کے قصوں میں ارہاٹ کا ذکر آتا ہے جب کہ ایک ہاتھی پر مقدس کتابیں لاد کر انھیں مشرقی ہندوستان سے باہر بھیجا گیا۔

سیاح اپنے بیان میں آگے جیتوانہ عبادت گاہ کی تاریخ بیان کرتا ہے جو اس وقت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ واٹرس نے مندرجہ ذیل تفصیل اس کے بارے میں چینی نسخہ سے تلاش کی۔

''جیتوانہ عبادت گاہ جو غالباً نہ زیادہ بڑی تھی نہ اتنی اہم اس کی اچھی طرح دیکھ بھال بھی نہیں کی گئی اور مہاتما بدھ کی حیات ہی میں آگ لگنے سے تباہ ہوگئی۔ سودتا کی موت کے بعد یہ مقام بے توجہی کا شکار ہوا کیونکہ عمارت اور متعلقہ میدان کی نگرانی کے لیے کوئی نہ تھا۔ اس کے بعد ایک نیا وہار تعمیر کیا گیا جو اس سے وسیع

عبادت گاہوں کی لائبریریوں میں مطالعہ کے لیے کمرے تھے اور ان کے مخطوطات کے ذخیروں میں نہ صرف مذہبی بلکہ دیگر علوم وفنون اور سائنس کے مخطوطات موجود تھے۔ ان عبادت گاہوں کا یہ وسیع المشرب رویہ قدیم ہندوستان کے کتب خانوں کے مقاصد کو پورا کرتا ہے جن میں سے جیتوانہ لائبریری ایک تھی۔

تھا لیکن وہ بھی آتش زدگی کا شکار ہوا اور ایک جگہ ہم پڑھتے ہیں کہ یہ جگہ بدھ پجاریوں نے بالکل چھوڑ دی اور بادشاہ کے اصطبل کے طور پر استعمال ہوئی لیکن بعد میں اس عمارت میں بدھ راہب دوبارہ آئے اور اس کو از سر نو تعمیر کیا۔ اس عبادت گاہ کے عروج کے ایام میں جیتوانہ بہت بڑا عالیشان ادارہ رہا ہوگا۔ تبلیغ کے لیے کمرے، مراقبہ کے لیے ہال، کھانے کے کمرے، راہبوں کے لیے کمرے، غسل خانے، اسپتال، کتب خانے، مطالعہ کے کمرے معہ خوشگوار سایہ دار حوض اور چہار دیواری سب کچھ وہاں موجود تھا۔ لائبریری میں نہ صرف بدھ مقدس کتابیں تھیں بلکہ ویدک، غیر بدھ کتب اور فنون و سائنس پر جو ہندوستان میں پڑھائے جاتے تھے، دوسری کتابیں بھی موجود تھیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہوں کی لائبریریوں میں مطالعہ کے لیے کمرے تھے اور ان کے مخطوطات کے ذخیروں میں نہ صرف مذہبی بلکہ دیگر علوم وفنون اور سائنس کے مخطوطات موجود تھے۔ ان عبادت گاہوں کا یہ وسیع المشرب رویہ قدیم ہندوستان کے کتب خانوں کے مقاصد کو پورا کرتا ہے جن میں سے جیتوانہ لائبریری ایک تھی۔

سیاح نے اس کے بعد ویشالی علاقہ میں سویتاپور عبادت گاہ کو دیکھا۔ 'یہاں کی عبادت گاہ دو منزلہ عمارت تھی جس میں چمکدار رنگین بڑے کمرے تھے۔ یہاں اس کو مہایان کتاب بدھ ستوپٹکا کا ایک نسخہ ملا۔''

چینی سیاح دورانِ سفر میں جنوبی کوشل (ودھرب یابرار) گیا وہاں اس نے سو عبادت گاہیں بدھ مذہب کی پائیں۔ اُن میں سے ایک فاہیان کبوتر عبادت خانہ تھا جس میں حجرے اور بڑے حال تھے... سب سے بالائی منزل کے ہال میں ناگر جن نے ساکیہ منی بدھ کی مقدس کتابیں اور پوساس کی تصانیف رکھیں۔''

سولہ سال قیام کے بعد ہیوان سانگ اپنے وطن واپس آیا اور اپنے ساتھ اور چیزوں کے علاوہ ایک بڑی تعداد مخطوطات کی بھی لایا جس میں 657 الگ الگ کتابیں تھیں اور وہ 520 صندوقوں میں تھیں۔ یہ کتابیں حسب ذیل ہیں:

ستھاویراوادسوتر، شاستر اور ونے	14 کتابیں
مہاسنگھ کا	15 کتابیں
مہی سکا	22 کتابیں
سامتیہ	15 کتابیں
کسیاپیا	17 کتابیں
سروستی واد	67 کتابیں
مہایان سوتر	224 کتابیں
مہایان شاستر	192 کتابیں
دھرم گپت	42 کتابیں
ہیوودیا	36 کتابیں
شبدودیا	23 کتابیں

واپس جانے کے بعد بھی ہیوان سانگ نے نالندہ یونیورسٹی کے عہدہ داروں سے تعلقات باقی رکھے اور خط و کتابت جاری رہی۔ چینی سیاح کے مخطوطات کا ایک بنڈل اس وقت ضائع ہوگیا جب دریائے سندھ میں اس کا جہاز تباہ ہوا۔ ہیوان سانگ کے ایک خط میں جو اس نے ستھاویرا پر جنا دیو کو لکھا تھا گم شدہ مخطوطوں کی ایک فہرست تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کو نقل کر کے اس کے بھیجے۔

بدھ سیاح نہ صرف چین بلکہ جاپان اور کوریا سے بھی ہندوستان آئے تا کہ بدھ مقدس کتابوں کو جمع کرسکیں اور نقل کرسکیں۔ 629ء سے 671 تک تقریباً 57 سیاح چین جاپان اور کوریا سے ہندوستان آئے اور

ان سب کا مقصد یہی تھا کہ مذہبی کتابیں جمع کریں اور نقل کریں۔

ہیوان سانگ کے فوراً بعد کوریا کا ایک سیاح جس کا نام آریہ ورمن تھا ہندوستان آیا۔ وہ ونے اور ابھیدھر کتابوں کا عالم تھا، اس نے نالندہ میں بہت سے سوتر نقل کیے اور اسی دور میں دو اور کوریائی سیاح جن کے نام 'ہووئی نچ اور تاؤ ہی' تھے نالندہ آئے۔ اول الذکر نے وہاں تعلیم حاصل کی اور بہت سی سنسکرت کتابیں تصنیف کیں۔ اٹسنگ کا قیام جب نالندہ میں تھا ایک روز اسے ہووئی نچ کا کتب خانہ دریافت ہوا جس میں بہت سی چینی زبان اور سنسکرت کی کتابیں تھیں۔ تاؤ ہی بھی کئی سال نالندہ میں رہا جہاں اس نے عظیم سواری پر کتابیں پڑھیں اور سوتر کے چار سو باب تحریر (یا نقل) کیے۔

655ء میں شہنشاہ تا آنگ کے دور حکومت میں وسطی ہند کا ایک سرامن ناوی ملک چین پہنچا جس کے پاس پندرہ سو سے زیادہ مہایان اور مہایان مقدس کتابوں کے نسخے تھے۔

ساتویں صدی کے کتب خانوں سے متعلق اٹسنگ کا بیان

اپنے عظیم پیش رووں کی شخصیتوں سے متاثر ہو کر ایک اور اہم چینی سیاح جو ہندوستان آیا اس کا نام اٹسنگ تھا اس کا مقصد تھا کہ مقدس ونے اصولوں کے مصدقہ نسخے حاصل کرے اور بدھ مخطوطات جمع کرے۔ وہ ہندوستان سمندری راستہ سے 627 میں پہنچا اور یہاں تیرہ سال ٹھہرا۔

اٹسنگ کا سفری روزنامچہ ہمیں عبادت گاہوں کے کتب خانوں کی تفصیلات پر اہم معلومات فراہم کرتا ہے اور ان سابق معلومات میں جو فاہیان اور ہیوان سانگ نے چھوڑیں اضافہ کرتا ہے۔ چونکہ وہ سمندری راستہ سے ہندوستان آیا اس لیے وہ تمرالپتا کے بندرگاہ پر پہنچا اور اس نے وہاں چار ماہ قیام کیا وہاں اس نے راہبوں کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا اس کے زمانہ میں ایک بھکشو جن کا نام ارہلامتر (راہل متر) تھا عبادت گاہ میں رہتے اور روز رتنا کٹا سوتر کا ورد کرتے تھے جس میں سات سو شعر تھے۔ بھکشو نہ صرف تین مجموعوں کے ماہر تھے بلکہ غیر بدھ کتابوں پر بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ علمی درس کے درجات اور استاد و شاگرد کے تعلقات کے بارے میں ہمیں اٹسنگ بتاتا ہے کہ طالب علم ونے پٹکا پڑھنے کے بعد سوتر اور شاستروں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس سے کہا جاسکتا ہے کہ اٹسنگ کے زمانہ میں عبادت گاہوں میں مطالعہ کا رواج تھا اور مختلف علوم کے لیے ابتدائی اور بلند پایہ کتابیں موجود تھیں۔

سنگھ کی جائداد اور اس کے استعمال کے بارے میں وہ ذیل کا بیان دیتا ہے:

تقریباً 969ء میں ایک ہندوستانی بدھ پجاری چین سے کچھ سنسکرت کتابیں ہندوستان لایا اور پھر سفیر وہاں سے کتب لاتے رہے۔ 960ء میں ہندوستانی پجاریوں کا ایک گروہ بحری جہاز کے ذریعہ چے گان تک گیا اور بادشاہ کے لیے پیتل اور تانبہ کی گھنٹیاں، بدھ کی مورتی اور کچھ ہندوستانی کتابیں جو 'پی۔لو' درخت کی پتیوں (کھجور) پر لکھی تھیں لے گئے۔ دوسرا گروہ مغربی بن ٹو سے چین 1025-1041 آیا اور فان کتابیں اور تحفے لایا۔

طبی اشیا کو مقدس اسٹور میں رکھا جانا چاہیے اور وقت ضرورت مریضوں کو مہیا کرنا چاہیے۔ قیمتی پتھر اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک وہ جو پجاریوں کے استعمال کی ہیں یعنی سنگھ کا۔ اوّل الذکر کو مقدس مخطوطوں کی نقل کے لیے یا شیر کے مقام کی آرائش کے لیے خرچ کیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ موجود راہبوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ لکڑی کی کرسیاں عام استعمال کے لیے ہیں لیکن مقدس کتابیں اور ان کی تفسیر کو تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ وہ لائبریری میں رکھنے کے لیے ہیں تاکہ سنگھ کے افراد کے مطالعہ میں آسکیں۔ غیر بدھ کتابیں بکنے کے لیے ہیں اور اس سے جو روپیہ حاصل ہو وہ پجاریوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔''

اوپر کے بیان سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ راہبوں کے ذاتی کتب خانے تھے اور عبادت گاہوں کے بھی کتب خانے تھے جو عمومی استعمال کے تھے۔ اٹسنگ کے بعد بہت سے چینی سیاح ہندوستان آئے ان میں سے ایک ٹاؤلن تھا جو کنگ چاؤ (چے) کا باشندہ تھا اس نے تمرالپتا میں تین سال سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور چند سال نالندہ میں قیام کیا تاکہ کوشش کا مطالعہ کرے۔

ٹانگ کوانگ دوسرا سیاح تھا جو سمندر کے راستہ سے اراکان پہنچا۔ اسے بادشاہ کی سرپرستی حاصل ہوئی، اس نے ایک بدھ مندر بنوایا، کتابیں لکھوائیں اور مہاتما بدھ کے بت بنوائے۔ اس کے بعد ہیوان ٹاتمرالپتا پہنچا، وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے نالندہ آیا اور وطن واپس جاتے ہوئے اپنی تمام کتابیں اور ترجمے جن کی تعداد ایک ہزار تھی اپنے ہمراہ لے گیا۔

751ء میں یوکانگ (دھرم دوت) ایک چینی سیاح مشرقی ایشیا ہوتا ہوا کشمیر پہنچا، وہ نالندہ میں دس سال ٹھہرا۔ 790 میں وہ چین واپس گیا اور اپنے ساتھ دس بھومی اور دس بالا سوتر اور دوسری کتابوں کے سنسکرت نسخے لے گیا۔

964ء اور 976ء کے درمیان چین کے شہنشاہ نے 'کی۔نے' کی قیادت میں تین سو راہبوں کا ایک وفد ہندوستان بھیجا تاکہ بدھ تبرکات، نشانیاں اور کھجور کی پتیوں پر جو مخطوطات ہیں ان کو تلاش کرے اور حاصل کرے۔

تقریباً 969ء میں ایک ہندوستانی بدھ پجاری چین سے کچھ سنسکرت کتابیں ہندوستان لایا اور پھر سفیر وہاں سے کتب لاتے رہے۔ 960ء میں ہندوستانی پجاریوں کا ایک گروہ بحری جہاز کے ذریعہ چے گان تک گیا اور بادشاہ کے لیے پیتل اور تانبہ کی گھنٹیاں، بدھ کی مورتی اور کچھ ہندوستانی کتابیں جو 'پی۔لو' درخت کی پتیوں (کھجور) پر لکھی تھیں لے گئے۔ دوسرا گروہ مغربی بن ٹو سے چین 1025-1041 آیا اور فان کتابیں اور تحفے لایا۔

آخری سال یعنی 1053 میں ایک ہندو راہب ہندوستان سے چین آیا۔ چے کیا تگ جو مغربی ہند کا سرامن تھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ چین آیا اور شاید آخری کتاب چین میں لایا۔ ■

ماخذ: ہندوستان کے زمانہ قدیم و وسطی کے کتب خانے، **مصنف:** بمل کمار دت، **مترجم:** سرتاج احمد عابدی، **دوسرا ایڈیشن:** جولائی 2002، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اظہر علی فاروقی

لوک گیتوں کی زبان

لوک گیت زیادہ تر مقامی بولی میں پائے جاتے ہیں اور ایک پردیش میں کئی کئی بولیاں علاقائی ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک پردیش میں بھی بولی اور لب و لہجے کے لحاظ سے گیت یکساں نہیں ہوتے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ مضامین میں جذبات میں پوری یکسانیت اور یگانگت ہوتی ہے چونکہ لوک گیت علاقائی بولیوں اور لب و لہجے میں ہوتے ہیں، اس لیے ہمارے پردیش میں بھی یہی حال ہے کہ پورے پردیش میں ایک بولی میں نہیں پائے جاتے۔

ہمارے پردیش میں جو علاقائی بولیاں ہیں ان کے بارے میں ہم آگے چل کر لکھیں گے۔ کوروی یا کھڑی بولی، روہیلی، قنوجی، برج بولی، پچھمی اور پوروبی اودھی، بھوج پوری، بندیلی، بھوج پوری کی شاخ کاشکا اور پہاڑی مشہور بولیاں ہیں۔

گیتوں کی زبان علاقائی اور مقامی ہوا کرتی ہے۔ الفاظ کے تلفظ اور لب و لہجے پر بھی مقامی اثرات پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گیتوں کی زبان تھوڑے بہت تفاوت سے جدا جدا ہوتی ہے۔ گیتوں کی زبان کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ جو الفاظ لوک گیت کاروں اور ان کے بھائی بندوں کی زبان پر چڑھ گئے، وہ انھیں الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔ وہ نہ تو متروکات کے قائل ہیں اور نہ مختارات کے نہ وہ وضع اصطلاحات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نہ ان کے ماخذوں کا دھیان کرتے ہیں وہ شہر نہ سہی سہر استعمال کریں گے، انھیں نگر کی پروا نہیں۔ نگر توڑ موڑ کر نگری، نگریا بھی بولیں گے۔ ان کے یہاں محل اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ بھون کی پروا نہیں یہ بات دوسری ہے کہ وہ محل کو محلا، دومحلا سے بدل دیں، چٹھی، چٹھیا تو ہو سکتی ہے مگر خط نہیں پتر، پاتی، پتر، پتیا کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ حال، حوال ہی رہے گا۔ سماچار نہیں پنچھی، پچھی بے تکان استعمال کریں گے مگر پکشی نہیں۔ وہ رستم افراسیاب کی داستانیں نہیں گاتا بلکہ کنہیا لال ہی کی جے بولتا ہے (خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو) عورتیں گاتے وقت ہو مورے رام، راما ہو کی ٹیک لگاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ گیتوں کے الفاظ نہایت صاف، سادہ، اور زبانوں پر منجھے ہوئے ہوا کرتے ہیں، خواہ ان کے دفوں میں تبدیلی ہی کیوں نہ ہوگئی ہو اور بیمار برام، تصفیہ، تفصیہ یا پچسیہ ہی کیوں نہ بن گیا ہو۔

بعض بعض گیت تو اتنے صاف اور سادہ الفاظ میں ہیں کہ شاید سارے ملک میں سمجھ لیے جائیں۔

لالٰہ میاں ہمیں نہ دل سے بھول

سب پھولوں میں پھول بڑا ہے — سب سے بڑا گلاب
سب کپڑوں میں کپڑا بڑا ہے — سب سے بڑا رومال

لالٰہ میاں ہمیں نہ دل سے بھول

لمبی لمبی دھوتیا پہ اودی اودی پگیا — ہم جانا رجپوت
جات کا پہنا مری گوئیاں — دگا چھل دے گئو مری گوئیاں
دلی سہر کی لاگی بجریا — ہم جانا پچھلئی ہے بسائی لاڈ روئیا
جات کا بہنا مری گوئیاں — دگا چھل دے گئو مری گوئیاں
سام ہوئی دن جتین لاگو — ہم جانا کچھ کہی ہے مری گوئیاں
دھنن لاگو روئیا — دگا چھل دے گئو مری گوئیاں

سادگی الفاظ کا بہترین نمونہ لوریاں ہیں جو ماں، دادی، نانی اور دوسری خاندانی عورتوں کے دلوں سے مامتا اور محبت سے بھرپور نکلتی ہیں۔

لالٰہ لالٰہ لوریاں — دودھ بھری کٹوریاں
کٹوری گئی پھوٹ — چندا ماما گئے روٹھ
کٹوری آئی اور — چندا ماما آئے دوڑ

میاں آویں دور سے — گھوڑا باندھیں کھجور سے
میاں آویں علی علی — پھوک بکھیروں گلی گلی

میاں آویں دور سے　　پاؤں جھاڑوں دھور سے
آگرہ ملتان صدقے　　سارا ہندوستان صدقے
کابل کندھار صدقے　　لونڈی کا گھر بار صدقے

محاورات اور ضرب الامثال کا بڑی خوبی اور برجستگی سے استعمال کر جاتے ہیں۔

چور چراوے مال کھجانا　　پیا چراوے سکھی نینوں سے نندیا
ماروں گا بے ماروں گا　　جا دلی پکاروں گا
دلی ہے تو کالے کوس　　جہاں پڑی ڈھلم کی چوٹ

لوک گیتوں کے الفاظ سادہ، لوچ دار اور نرم و نازک ہونے کے باوجود لوک گیت کار کے خیال میں ترسیل جذبات میں جب کبھی کمی کرتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ عام شاعری کے مثل تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیتا ہے اور وہ ترسیل جذبات میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی تشبیہیں اور استعارے روزمرہ کی زندگی میں دیکھی بھالی چیزوں سے لیے جاتے ہیں جو واقفیت اور حقیقت سے نہ صرف بہت قریب بلکہ حقیقی ہوا کرتے ہیں۔ ان میں ماورائیت کم اور مادیت اور حقیقت زیادہ ہوتی ہے۔

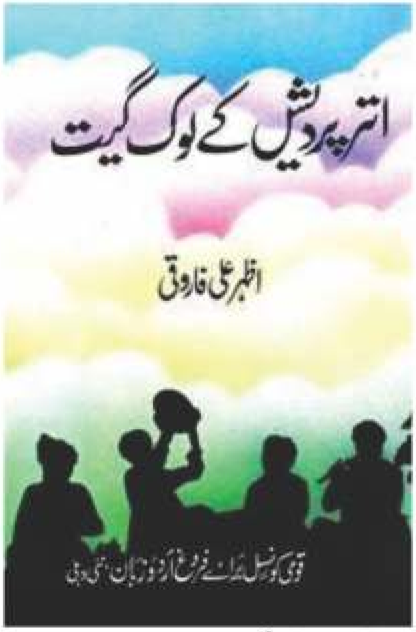

کوئی کمسن لڑکی اسّی سال کے بڈھے سے بیاہی جارہی ہے اور دولہا کو اس کی مانگ میں سیندور بھرنا ہے۔ اب دیکھیے کہ لوک گیت کار اس بڈھے کی جو کیفیت دکھانا چاہتا ہے اس کے لیے کیا لفظ استعمال کرتا ہے؟ لڑکی کے لیے اجگر بتاتا ہے۔

عورتوں کے جھرمٹ سے کسی عورت کی زبانی وہ کہلاتا ہے۔

پانچ برس کی موری رنگ رنگیلی اسّی برس کا داماد
تکر نہ آؤ تو، رنگ رنگیلی اجگر اٹھاڑو داماد
آنگن کچ کچ بھیتر کچ کچ
بوڑھا　　گرامنہ　　بائے
سات سکھی مل بڑھوا اٹھائن
بڑھوا　　سیندور　　بھراؤ

ایک دوسرا گیت پڑھیے۔ لڑکی جوان ہے۔ اس کا شوہر بچہ ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے دو دیور ہیں۔ چوہے اور جوئیں کی جسامت میں جو فرق ہے صاف ظاہر ہے۔ جوان لڑکی اپنے شوہر کو موس (چوہا) اور دیوروں کو چیلر (جوآں) ٹھہراتی ہیں۔

چیلر اس دوئی دیورا ہمار موری گوئیاں
مسوآ اس بلما ہمار موری گوئیاں

لوک گیتوں کے الفاظ سادہ، لوچ دار اور نرم و نازک ہونے کے باوجود لوک گیت کار کے خیال میں ترسیل جذبات میں جب کبھی کمی کرتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ عام شاعری کے مثل تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیتا ہے اور وہ ترسیل جذبات میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوک گیت کار کا انداز فکر تجرید سے زیادہ تجسیم کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسی لیے گیتوں کی تشبیہیں اور استعارے مجرد سے زیادہ مجسم ہوتے ہیں۔ کنواری لڑکی کو گائے اور کلی سے، جنگل میں پھیلی ہوتی بیل سے، خوب صورت چہرے کو چاند سورج سے، خوب صورت اور سفید دانتوں کو چاولوں سے، گھنی اور پھیلی ہوئی داڑھی کو سوپ سے، بڑی بڑی آنکھوں کو بیل کے دیدوں اور آم کی کیریوں اور پھانکوں سے، ماں کو گنگا سے، پچھریا (پشت پناہ) بہن کو پگڑی بھائی کو بجا (بازو) محبت کو رس، بوڑھے شوہر کو اجگر، بھوؤں کو کمان، اتحاد دل کو دودھ اور پانی کے ملنے سے، دکھوں اور مصیبتوں میں ہونے کو لوہے کی بھٹی سے، مصیبتیں سہتے سہتے جسم خراب ہوجانے کو کوئلے سے، سسرال کو لوہار کی دکان سے، ریل گاڑی کو سوتن سے، موٹر کو بن دھواں کی گاڑی، بیوی کو پیروں کی خاک سے۔

ہم تو رے بابل کھونٹے کی گیاں　　جدھر ہانکو ہنک جائیں رے
ہم تورے بابل بیلے کی کلیاں　　گھر گھر مانگی جائیں رے
ہم تورے بابل روکھن کی چڑیاں　　رات بسے اڑ جائیں رے

بن ماں پھولی بیلیا اب روپ اگاری
ملیا ہاتھ پیارا تو ہوئی ہے ہماری

چندا سورج اُس بہنی
جرجر بھئی کوئلا

لوہا جرے جیسے لوہرا دکینا
موری بہنی جرے سسر یارے

چوں نندی کا اونٹوا چاور اس دنتوا

جیسے دودھ میں پانی ملت ہے
اُوئی ملوں تورے ساتھ
جیسے اکاس میں چڑیاں اڑت ہیں
اُوئی اڑوں تورے ساتھ

■

ماخذ: اتر پردیش کے لوک گیت، **مصنف:** اظہر علی فاروقی، **دوسرا ایڈیشن:** 1998، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

لوک ادب میں لوری کی اہمیت

ترنگ موریہ

برِ صغیر میں چھوٹے بچوں کو لوری سنانے کی روایت بہت ہی پرانی ہے لیکن جب دنیا میں لوری کی تعریف کو کھنگالا گیا تو پتہ چلا کہ اس کا آغاز تقریباً چار ہزار قبل عراق میں بابل کی تہذیب میں ہوا تھا:

''ماہرین کے مطابق دنیا میں پہلی بار لوری بچوں کو سلانے کے لیے ہی گائی گئی تھی اور دو ہزار قبل مسیح میں یہ لوری مٹی کے ایک چھوٹے ٹکڑے پر تحریر کی گئی تھی جو کھدائی کے دوران ملا ہے اس ٹکڑے کو لندن کے برٹش میوزیم میں رکھا گیا ہے۔ ہتھیلی میں سما جانے والے مٹی کے اس ٹکڑے پر موجود تحریر کیونی فارم (cuneiform) اسکرپٹ میں ہے جسے لکھائی کی ابتدائی اشکال میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔''

(لوری کی آفاقی زبان، مشمولہ: بی بی سی اردو، یکم جنوری 2013)

ہم اپنے آس پاس دیکھ سکتے ہیں کہ عورتیں اپنے روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کے لیے کچھ لفظ اپنی زبان سے ادا کرتی ہیں۔ جیسے ہو ہو لالا وغیرہ اور ماں اپنے بچے کو خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی جھوٹی باتیں اور دلاسے بھی دیتی ہے۔ وہ سب لوری کا حصہ ہیں۔ مثلاً

سوجا بابو سوجا تمھارے ابو آئیں گے
تمھیں سینے سے لگائیں گے
خوش ہو جائیں گے

لوری لوک گیت ہے جس کا وزن، بحر، تکنیک یا ہیئت نہیں ہوتی مگر اس کو پڑھنے اور سننے والے کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ وہ لوک گیتوں کی صنف لوری پڑھ اور سن رہا ہے۔ کیوں کہ اس گیت میں ماں کی ممتا کے ایسے جذبات کی خوشبو ہوتی ہے جو پڑھنے اور سننے والے کو متاثر کر دیتی ہے:

''لوری کے ذریعے بچہ پہلی بار اپنی مادری زبان کی مٹھاس اور موسیقی سے مانوس ہوتا ہے۔''

(قمر رئیس، مرتبہ: اردو میں لوک ادب، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، 1990، ص 9)

لوری بچے کو سلانے اور روتے بلکتے چہرے پر مسکراہٹ لانے کے لیے گائی جاتی ہے۔ بچے میں اتنا شعور نہیں ہوتا کہ وہ لوری کے الفاظ اور معنی سے پوری طرح واقف ہو مگر جذبات واحساسات اور ردم اور ترنم کے سمندر میں ڈوب کر وہ نیند کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔ لوری صرف میٹھی پُرسکون نیند کا ہی ذریعہ نہیں ہے بلکہ بچوں کے لیے ان کا مستقبل سنوارنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ لوریوں کے ذریعے بچے کو بڑے ہو کر کیا کیا بننے کی ترغیب دی جاتی ہے:

''نفسیاتی نظریے کے مطابق لوری بچے کے ذہن کو ادھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے ایک مرکز پر لے آتی ہے لوری کی لے پر اس کا ذہن نہ صرف مرکوز ہوتا ہے بلکہ اسے یہ خوش گوار احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔''

(معزہ ابراہیم قاضی، اردو میں منظوم عوامی ادب اور لوریاں، غزالی پرنٹرس، 2007، ص 72)

بچہ فطری طور پر منظوم ادب میں بھی دلچسپی اس وقت لیتا ہے جب اس میں دلچسپی اور کشش موجود ہوتی ہے اس لیے لوریوں میں صوتی اعتبار سے ماں باپ یا کوئی رشتے دار، دادی نانی وغیرہ کی سریلی آواز درکار ہوتی ہے۔

ماں اور بچے کے درمیان لوریوں کی پرانی تاریخ ہے اور تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ بچوں میں تال اور لے کو سمجھنے کی انوکھی صلاحیت ہوتی ہے۔ بچہ جب مترنم آوازیں سنتا ہے تو روح افزا یا فرحت بخش ماحول محسوس کرتا ہے اور چپ ہو جاتا ہے اور اسے سرلیے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس کے تخیلات میں تیزی سے ترقی ہوتی ہے اور وہ خیالی دنیا میں اڑان بھرنے لگتا ہے۔ لوری کے ذریعے بچے کے جذبات واحساسات کی جو روشنی نصیب ہوتی ہے اس روشنی میں اس کی تربیت ہوتی ہے جو تاعمر اس کے لیے ناقابل فراموش بنتی ہے۔

بھارت اور پاکستان کے زیادہ تر حصوں میں جو لوریاں سنائی جاتی ہیں ان میں چاند یا چندا ماما کا ذکر ہوتا ہے اور چندا ماما دور کے ایک مقبول لوری ہے۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

چندا ماما دور کے
کھوئے پکائے دودھ کے
آپ کھائے تھالی میں
منے کو دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ
منا گیا روٹھ
نئی پیالی لائیں گے
منے کو منائیں گے

اگر چہ اس لوری کے تخلیق کار کا نام نہیں معلوم لیکن اس کی غنائیت صوتی آہنگ اور معنویت آوازوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جو جادوئی کیفیت پیدا کرتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس لوری کو کسی ذہین شخص نے تخلیق کیا ہے۔

کیف احمد صدیقی عام روایتی لوری میں بیان کردہ 'چندہ ماما' کی جگہ بچے کو خواب میں پریوں سے ملایا ہے اور اس کی زبانی دلکش ترانے سنائے ہیں۔

''سوجا میرے دل کے ٹکڑے سوجا میری جان
تو ہے مجھ کو جان سے پیارا تجھ پر میں قربان
سپنوں کی نگری میں بلائے تجھ کو نندیا رانی
چاند دیش میں جا کر تجھ کو کرتی ہے مہمانی
ساری رات تجھے ہونا ہے پریوں کا مہمان
سوجا میرے دل کے ٹکڑے سوجا میری جان''

(کیف احمد صدیقی، اردو میں بچوں کا ادب، نصرت پبلشرس، امینہ آباد لکھنؤ، 1989، ص 287)

اس لوری میں دیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح ایک ماں کے دل میں اپنے بچے کے لیے پیار کے جذبات ہوتے ہیں اور کس طرح وہ اس کے بہتر مستقبل کے سپنے دیکھ

رہی ہے۔

اردو ادب میں جن لوریوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان میں سے بہت سی لوریاں ایسی ہیں جو لوری کی حدوں سے آگے نکل جاتی ہیں اور نظم کے دائرے میں شامل ہو جاتی ہیں لیکن ان کا اسلوب اور لہجہ لوری سے قریب کرتا ہے۔

محترمہ ابراہیم قاضی نے اپنی کتاب 'اردو میں منظوم عوامی ادب اور لوریاں' میں کئی ایسی لوریاں شامل کی ہیں جن کے تخلیق کاروں کے نام معلوم نہیں ہیں اور بہت سی ایسی لوریوں کو بھی قلم بند کیا ہے جس کے تخلیق کار کا نام دستیاب ہے۔

مثال کے طور پر'' احمد منشی'' کی لکھی ہوئی یہ لوری ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ نبی کے جاؤں میں واری
لعلوں سے میں نے جھولا سنواری
پیارے کی آنکھوں میں آئی خماری
صدقے میں تیرے صورت ہے پیاری
آؤ سہاگن جھولا جھلانے
نور نظر کو اپنے منانے

مختلف زبانوں میں لوریاں

معاشروں میں تنوع کے باوجود ان کی لوریوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ دنیا میں آپ جہاں چلے جائیں مائیں ایک ہی دھن استعمال کرتی ہیں اور ایک ہی طریقے سے اپنے بچوں کے لیے گیت گاتی ہیں۔ بہت سی لوریاں چند ہی الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں جنھیں بار بار دہرایا جاتا ہے۔ بعض اوقات ہمیں مختلف زبانوں میں ایسی لوریاں بھی ملتی ہیں جو ایک دو مصرعوں کی ہی ہوتی ہیں مگر جب مائیں ان کو بار بار پڑھتی ہیں تو وہ بھی ایک سماں باندھ دیتی ہیں۔ لوریوں کے بول بے مقصد اور فضول نہیں ہوتے ان کے الفاظ سادہ اور عام فہم ہوتے ہیں۔

پنجابی زبان میں اسے 'لوری' اور پشتو میں 'اللہ ہو' کہا جاتا ہے۔ پشتو میں اسے اللہ ہو اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس گیت کے آخر میں وہ 'اللہ ہو' کے الفاظ لاتے ہیں جس کے معنی سو جا کے ہی ہیں۔ سندھی بلوچی اور براہوی زبانوں میں بھی اسی انداز سے لوری سنائی جاتی ہے ان کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان میں بھی لوری کا یہی انداز رائج تھا۔

ہندی کی لوریاں

ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں لوریاں سنائی جاتی ہیں۔ ہندی ادب نے لوریوں کو سنوارنے میں ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ مثلاً

سو جا میری بٹیا رانی / سو جا راج دلاری
سویا چاند سوئے تارے
نیل گگن کے پنچھی سارے
رنگ برنگی تتلی سوئی
پھولوں کی پھلواری، سو جا راج دلاری
نبھ سے اترا اڑن کھٹولا
نیند پری نے گھونگھٹ کھولا
سپنوں کی شہزادی لائی
جادو بھری پٹاری / سو جا راج دلاری

لوری میں آئی پریوں کی رانی، نیند کی راج کماری اور سپنوں کا اڑن کھٹولا وغیرہ ایک طرف جہاں بچوں کو جلدی سونے کے لیے اکساتے ہیں وہیں دوسری طرف ان کے دماغ کے تخیل کو تیز کرتے ہیں۔

ہندوستانی فلموں میں لوریاں

ہالی ووڈ کی زیادہ تر فلموں میں گانے نہیں ہوتے جبکہ ہندوستانی سنیما گانوں اور موسیقی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، ہالی ووڈ میں موسیقی کی ایک متوازی دنیا ہے، جبکہ ہندوستان میں سنیما اور موسیقی کا تعلق اتنا قریب ہے کہ یہ خطے روایت اور ثقافت کے دائروں کو ایک سمندر میں ضم کر دیتا ہے۔ جو ثقافتی اتحاد کا پیغام ہے۔ لوریوں کا استعمال فلموں میں پہلے بھی ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے، مثلاً

(1) منّا بڑا پیارا ممی کا دلارا
کوئی کہے چاند کوئی آنکھ کا تارا
فلم: مسافر (1957)، گیت کار: کشور کمار

(2) ننھی کلی سونے چلی ہوا دھیرے آنا
نیند بھرے پنکھ لیے جھولا جھلانا
فلم: سجاتا (1959)، گیت کار: گیتا دت

(3) آ ری آ جا نندیا
لے چل کہیں اڑن کھٹولے میں
دور دور یہاں سے دور
فلم: کنوارا باپ (1974)، گیت کار: کشور کمار

(4) آ جا ری نندیا آ
ننھی سی آنکھوں میں آ
چپ کے سے آ چوری سے آ
فلم: مان ابھمان (1979)، گیت کار: لتا منگیشکر

(5) آہستہ آہستہ نندیا تو آ
ان دو نینوں میں
ہلکے سے ہولے سے
کچھ سپنے بھولے سے
فلم: سودیش (2004)، گیت کار: ادت نارائن

(6) چاندنیاں چھپ جانا رے
چھن بھر کو لک جانا رے
نندیا آنکھوں میں آئے
بٹیا مری سو جائے
فلم: راؤڈی راٹھور (2012)، گیت کار: شریا گھوشال

(7) چاؤ رو چاؤ رو
اچھا پری چاؤ رو
فلم: میری کام (2014)، گیت کار: پرینکا چوپڑا

ایک ایسے وقت میں جب ثقافت کی بہت سی تحریریں فراموش ہو رہی ہیں یہ یقین کہ سنیما اور لوک گیتوں کی مشترکہ دنیا میں بہت کچھ باقی ہے، ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

تمام ترقیوں کے باوجود ہماری کچھ ایسی روایتیں آج بھی مستحکم ہیں جن کی پاسداری ادب و ثقافت سے محبت رکھنے والے کرتے آ رہے ہیں۔ ان ثقافتی اقدار کی ایک زندہ روایت لوریاں بھی ہیں جن کی حفاظت اور اس کی پاسداری ہماری ذمے داری ہے۔ ہم جدید ٹکنالوجی کا ضرور استعمال کریں لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی ثروت مند قدروں کو فراموش نہ کریں اور انھیں ثقافتی قدروں کا ایک حصہ ہماری لوریاں بھی ہیں۔

لوریاں والدین اور بچوں کے درمیان جذباتی تعلق کو مضبوط کرتی ہیں، ابتدائی تعلیم میں مدد فراہم کرتی ہیں اور بچوں کے سکون و نیند کے لیے اہم ہوتی ہیں۔

یہ سماجی اقتصادی اور ماحولیاتی تناظر کی عکاسی کرتی ہیں۔ زبانی روایات کے تحفظ میں ان کا کردار بہت اہم ہے۔ لوریوں کے طبّی فوائد بھی ہیں جو درد، بے چینی اور اضطراب کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر لوریاں لوک ادب میں کثیر الجہات اہمیت رکھتی ہیں، جو ثقافتی ورثہ کے تحفظ، جذباتی رشتے اور بچوں کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

■

Tarang Maurya
Research Scholar Ph.D
CUCS MANUU, Hyderabad
Mob: 9305849668
Email: tarangmaurya1512@gmail.com

نریش

جدید ہندی شاعری میں

اردو کی علامتوں اور شعری روایات کا استعمال

اردو کے چھندوں اور اردو کی لفظیات کے علاوہ جدید ہندی شاعری نے اردو کی علامتوں کو بھی اپنایا ہے۔ علامت کے لغوی معنی نشان ہیں۔ علامت لفظ کا استعمال کسی ایسی مرئی یا غیر مرئی چیز کے لیے کیا جاتا ہے، جو کسی مرئی یا غیر مرئی شے کو اپنی مشابہت کی بدولت قائم کرتی ہے۔ علامت کے متعدد معانی ہوسکتے ہیں۔ اس لفظ کے کثیر المعانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ علامت لفظ ایک نفوذ پذیر لفظ ہے۔ ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں لفظِ علامت کا استعمال مختلف انداز میں ہوتا ہے۔ ہماری سماجی یا سیاسی زندگی میں کوئی رنگ، کوئی شکل یا کوئی نشان علامت کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی ادارے کا کوئی تجارتی نشان، کسی سماج کا کوئی سکّہ یا کسی ملک کا پرچم اس کی علامت بنتا ہے۔ مذہبی زندگی میں کوئی پتھر یا کوئی بت خداوندِ اقدس کی علامت کے طور پر عبادت کے لائق بن جاتا ہے۔ ادب کے حلقے میں کسی جذبے یا کسی خیال کی نمائندگی کرنے والے الفاظ کو علامت کہتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مردے کے بارے میں کہا جائے کہ ''پنچھی اُڑ گیا اور پنجرا خالی ہے'' تو یہاں پر پنچھی روح کی اور پنجرا جسم کی علامت کہلائے گا۔1

اردو کی علامتیں

اپنے جذبات و خیالات کو موثر طریقے سے بیان کرنے کے لیے شعرا علامتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ کسی غیر مرئی چیز سے قاری یا سامع کو متعارف کرانے کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ شاعر کسی مرئی چیز کو بطور علامت پیش کرے۔ شاعری میں علامتوں سے کام لینے کا سلسلہ ویدوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ جدید ہندی شاعری کو علامتوں کا راستہ عہدِ وسطیٰ کی شاعری نے دکھایا ہے۔ بھگتی ادب میں تو بے شمار علامتیں موجود ہیں بلکہ عالم یہ ہے کہ اگر بھگتی ادب میں سے علامتوں کو خارج کردیا جائے تو تمام ادب عامیانہ ہوکر رہ جائے گا۔ اس کے باوجود جدید ہندی شاعری میں بعض ایسی علامتیں شامل ہوگئی ہیں، جو پہلے سے ہندی ادب میں موجود نہیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ علامتیں ہندی نے اردو سے مستعار لی ہیں۔ اردو شاعری میں مستعمل تمام علامات کی فہرست تیار کرنا نہ تو یہاں مقصود ہے، نہ مناسب، تاہم ان علامات پر غور کرنے کی گنجائش ضرور ہے، جو جدید ہندی شاعری نے اردو سے حاصل کی ہیں۔ ان کو ہم تین حصّوں میں تقسیم کرکے دیکھ سکتے ہیں — تہذیبی علامتیں، سماجی علامتیں اور مذہبی علامتیں۔

تہذیبی علامتیں

تہذیب سے یہاں پر ہماری مراد اسلامی تہذیب ہے۔ اسلام کا نزول چونکہ عرب میں ہوا تھا، اس لیے وہاں کے تہذیب وتمدن کی جھلک اردو ادب میں دکھائی دیتی ہے۔ اونٹوں پر سامان لادکر قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کرنا عربی تہذیب کا جزولاینفک رہا ہے۔ عام طور پر عرب کی اسلامی تہذیب کی شناخت چار چیزوں سے کی جاتی ہے۔ یہ ہیں — چراغ و مسجد و مینار و منبر۔

ان کا ہندی میں استعمال

جدید ہندی شعرا نے عربوں کی خانہ بدوش زندگی سے فائدہ اُٹھایا ہے اور اسے نقل مکانی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

یادوں کے اونٹوں پر بیٹھا وہ قافلہ لیے پھرتا ہے 2

***

گھنٹیاں قافلوں کی سننا چاہتا ہوں میں 3

اسلامی تہذیب کی شناخت بنے نشانات کا ہندی شاعری میں استعمال ملاحظہ کیجیے:

یہ روضے مینار مقبرے راج بھون رتنوں سے منڈِت 4

***

تن کا دیا پرشن کر رہا من کی بنی ایک درگاہ سے 5

***

میں کسی قبر کا جلتا اپورن سہاگ ہوں 6

مندرجہ بالا مصرعوں میں روضے، مینار اور مقبرے اسلامی تہذیب کی علامتیں بن کر اپیندرناتھ اشک کو وہاں پر لے گئے ہیں جہاں پر مسلم آبادی اکثریت میں ہے تو ویریندر مشر نے دیے کو تنفس کی اور درگاہ کو روح کی علامت بنایا ہے۔ نیرج نے بھی دیئے کو بے قرار روح کی علامت بنایا ہے۔

مذہبی علامتیں

شیطان سے متعلق مفروضہ کے بارے میں ہم آگے چل کر تفصیل سے بات کریں گے۔ یہ لفظ بنی آدم کی دشمنی کی علامت ہے۔ ہم اس کو علامتی روایت بھی کہہ سکتے ہیں لیکن چونکہ ہندی شاعری میں شیطان کو ہر جگہ پر علامت ہی بنایا گیا ہے، اس لیے ہم اس کو روایت کے زمرے میں نہیں رکھ رہے ہیں۔ اردو شاعری میں بھی شیطان کو گمراہ کن کی علامت کے طور پر ہی پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح سے قرآن میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک بار حضرت موسیٰ نے خدا کا دیدار کرنا چاہا اور اس کے لیے بار بار استدعا کی۔ ان کی دعا قبول ہوئی اور نور کی شکل میں خدا طور نامی پہاڑ پر اتر آیا مگر خدا کی تجلّی کی تاب نہ موسیٰ لا سکے اور نہ کوہِ طور۔ موسیٰ بے

ہوش ہوکر گر پڑے اور طور جل کر سرمہ ہوگیا۔ اردو شاعری میں نور کو ربانی تجلی کی علامت کے طور پر اور طور کو سعیِ ناکام کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

ان کا ہندی میں استعمال

یہ علامتیں بھی براہِ راست اردو ہندی کے ایوانِ شاعری تک پہنچی ہیں۔ جدید ہندی شاعری میں بطور علامت شیطان کا استعمال ملاحظہ کیجیے:

شیطان ابھی تک تیرے سر پر بیٹھا ہے7

***

وہ نہیں خدا کا وہ شیطاں کا کرتب 8

***

نور اور طور کی علامتیں ملاحظہ کیجیے:

نور ایک وہ رہے طور پر یا کاشی کے دوار میں10

***

پیغمبر امر محمد کے خاموش نور تم نسمبھر م 11

ان دونوں مصرعوں میں نور کو فیضانِ الٰہی کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

سماجی روایتیں

تہذیبی اور مذہبی علامتوں کے علاوہ بعض ایسی چیزیں بھی بطور علامت جدید ہندی شاعری میں در آئی ہیں، جن کا تعلق مسلم معاشرے سے ہے۔ شراب ایک زمانے میں ایرانیوں کی مرغوب مشروب رہی ہے۔ اسلام نے اگرچہ شراب نوشی کو ممنوع قرار دے دیا لیکن ادب میں سے شراب کو بے دخل نہ کیا جاسکا۔ اردو شاعری میں شراب کبھی دنیاوی عیش وعشرت کی علامت بنی ہے تو کبھی نشۂ معرفت کی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں کبھی شراب کو چھو کر بھی نہ دیکھنے والے امیر مینائی نے شراب پر دل میں اُتر جانے والے شعر کہے ہیں۔

اسلام کے ابتدائی دور میں غلاموں کی خرید و فروخت عام بات تھی۔ حضرتِ یوسف کو بھی غلاموں کی منڈی میں بیچا گیا تھا۔ انسانی زندگی کا اس سے بڑا المیہ کیا ہوسکتا ہے کہ انسان ہی انسان کو خریدے اور اس کا مالک بن بیٹھے لیکن ملکیت تو فقط جسم پر ہوسکتی ہے، کسی کے دل پر تو پہرا نہیں بٹھایا جاسکتا۔ غلامی کی وجہ سے محرومی و ناکامی کے عذاب میں سے گذر رہے دلوں کے احساسات کو قفس، آشیانہ اور برق کی علامتوں کے ذریعے زبان دی گئی ہے۔ قفس، قید و بند اور انسان کی مجبوری کی علامت بنا تو آزادی اور سکون کی علامت

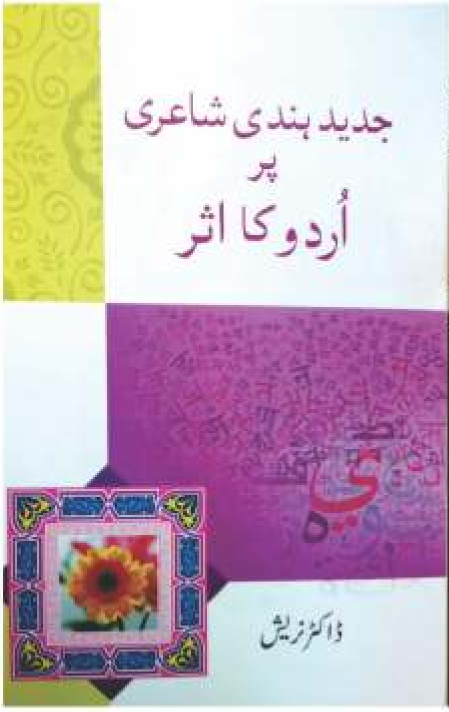

آشیانہ کو بنایا گیا۔ اسی طرح برق کو غیظِ الٰہی کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

عشقیہ جذبات کے اظہار کے لیے شمع اور پروانہ کی علامتیں اردو شاعری میں بہت کامیاب رہی ہیں۔ شراب کی طرح شمع و پروانہ کو بھی مجازی اور حقیقی دونوں طرح کے عشق کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف شمع حسنِ معشوق کی آتشزنی اور اس کی بے نیازی کی علامت بنی، وہیں دوسری طرف پروانہ عاشق کے عشقِ صادق اور اس کی جاں نثاری کی علامت بنا۔

ان کا ہندی میں استعمال

مغربی تہذیب کے زیرِ اثر عیش پرستی کے متمنی ہندوستانی نوجوان اپنی قدیم روایات اور سماجی اقدار سے کنارہ کشی کرنے لگے تھے۔ انگریزی تعلیم نے ان اعتقادات و اقدار کو کمزور بنادیا تھا۔ ادھر اردو شاعری میں محفل جمی ہوئی تھی۔ ساقی کا جلوہ کارفرما تھا۔ جامِ مے گردش میں تھا۔ میکش مستی میں جھوم رہے تھے۔ پرہیزگاروں پر پھبتیاں کسی جارہی تھیں۔ ایسے میں شراب اور ساقی سے مفر کہاں ممکن تھا۔ لہٰذا چھایاواد کے نصف آخر میں ہندی شعرا ہالا (شراب) اور مدھوبالا (ساقی) کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ اپنی سُدھ بُدھ ہی بھول گئے۔ اوصاف کردار طاق پر رکھ دیے گئے۔ یہاں تک کہ خدا کی خدائی پر بھی سوالیہ نشان لگنے لگے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ مے و مینا کے ساتھ اردو شاعری کا تو چولی دامن کا ساتھ تھا ہی، ہندی شعرا بھی اس میدان میں ان سے پیچھے نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ چھایاوادی دور ہی میں مے سے بھری صراحیوں اور چھلکتے ہوئے جاموں کے ساتھ میکش بھی مے خانوں میں نظر آنے لگے۔12

یہاں پر ایک خام خیالی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ہندی شاعری میں شراب کے تعلق سے جو علامتیں مروّج ہوئیں، اس کا سبب اردو کا اثر نہیں تھا بلکہ سنسکرت کے سوم رس کا اثر تھا۔ یہ حضرات شاید یہ بھول رہے ہیں کہ اردو میں بھی شراب کو وہی درجہ حاصل رہا ہے، جو سنسکرت میں سوم رس کو حاصل رہا ہے۔ اردو میں سوم رس کو شرابِ طہور کہا گیا ہے۔ جیسا پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے، اردو شاعری میں شراب کو مجازی معنی میں بھی علامت بنایا گیا ہے اور حقیقی معنی میں بھی۔ یہ غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شراب کے مجازی معانی ہی کو ملحوظِ نظر رکھا جاتا ہے اور اس کے عارفانہ معانی نظر انداز کردیے جاتے ہیں۔ جدید ہندی شاعری میں شراب کو بطور علامت جس طرح سے بھی استعمال کیا گیا ہے، وہ ہرگز سنسکرت شاعری کے اثر کا نتیجہ نہیں ہے، اردو کے اثر کا نتیجہ ہے۔ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ سنسکرت میں سوم رس کے ذکر میں مے خانہ اور محفل سرے ہی سے خارج ہیں جبکہ اردو شاعری میں شراب کے ساتھ ساقی، پیرمغاں، جام و مینا اور محفل بہرصورت موجود ہیں۔ جدید ہندی شعرا نے اس پورے منظرنامے کو اپنی شاعری میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

میں نے کب دیکھی مدھوشالا
کب مانگا مرکت کا پیالہ
کب چھلکی وِدرُم سی ہالا
میں نے تو ان کی سِمت میں
کیول آنکھیں دھو ڈالیں 13

بعض دوسرے شعرا کے یہاں بھی شراب سے متعلق علامات ملاحظہ کیجیے:

مادکتا سے آئے تم سنگیا سے چلے گئے
ہم ویاکل پڑے بلکھتے تھے اترے ہوئے نشے سے14

***

پینے کا مزہ تو ہے تبھی اے ساقی
میخانہ کبھی جھومے مگر سوئے نہیں 15

***

میں بنا ہوا تھا ساقی میں ہی تھا پینے والا16

***

نہیں جاہ مدرا کی ساقی کیا ہوں گے یہ پیالے17

***

زندگی صراحی ہے ساقی ہے
دور ابھی ایک اور باقی ہے 18

***

اور پھر یہ آج کا گانا کہ محفل ہے جمی19

اسی طرح سے طائر، پنجرا، آشیانہ اور برق کی علامتوں کا استعمال ہندی شاعری میں ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کیا ہوائیں تھیں کہ اجڑا پریم کا وہ آشیانہ20

***

تھکی بیڑی قفس کی ہاتھ میں سو بار بولی21

***

گلچیں نشتر پھینک رہا کلیوں کو توڑ اٹل میں22

***

زندگی کے پنجرے میں بند ہے مجبور پنچھی23

***

بجلیاں دل پر گرا کر جھک گئے چنچل پلک دل24

***

نیڑ ترن جب جب بنا آندھی قفس بنتی رہی25

***

جانتی ہیں، بجلیاں گرانا مگر نیڑ کس کا جلا وہ نہ یہ جانتیں26

عاشق ومعشوق کے لیے شمع و پروانہ کی علامتوں کا استعمال ملاحظہ کیجیے۔

دیپ اور پتنگے میں فرق صرف اتنا ہے
ایک جل کے بجھتا ہے ایک بجھ کے جلتا ہے27

***

یہ جلتی شامیں یہ بکھری دعائیں
پتنگا بچارا جلا جا رہا ہے
کہ دیپک کا دامن چھلا جا رہا ہے28

***

اے پروانے دھیرے دھیرے
ہم بھی اب جلنا سیکھ گئے 29

***

او شوق کے پروانو
ذرا ٹھہرو
یہ شمع نہیں ہے
وہ داغ ہے صرف30

اردو زبان ، اردو چھندوں اور علامتوں سے تو صرف ہندی شاعری کا جسم ہی متاثر ہوا تھا لیکن جب اردو کی شعری روایات ہندی شاعری میں ضم ہونے لگیں تو اردو شاعری ہندی کے وجود میں داخل ہوکر اس کی روح کو متاثر کرنے لگی۔ اردو کی شعری روایات کو اپنا کر تو ہندی شعرا گویا اردو شاعری کی روح تک پہنچ گئے اور انھوں نے اس کو چھوکر دیکھ لیا۔ جیسا ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، اردو شاعری پر فارسی شاعری کا بہت گہرا اثر پڑا ہے، اس لیے اس کی اکثر شعری روایات بھی فارسی ہی سے آئی ہیں۔ جدید ہندی شاعری میں بھی ہندی شعرا نے ایسی روایات کو اپنی شاعری میں جگہ دی تھی لیکن تب یہ روایات اردو سے نہیں بلکہ براہِ راست فارسی سے ہندی میں آئی تھیں۔ مثلاً رحیم کا ایک دوہا ہے۔

جکیہاری جوبن لیے ہاٹ پھرے رس دیت
اپنا مالن چکھائی کے رکت آن کو لیت

رکت (خون)، مانس (گوشت) قتل وغیرہ ہندی یا سنسکرت کی روایات نہیں ہیں، یہ فارسی ہی سے ہندی میں آئی ہیں۔ جدید ہندی شعرا فارسی کے بجائے اردو کے زیادہ قریب رہے ہیں، اس لیے انھوں نے شعری روایات اردو ہی سے حاصل کی ہیں۔

حواشی

1. گنپتی چندر گپت: ساہتک عبدھ، 1960، اشوک پرکاش، دہلی، ص326
2. ماکھن لال چترویدی: بیجوری کا جل آنج رہی، 1964، بھارتیہ گیان پیٹھ، کاشی، ص49
3. سرویشور دیال: کاٹھ کی گھنٹیاں، 1959، بھارتیہ گیان پیٹھ، کاشی، ص26
4. اپیندر ناتھ اشک: چاندنی رات اور اجگر، 1952، نیلابھ پرکاشن، الہ آباد، ص44
5. ویریندر مشر: لیکھنی ویلا، 1958، بھارتیہ گیان پیٹھ، کاشی، ص85
6. گوپال داس نیرج: لہر پکارے، 1959، آتمارام اینڈ سنز، دہلی، ص61
7. ہری ونش رائے بچن: سوت کی مالا، 1948، سینٹرل بک ڈپو، الہ آباد، ص40
8. بھگوتی چرن ورما: رنگوں سے موہ، 2019 بکرمی، بھارتی بھنڈار، الہ آباد، ص82
9. جیون پرکاش جوشی: آگ اور آکرشن، 1962، ہندی ساہتیہ سنسار، دہلی، ص45
10. رام دھاری سنگھ دنکر: دو ند گیت، شری اجنتا پریس، پٹنہ، ص63
11. تمے بکھاریہ: میرے باپو، 1951، بھارتیہ گیان پیٹھ، کاشی، ص67
12. ہرنارائن سنگھ: چھایاواد کا ویہ تتھا درشن، 1964، گرنتھم، کانپور، ص425
13. مہادیوی ورما: نیرجا، 2013 بکرمی، بھارتی بھنڈار، پریاگ، ص53
14. جے شنکر پرساد: آنسو، 2003 بکرمی، بھارتی بھنڈار، پریاگ، ص33
15. گوپال داس نیرج: مکتکی، 1960، آتمارام اینڈ سنز، دہلی، ص62
16. بھگوتی چرن ورما: پریم سنگیت، 1949، وشال بھارت بک ڈپو، کلکتہ، ص40
17. شری من نارائن: رجنی میں پربھات کا انکر، 1962، آتمارام اینڈ سنز، دہلی، ص40
18. موہن لال گپت: عربی نہ فارسی، 1958، مدھو پرکاش، بنارس، ص27
19. اجت کمار: اکیلے کنٹھ کی پکار، 1958، راج کمل پرکاشن، دہلی، ص11
20. ہری ونش رائے بچن: آدھونک کوی، 1983، ہندی ساہتیہ سمیلن، پریاگ، ص70
21. رام دھاری سنگھ دنکر: ہنکار، اُدیاچل، پٹنہ، اشاعتِ سوم، ص32
22. ایضاً: ص62
23. ہری کرشن پریمی: روپ درشن، 1951، آتمارام اینڈ سنز، دہلی، ص83
24. ایضاً: ص47
25. گوپال داس نیرج: پران گیت، 1961، آتمارام اینڈ سنز، دہلی، ص83
26. روپ نارائن ترپاٹھی: ون پھول، 1962، گیتاین، پریاگ، ص66
27. گوپال داس نیرج: مکتکی، 1960، آتمارام اینڈ سنز، دہلی، ص52
28. شومنگل سنگھ سمن: پر آنکھیں نہیں بھریں، راجکمل پرکاشن، دہلی، ص10
29. للت گوسوامی: میرے گیت، 1958، آتمارام اینڈ سنز، دہلی، ص8
30. شمشیر بہادر سنگھ: کچھ اور کویتائیں، 1961، راجکمل پرکاشن، دہلی، ص62

■

ماخذ: جدید ہندی شاعری پر اردو کا اثر، **مصنف:** نریش، **پہلی اشاعت:** 2017، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

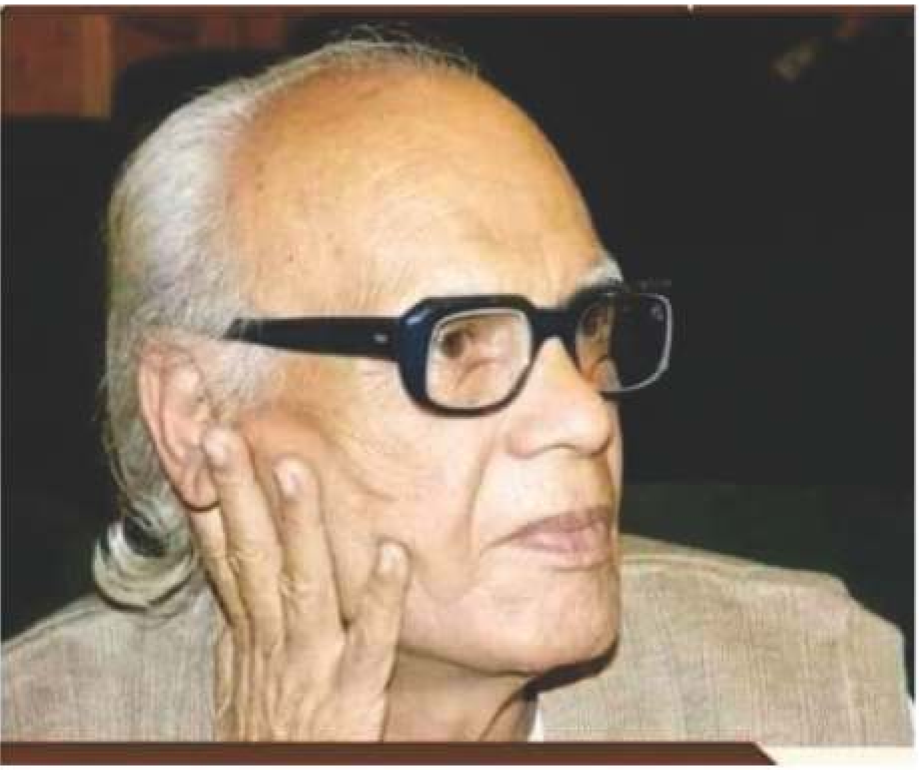

خوشبوئے عشق بانٹنے والا پروفیسر قیصر شمیم

علی شاہد دلکش

وسیع کینوس میں مشرقی ہند کے ایک ایسے مقبول و معروف شاعر و ادیب، ممتاز معلم، مترجم، اسکالر اور صحافی کا نام پروفیسر قیصر شمیم ہے، جن کا مذہب ہمہ تن عشق رہا۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے عشق میں تفریق نہیں کی۔ حالانکہ ان کا حلقۂ شاگرد و احباب انتہائی وسیع رہا۔ موصوف کی شخصیت ایک سراپا مخلص ہستی کی سی رہی جو تا عمر علم و ادب کی خوشبو، محبت و شفقت کی خوشبو، انسان دوستی کی خوشبو، اپنائیت و انسیت کی خوشبو، علم دوستی کی خوشبو، قومی یک جہتی کی خوشبو اور التفات و عنایت کی خوشبوؤں کو بانٹنے میں سر گرم عمل رہی۔ قیصر شمیم خود ہی مذہبی یک جہتی کے رنگ میں یوں کہتے نظر آتے ہیں۔

میرا مذہب عشق کا مذہب جس میں کوئی تفریق نہیں
میرے حلقے میں آتے ہیں تلسی بھی اور جامی بھی

مذکورہ شعر پر استاذ الشعرا قیصر شمیم صاحب کی شخصیت کھری اترتی ہوئی نظر آئی۔ محترم قیصر شمیم کا حلقۂ اکتسابان و شاگردان ان کے دل کی کشادگی کے مساوی ہے کہ اس میں جامی اور تلسی والے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی استاذ شخصیت حقیقی معنوں میں استاذ الاساتذہ کے مصداق ہے، جنھیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ 3/ستمبر 2021 کو 86 سال کی عمر میں ان کی روح قفس عنصری سے آزاد ہوئی تھی جبکہ وہ غلام ہندوستان کے صوبہ بنگال کی سرزمین پر 2/اپریل 1936 (اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق) کوانکس، ضلع ہگلی میں تولد ہوئے تھے۔ محترم قیصر شمیم اُس دیے کی مانند تھے جس کی لو تا حیات مدھم نہیں ہوئی۔ ایسی عبقری شخصیت خال خال ہی نظر آتی ہے۔ میرے عنوان سے چونکنے والوں کو اب تک واضح ہو ہی گیا ہوگا کہ خاکسار علی شاہد دلکش نے متذکرہ باوقار علمی و ادبی شخصیت کو خوشبو بانٹنے والا یوں ہی نہیں لکھا ہے۔ اپنی عملی و علمی زندگی میں قیصر شمیم (اصل نام عبدالقیوم خان) اردو ادب کے ایک تعطر آمیز سایہ دار شجر کی مانند تھے۔ اس علمی و ادبی شجر کے گل کی خوشبو، بشکل بوئے شمیم اپنے گرد و نواح کو محض معطر ہی نہیں کرتی رہی بلکہ شجر شمیم اپنے مجسمہ اور متعلقہ افراد کو خوب خوب مستفید و مستفیض بھی کرتے رہے۔ بقول قیصر شمیم۔

ہم نے تو کیا، جو بھی کرنا تھا قیصر
معلوم ہے، کیا اس کا صلا دے گا زمانا

موصوف کے والد مرحوم جناب عبدالرحیم خاں ایک کارخانے میں ملازم تھے۔ قلیل آمدنی کے سبب قیصر شمیم کو کم عمری سے ہی چھوٹی موٹی ملازمت سے جڑنا پڑا۔ انھوں نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز انگلش بوائز پرائمری اسکول سے کیا اور اپنی ابتدائی تعلیم چاپدانی میونسپل پرائمری اسکول سے مکمل کی۔ ملک کی آزادی سے قبل 1946 کے فرقہ وارانہ فسادات کے زمانے میں آپ پریسی ڈنسی مسلم ہائی اسکول میں درجہ ششم کے طالب علم تھے۔ ناسازگار حالات کے سبب کچھ دنوں کے لیے انھیں تعلیم ترک کرنا پڑی پھر شیام نگر 24 پرگنہ کے گرولیہ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ ابھی درجہ نہم ہی میں تھے کہ گھر کی مالی مشکلات کے سبب اسکول چھوڑنا پڑا اور بہ حالت مجبوری کلکتہ کے ایک چھوٹے سے مدرسے میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ البتہ ملازمت سے جڑنے کے باوجود تعلیم سے قلبی لگاؤ ہمیشہ رہا۔ چنانچہ 1952 میں ہگلی ہائی مدرسہ میں داخلہ لیا اور یہیں سے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے 1953 میں پاس ہی نہیں کیا بلکہ مغربی بنگال ہائی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے ایک ریکارڈ بھی بنا ڈالا۔ پھر مولانا آزاد کالج سے آئی۔ اے فرسٹ ڈویژن 1955 میں پاس کیا اور کلکتہ یونیورسٹی سے 1963 میں بی اے اور 1965 میں ایم۔ اے (فرسٹ کلاس) کیا۔

قیصر شمیم عوام و خواص کے چہیتے تھے۔ مزدور کے بیٹے تھے۔ مزدوروں کی بستی میں آنکھیں کھولیں، جہاں گندگی کے ملبے ارد گرد پڑے رہتے۔ مزدور فیملیز کے درمیاں پلے بڑھے۔ کیچڑ میں کنول کھلنے کے مترادف ان کی شخصیت پروان چڑھی۔ بقول قیصر شمیم:

''مجھے یاد ہے کہ جوٹ مل کے جس علاقے میں میں پیدا ہوا تھا وہاں جی ٹی روڈ کے ایک طرف مزدوروں کی بستی تھی جس میں مرغیوں کے ڈربوں جیسے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ ان میں اکثریت بانس اور مٹی سے بنے ہوئے ایسے گھروں کی تھی جو بیشتر اوقات بوسیدہ رہا کرتے تھے۔ میاں بیوی، بیٹے بیٹیاں، پورا خاندان ایک ہی گھر میں ٹھسا پڑا رہتا تھا اور گھٹ گھٹ کر اسی طرح زندگی گزارتا تھا۔''

(پہاڑ کاٹتے ہوئے، قیصر شمیم، ص 14)

کثیر الجہات علمی و ادبی شخصیت ہونے کے سبب ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کثیر رہی ہے۔ نتیجتاً

سرِعام زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے کے علاوہ رازدارانہ طور پر اصلاح لینے والے ادبی و علمی اشخاص کا آنا جانا بھی ان کے یہاں خوب لگا رہتا۔ اس وجہ سے ان کے گھر کا ایک حصہ تو لوگوں کی آمد و رفت سے روشن رہتا مگر اندرونِ خانہ کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہوتا! دوسرے لفظوں میں آنے والوں کے ظاہری اخلاص سے ان کا چہرہ اور جبیں تو درخشاں رہتے لیکن چشم بینا ہونے کی وجہ سے اندرون جسد و قلب کا منظر کچھ اور ہوتا۔ تاہم ماتھے پہ کبھی کسی نے بھی شکن نہیں دیکھا۔ مزید برآں ممکن ہے دُنیا کی دُھوپ چھاؤں میں بہت سے رشتوں اور مراسمِ التفات کے مصلحت کا عقدہ بھی کھلا ہو۔ تب ہی تو ان کیفیات کا اظہار موصوف نے اسی غزل کے دیگر زیرِ نظر اشعار میں احسن طریقے سے کیا ہے۔

اس کے آنگن میں روشنی تھی مگر
گھر کے اندر بڑا اندھیرا تھا
دکھ میں آخر یہ کھل گیا قیصر
نام اِک مصلحت کا رشتہ تھا

موسم تو بدلتے ہیں لیکن کیا گرم ہوا کیا سرد ہوا
اے دوست ہمارے آنگن میں رہتی ہے ہمیشہ زرد ہوا

اس شجر سایہ دار و ثمر دار کی شخصیت (جس سے ان گنت لوگوں نے کسبِ فیض کیا) کے دفعتاً گر جانے سے نہ پُر ہونے والا خلا پیدا ہوا ہے۔ یہ بنگال کی علمی و ادبی فضا کے لیے بڑا المیہ نیز اندوہ آمیز امر ہے۔ چونکہ قیصر شمیم صاحب نے چھیاسی سال کی عمر پائی ہے۔ لہذا ان کا علمی و ادبی سفر زائد از پانچ دہائیوں پر محیط ہے۔ انھوں نے ہگلی ضلع کے چاپدانی/انگس میں اولین عصری علمی گہوارہ 'ادبی سوسائٹی' کی بنیاد رکھی۔ علاوہ ازیں ادبی ادارہ 'ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن' کی بنیاد 16/ ستمبر 1966 کو رکھی۔ تاحیات اس کے سرپرست رہے۔ حضرت نے ہوڑہ مسلم ہائی اسکول، کلکتہ کے سی ایم او ہائی اسکول، مولانا آزاد کالج، کلکتہ یونیورسٹی اور عالیہ یونیورسٹی میں اپنے علم سے متعدد ذہنوں کو منور کیا ہے۔

قیصر شمیم لسانی ادب کے بھی اس روشن و تابندہ ستارے کی مانند ہیں جو آسمان ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ موصوف نے ادب کی کئی اصناف پر طبع آزمائی ہی نہیں کی بلکہ مہارت بھی رکھتے تھے۔ وہ اربابِ اردو کے ساتھ ہندی، بنگلہ اور انگریزی ادب کے اسیری کی معاونت و خدمات میں سرگرداں رہتے۔

آپ کی علمی و ادبی استعداد کا ہر کوئی لوہا بھی مانتا رہا اور ہنوز قائل بھی ہے۔ ان کی بے پناہ صلاحیتوں سے بشمول اہل اردو ادب، ہندی ادب کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی محض اکتسابِ فیض ہی نہیں کیا بلکہ بہتوں نے باقاعدہ مستقل شاگردی بھی اختیار کرلی۔ یہ امر اس بات کا غماز ہے کہ وہ بیک وقت اردو نیز ہندی حلقۂ ادب میں یکساں مقبول تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (کتابی سلسلہ دستخط، بارکپور۔ 'قیصر شمیم نمبر' کے مطابق) بشمول ادبا، شعرا اور شاعرات ان کے تلامذہ کی تعداد بنگال و بیرونِ ریاست اندازہً سو (100) سے زائد ہے۔ ان کا تعلق شاعری، ڈراما، افسانہ، ناول، انشائیہ، سیر و سیاحت، طنز و مزاح، تنقید و تحقیق اور ادب کی دیگر اصناف سے ہے۔ آپ نے متعدد نسلوں کی آبیاری کی۔ آپ دبستانی حیثیت کے حامل اردو زبان کے معروف استاذ، شاعر اور ادیب رہے۔ ان کی قابل ذکر ادبی خدمات طویل عرصے پر محیط ہے۔ ڈاکٹر خالدہ حسینی اپنے ایک مضمون 'تو آں شا' میں یوں لکھتی ہیں:

قیصر شمیم لسانی ادب کے بھی اس روشن و تابندہ ستارے کی مانند ہیں جو آسمان ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ موصوف نے ادب کی کئی اصناف پر طبع آزمائی ہی نہیں کی بلکہ مہارت بھی رکھتے تھے۔ وہ اربابِ اردو کے ساتھ ہندی، بنگلہ اور انگریزی ادب کے اسیری کی معاونت و خدمات میں سرگرداں رہتے۔ آپ کی علمی و ادبی استعداد کا ہر کوئی لوہا بھی مانتا رہا اور ہنوز قائل بھی ہے۔

''آپ نے بیک وقت شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیائے ادب میں قدم رکھا۔ آپ کی پہلی نظم نما غزل بہ عنوان 'حالات' 1951 میں کلکتہ کے ہفتہ وار 'ساگر' میں شائع ہوئی اور آپ کی پہلی کہانی 'وہ لڑکی' بھی 1951 میں دہلی کے ویکلی 'پارس' میں شائع کی گئی۔ (مشمولہ دستخط، ص118)

واضح ہو کہ قیصر شمیم ابتدا میں 'عمید انگیسی' کے نام سے تخلیق، تصنیف اور تالیف کیا کرتے تھے تاہم اکثر ان کا نام 'عمید' کی جگہ 'حمید' شائع ہوجاتا تھا چنانچہ بقول ''مجاہد اردو'' (مرحوم ایم اے قاسم علیگ) انھوں (حضرت قیصر شمیم) نے اپنے ایک کولیگ colleague، جناب مظہر امام کی تجویز پر اپنا ادبی نام 'قیصر شمیم' رکھا۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ادبی روبوٹ کی مانند انتھک محنت اور علمی و ادبی کاوشیں کرتے رہے لیکن کبھی بھی ان کے چہرے یا لہجے سے تھکاوٹ کا نام و نشان ظاہر نہ ہوتا۔ اپنی ذاتی عملی فطرت کے پیرائے میں موصوف نے کیا خوب کہا ہے، جو دوسروں کے حوصلے کو بھی جلا بخشنے کا کام کرتی ہے۔ قیصر شمیم کہتے ہیں

تھکن تو راہ کا ایک موڑ ہے، ٹھہرنا کیا
اسی خیال سے پھر اٹھ کے چل پڑا ہوں میں

قیصر شمیم کی پوری عمر مغربی بنگال کی سرزمین پر اردو ادب بالخصوص شاعری کی ریاضت میں گزری ہے۔ ان کی شاعری نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہے جو گہرائی و گیرائی سے مزین ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ذات کے علاوہ سماج و معاشرے اور کائنات کے اسرار و رموز سے بھی اپنا رشتہ استوار کیا ہے۔ موصوف اپنی شاعری کے متعلق کچھ اس طرح کا خیال رکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''میری شاعری نہ آبا و اجداد کا ورثہ ہے نہ استاد کا عطیہ، شاعری میرا پیشہ بھی نہیں ہے اور سنڈے پینٹرز کی اتوار کا مشغلہ بھی نہیں میرے نزدیک شاعری 'ساعتوں کے سمندر' میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کے عمل سے ملتا جلتا ایک عمل ہے لیکن سخت تر اور لطیف۔'' (ساعتوں کا سمندر، قیصر شمیم، ص6)

قیصر شمیم نے کم و بیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جن میں غزل، نظم، گیت، دوہا، رباعیات، قطعات، حمد، نعت، تضمین وغیرہ شامل ہیں وہیں دوسری طرف تنقیدی مضامین اور تراجم وغیرہ کو بھی انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا جو ان کی اردو کے ساتھ ہی ساتھ دوسری زبانوں مثلاً بنگلہ، ہندی اور انگریزی پر مکمل دسترس کا ثبوت ہے۔ محمد طیب نعمانی (کوآرڈینیٹر اینڈ انچارج پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو، بھیرب گانگولی کالج، بیلگھریا، کولکاتہ) اپنے مضمون بہ عنوان 'قیصر شمیم: اردو

ادب کا نابغہ روزگار' میں رقم طراز ہیں:

''اپنے نوجوانی کے دنوں میں آپ (قیصر شمیم) نے مشاعرے میں جب زیر نظر شعر پڑھا تو صدر مشاعرہ پرویز شاہدی نے اس شعر کو ان سے کئی بار پڑھوایا۔'' (روزنامہ عوامی نیوز، کولکاتا، 23-5-21)

موت کا جس پہ اختیار نہیں
ہم نے وہ زندگی بھی دیکھی ہے

واضح ہو کہ قیصر شمیم کی نصف درجن سے زائد تصانیف و تالیفات ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ متفرق درسی کتابیں اور تراجم بھی ان کے حصے میں ہیں۔ ان چند

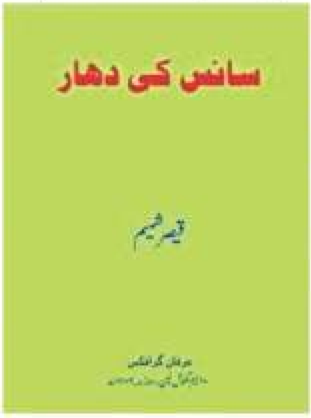

قابل ذکر تخلیقات و ادبی خدمات پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو سال 1971 میں 'ساعتوں کا سمندر'، 1989 میں 'اردو ادب پر ذرائع ترسیل عامہ کے اثرات'، 1996 میں 'تری دھارا'، 1997 میں 'سانس کی دھارا'، 1998 میں 'پہاڑ کاٹتے ہوئے'، اور 2020 میں 'زمین چیختی ہے'، نایاب تحفہ ادب ہیں۔ یہ حلقہ ادب میں داد و تحسین وصول کرتے ہوئے ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ سال 1974 میں حضرت والا کے نام 'دھند اور کرن'-(شمس صابری صاحب کے افسانوں کی تدوین وترتیب) کی تالیف بھی ہے۔ ادبی تاریخ ہے کہ بارکپور سے مدیر محترم اختر بارکپوری کی ادارت اور مرتب فراغ روہوی (مرحوم) کی مشترکہ کاوشوں سے 'دھنک رنگ' جذبوں کا نمائندہ، کتابی سلسلہ 'دستخط' بارکپور نے 'قیصر شمیم نمبر' کی کامیاب اشاعت کی۔ واضح ہو کہ 1999 میں ہگلی گورنمنٹ ہائی مدرسہ (ہائر سکنڈری) کے ہیڈ ماسٹر محترم ناصر علی انصاری نے 'قیصر شمیم کا ادبی شعور' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر بابا بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی، مظفر پور (بہار) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹر ناصر علی بنے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر غلام جیلانی نے بھی قیصر شمیم کی حیات وخدمات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر جموں یونیورسٹی، جموں کشمیر کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کرنے کے لیے باور کیا۔ نتیجے میں 2020 میں 'قیصر قیصر ادب' نامی کتاب بھی منظر عام پر آئی۔ متذکرہ تحقیقی مقالوں میں موصوف کی تخلیقی، نثری اور شعری ذخیرہ' ادب پر سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔ موصوف کے کئی اچیومنٹ میں ایک اہم یہ بھی ہے کہ قیصر شمیم صاحب مئی 2002 تا اگست 2005، مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ مگر رعب داری اور زعم برتری سے بعید سادگی پسند دیکھے گئے۔ واقعی ایسے بڑے لوگ بڑے ہوتے ہیں۔ ان کی طرز رہائش، گزر بسر اور شعری خدمات سے جگ ظاہر ہوا کہ موصوف نے شاعری محض کیا ہی نہیں بلکہ جیا بھی ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ہی ایک شعر میں یوں کہا ہے۔

سبز موسم سے مجھے کیا لینا
شاخ سے اپنی جدا ہوں بابا

وہی پیاس کا منظر وہی لہو قیصر
ہنوز پھرتی ہے کوفے کی نہر آنکھوں میں

قیصر شمیم صاحب خاندانی شریف النفس تھے۔ وضع داری اور خاندانی رکھ رکھاؤ آپ کی سرشت میں شامل تھی۔ آپ اپنوں کی سازشوں کے شکار بھی ہوئے اور کم علم و بد اخلاق لوگوں سے نبرد آزما بھی رہے۔ بعض اوقات اقارب کے تو تا چشم ہونے پر کبیدہ خاطر ہونا فطری عمل ہے مگر جب ان سخت گیر مراحل سے ان کا گزر ہوا تب بھی شرافت کا دامن تھامے نظر آئے۔ کیونکہ ان کی گھٹی / سرشت میں بوئے عشق و محبت تھی۔ یہی وجہ ہے تاعمر موصوف سراپا سیکولر محبت کی صورت مورت بنے رہے۔ ورنہ اب تو عشق و محبت نیز اخلاص و محبت میں بھی تنگ ذہنی اور تعصب کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ متذکرہ بالا باتوں کے مدنظر قیصر شمیم صاحب کے متفرق اشعار سے محظوظ ہوں۔

ہوئے نہیں کبھی آمادہ ترکِ وفا پر
قیصر یہی ایک چیز تو گھٹی میں پڑی ہے

خفا ہوئے بھی کسی سے تو کیا کیا ہم نے
بہت ہوا تو رہا دل کا قہر آنکھوں میں

سازشیں اپنوں کی یاد آئیں گی
کیا کہوں کس کس کو پرایا دیکھا

کوئی گلہ تو نہیں پھر بھی گردش دوراں
کسی کا آنکھ بدلنا ہمیں کو ہے معلوم

حضرت قیصر شمیم نے ویسے تو سماج و معاشرے کے تقریباً ہر مسئلے کو اپنے قلم اور اپنے کلام کے ذریعے اجاگر کیا۔ نسلی تفاوت، سماجی گھٹن، طبقاتی شعور، جذباتی ناآسودگی، معاشرتی درجہ بندی اور نفسیاتی عوامل کے پس منظر میں تحریر کردہ ان کی تخلیقات متوسط طبقے کی نمائندگی کرنے کے ساتھ اعلیٰ طبقے کی قلعی بھی یوں کھولتی ہیں۔

میرے عہد کے انسانوں کو پڑھ لینا کوئی کھیل نہیں
اوپر سے ہے میل محبت، اندر سے ہے کھینچاؤ بہت

لفظ کی سطح سے گہری ہیں بہت سی باتیں
ہم بھی کچھ عرض کریں کوئی سخن فہم تو ہو

ایسا تو ممکن ہی نہیں کہ چاند میں کوئی داغ نہ ہو
جس میں ہوگی کچھ بھی خوبی، اس میں ہوگی خامی بھی

چلوں زمانے کے ہمراہ کس طرح قیصر
ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ

توقعات کے مطابق قیصر شمیم متعدد اعزازات وانعامات سے بھی نوازے گئے، جن میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ (1996)، بنگلہ رسالہ 'ابھیو اگرنی' سنیہہ لتا چودھری میڈل (1997)، 'سانس کی دھار' پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا انعام (1997)، 'پہاڑ کاٹتے ہوئے' پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا انعام (1998)، بھارتیہ بھاشا پریشد کلکتہ کا سلور جبلی اعزاز (1999) وغیرہ اہم ہیں۔

ہمارے جسم کو موجیں نگل گئیں قیصر
کہ ساعتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

■

Ali Shahid Dilkash
Vill.: Harinchawra, P.O: Ghughumari
Cooch Behar- 736170 (West Bengal)
Mob.: 8820239345
alishahiddilkash@gmail.com

محمد اسد اللہ

نوابِ محمد عبدالوحید غازی آف گیوردھا

اردو زبان و ادب کی ترویج وبقا یوں تو عوام الناس کی محبت و اپنائیت کا ثمرہ ہے،مگر حکومتِ وقت کے سربراہوں کی دلچسپی اور اعانت نے بھی اس زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بعض حکمرانوں اور صاحبِ اثر ہستیوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اس زبان کی آبیاری کی ہے،ایسی مقتدر شخصیات میں مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اور دکن کے فرمانروا قلی قطب شاہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مختلف ریاستوں میں ایسی ادب دوست شخصیات کے نام تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں ان میں ایک نام نواب غازی آف گیوردھا کا بھی ہے۔

بیسویں صدی کے ودربھ کے شعرا میں عکاسِ فطرت،نواب غازی آف گیوردھا کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے؛ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے، اس سخنوری کا فیضان اردو زبان تک محدود نہ تھا۔ انھوں نے فارسی، ہندی اور انگریزی زبانوں کی مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر کے شاعری کا بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ نہ صرف ناگپور بلکہ ملک بھر کے مشاعروں میں انھیں شرکت کے لیے مدعو کیا جاتا تھا، جہاں وہ صدر مشاعرہ کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ نواب غازی اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور خوبیوں کے سبب جانے جاتے ہیں۔ ان کی حمدیہ و مناجاتی شاعری ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھیں کئی زبانوں مثلاً عربی، فارسی، انگریزی، اردو، ہندی، گونڈی اور مراٹھی بولنے اور لکھنے پر پوری قدرت حاصل تھی۔انھوں نے عربی زبان میں روزنامچہ لکھا اور علاقائی گونڈی زبان کی گرامر بھی مرتب کیا تھا۔

نواب محمد عبدالوحید غازی آف گیوردھا 21 اکتوبر 1907 کو بڑگاؤں میں پیدا ہوئے۔ غازی ان کا تخلص تھا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے بڑے بھائی محمد عبدالحمید جو علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے، انیس سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ان کی ایک ڈائری پر لفظ غازی لکھا ہوا دیکھ کر بھائی کی یاد میں نواب صاحب نے اسے بطور تخلص اختیار کیا۔ نواب محمد عبدالوحید غازی کے آبا و اجداد شاہ عالم کے عہد میں کشمیر سے وسطِ ہند منتقل ہوئے اور بھوسلہ راجہ کے ماتحت پرگنہ ویراگڑھ کے دیوان مقرر ہوئے تھے حقِ خدمت کے صلے میں انھیں گیوردھا کی زمینداری ملی۔ گیوردھا اس وقت گڑھ چرولی ضلع میں ایک چھوٹا سا دیہات ہے۔اسی دیہات کے نام سے گیوردھا اسٹیٹ کہلائی۔ ابتدا میں اس اسٹیٹ کا رقبہ 160 مربع میل تھا۔جس میں ایکسٹھ گاؤں تھے۔ 1854 کو بھوسلہ حکومت سلطنت برطانیہ کی قلمرو میں شامل کر لی گئی۔لیکن برطانیہ حکومت نے چند چھوٹی ریاستوں کو بحال رکھا ان میں گیوردھا اسٹیٹ بھی تھی۔ آپ کے جدِ امجد محمد بہاء الدین اور والد بزرگوار محمد زین الدین صاحب نے حسنِ انتظام کے ذریعے اس زمینداری کو بہت ترقی دی۔

(نواب محمد غازی حیات اور علمی خدمات: ڈاکٹر سید عبدالرحیم، کلمات 1995، ص 141)

نواب محمد عبدالوحید غازی کی ایک بہن بھی نوعمری میں انتقال کر گئی تھی۔نواب غازی ابھی پانچ سال کی عمر ہی کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا والدہ حفیظ بیگم نے بڑی شفقت سے آپ کی پرورش کی حکومت برطانیہ آپ کو لندن میں تعلیم دلوانا چاہتی تھی لیکن آپ کی والدہ اس بات پر راضی نہ ہوئی۔ آخر خان بہادر ایچ ایم ملک صاحب کی ایما پر انجمن ہائی اسکول میں داخلہ کروایا گیا۔انجمن کے ہوسٹل میں گورنر کی خصوصی نگرانی میں آپ کو رکھا گیا۔دورانِ تعلیم انھیں سپہ گری کی بھی مشق کروائی جاتی۔ گیوردھا اسٹیٹ کے نظم ونسق کے لیے اردو کے بلند پایہ صاحب دیوان شاعر حضرت زیبا کوٹی (بی اے علیگ) کو مینیجر مقرر کیا گیا۔

1927 میں نواب صاحب کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا،البتہ علمی و ادبی مشاغل جاری رہے۔ آپ نے اپنے استاد سے شاعری کے رموز و نکات کے بارے میں تین برس تک استفادہ کیا۔اسی طرح ایک راجستھانی عالم مولوی نور الحق سے فارسی میں مہارت حاصل کی اور ایک گروجی سے ہندی بھی سیکھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سب حضرات نے غازی صاحب کو خاطر خواہ فیض پہنچایا۔

1939 میں نواب غازی گیوردھا اسٹیٹ سے شہر

ناگپور کے قریب واقع کامٹی میں منتقل ہوگئے۔ وہاں کنہان ندی کے کنارے ایک خوبصورت بنگلہ خریدا جس کا نام 'کاشانہ' رکھا۔ اس میں ان کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں موجود کتابوں کے وقیع ذخیرے سے نواب صاحب کے علمی وادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ اس علاقے میں افسانہ نگاری کے پیش رو معروف ادیب عبدالستار فاروقی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ نواب صاحب ان کے رسالے ہفتہ وار 'الفاروق' کی سرپرستی فرماتے رہے۔ 1964 میں وہ کامٹی سے شہر ناگپور آگئے اور علاقہ مانکاپور میں انھوں نے ایک وسیع و عریض بنگلہ خرید کر اس کا نام 'باغ منزل' رکھا۔ تادمِ آخر وہ وہیں قیام پذیر رہے۔ 6 فروری 1979 کو نواب غازی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

نواب غازی کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ ایک خدا ترس انسان تھے۔ اپنے علاقے کے نظم ونسق کو سنبھالنے والے اس شخص کے سینے میں ایک شاعر کا دل تھا۔ وہ آسودگی اور ہر طرح کے سامان عیش مہیا ہونے کے باوجود شانِ بے نیازی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ وہ مذہبی اور اخلاقی قدروں پر پختہ یقین رکھتے تھے ان کی شخصی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالرحیم لکھتے ہیں:

مبدائے فیاض سے نواب صاحب نے حافظہ بھی بلا کا پایا تھا۔ مولانا محمد خاں صاحب اور عبداللہ عرب سے آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ عبداللہ عرب عربی النسل تھے۔ ان سے عربی میں گفتگو کرتے، حضرت زیبا کوٹی کی تعلیم و تربیت نے ان میں شعری ذوق پیدا کر دیا تھا۔ آپ کے تلامذہ میں شاطر حکیمی خورشید تابش نوید بلاس پوری اختر نظمی ڈاکٹر رندھیر اور جعفری صاحب قابلِ ذکر ہیں نواب صاحب صوفی منش انسان تھے۔ تصوف سے آپ کو گہرا لگاؤ تھا۔ گیوردھا اسٹیٹ میں آپ نے ایک خانقاہ تعمیر کی تھی جہاں ذکر وفکر کا مشغلہ تھا۔ بزرگانِ دین سے گہری عقیدت مندی تھی خصوصاً بابا تاج الدین اولیا سے بہت گہرا تعلق تھا۔ معمولات کی بڑی پابندی تھی۔ جو ظاہر تھا وہی باطن۔ مذاق میں بھی کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ قرآن کریم سے بڑا تعلق تھا۔ نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کا اہتمام کرتے اور سونے سے قبل کچھ آیتیں ضرور پڑھتے۔ عسکری صفات کے حامل اور داد و دہش کے پیکر تھے۔ علمی مجلس میں بلا سند نہ کوئی بات کہتے نہ کسی کی بات قبول کرتے۔ سند حاصل ہونے کے بعد فوراً اپنی بات سے رجوع کر لیتے چاہے وہ سند کسی شاگرد کی جانب سے ملی ہو۔ (ایضاً،ص142)

نواب غازی کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے علاوہ ایسے موضوعات پر مشتمل ہے جو تصوف سے قریب تر ہیں۔ اس دور کے مسلمانوں کی زبوں حالی پر اپنے رنج وغم کا اظہار بھی انھوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ نواب غازی کے محدود صفحات پر مشتمل چند شعری مجموعے شائع ہوئے جن کے نام حسب ذیل ہیں۔ نوائے نیم شب، ذکر و فکر۔ مزد و خدمت اور ارتقا اور تخیلات۔ ان کے علاوہ نواب غازی کا مجموعۂ کلام 'گلستان معرفت' جو 102 صفحات پر مشتمل ہے 1932 میں منظرِ عام پر آیا۔ کتاب کے ابتدائی صفحے پر 'تخیلات معجز نشاں' کے ذریعے اس کے سالِ اشاعت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ 'نوائے نیم شب' آپ کی دعائیہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ 'گلستانِ معرفت' میں 1923 سے 1932 تک کلام موجود ہے۔

نواب غازی کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خواجہ میر درد اور علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے اسلامی تصوف کا گہرا اثر ان کے کلام پر نظر آتا ہے۔ نواب غازی کی شاعری میں مذہبی اخلاقی موضوعات پر نظمیں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ 'گلستانِ معرفت' میں غزلوں کے مقابلے میں منظومات کی تعداد زیادہ ہے۔ چند نظموں کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں۔ مجاہدِ اسلام، بختِ نارسا، رہنمایانِ گمراہ، درسِ روحانیت، دردِ دل، جبر و اختیار اور برسات کی شام وغیرہ

گلستان معرفت کا آغاز جس حمد سے ہوتا ہے اس کے تقریباً سبھی اشعار خوبصورت تلمیحات سے مزین ہیں۔

پژمردہ دل ہزاروں تو نے کھلا دیے ہیں
یعقوب جیسے لاکھوں روتے ہنسا دیے ہیں
نارِ خلیل دم میں گلزار ہوگئی تھی
آتش کدوں سے تو نے گلشن بنا دیے ہیں
دارِ مسیح کیا تھی اک زینۂ فلک تھا
سولی چڑھا کے لاکھوں زندہ بچا دیے ہیں
زراتِ رنگ ابھرے قطراتِ موج بن کر
زمزم سے لاکھ چشمے تو نے بہا دیے ہیں
دریا نے خشک ہوکر موسیٰ کو راہ دے دی
موجِ کرم نے تیرے قلزم ہٹا دیے ہیں
مچھلی بھی بن گئی تھی یونس کے حق میں کشتی
ساحل پہ تو نے کتنے بیڑے لگا دیے ہیں

(مطبوعہ گلستانِ معرفت: نواب محمد غازی، 1923، ناگپور، ص1)

نواب محمد غازی کی شاعری کے متعلق اظہارِ خیال

کرتے ہوئے حافظ محمد ولایت اللہ، گلستانِ معرفت' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

نواب محمد غازی اپنے صوبے کے ایک دقیقہ رس اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ آپ کا کلام بحیثیت مجموعی معارف وحقائق کا ایک گنجینہ ہے۔ جس میں حیاتِ انسانی کے مختلف نازک اور اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ موسیقیت، شعری اور تمام اصنافِ سخن کو نمایاں رکھتے ہوئے فلسفیانہ مضامین کو جس خوبی اور قادر الکلامی سے تمثیلی پیرائے میں واضح کیا ہے اسے وہی خوب سمجھ سکتا ہے جس کی نگاہ جناب غازی کی طرح غائر اور نکتہ رس ہو۔ (مقدمہ عالی جناب خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ صاحب، مطبوعہ گلستانِ معرفت: نواب محمد غازی، 1923، ناگپور ص۔ب)

نواب غازی کی غزلوں میں جہاں نازک خیالی، حالات کی زبوں حالی کا تذکرہ اور عشق ومحبوب کا بیان اس عہد کی شعری روایات کی پاسداری کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہیں ان کی منظومات میں عشقِ حقیقی اور تصوف کی جھلک نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نے ان کی شاعری میں پائے جانے والے مذہبی افکار کو حمد اور مناجات کے تناظر میں دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''نواب غازی کی حمد وثنا میں فکر وخیال کی گہرائی وگیرائی، تخیل کی بلند پروازی اور علمیت پوری آن بان شان کے ساتھ نظر آتی ہے۔ انھوں نے بعض نئی لفظیات اور نئی تراکیب کا بھی استعمال کیا ہے۔ اور خدا کی توحید اور اس کی ربوبیت کو ظاہر کرنے کے لیے نئے نئے خیالات بھی پیش کیے ہیں۔''

(ڈاکٹر شرف الدین ساحل: درمعانی، مطبوعہ، 2022، ناگپور، ص 24)

نواب غازی کی غزلوں میں روایتی مضامین او رواردات قلبی کا بیان پر اثر انداز میں ہوا ہے۔ ان میں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں تصوف کے زیر اثر دنیا سے بے گانگی کا اظہار کیا گیا ہے اور ان میں محبوب کی بے اعتنائی کا شکوہ بھی ہے۔

سنبھل کر تیغ اے قاتل لگانا میری گردن پر
کہیں اس خونِ ناحق کا لگے دھبہ نہ دامن پر
پیوندِ خاک ہونا انجامِ زندگی ہے
کیا دردناک اللہ انجامِ زندگی ہے
بجلیاں ابر نے لا لا کے گرادیں لاکھوں
ہم نے چاہا جو کبھی گھر کا چراغاں ہونا

قصۂ درد کے اظہار پہ ہنس کر بولے
بات کرنے کا سلیقہ کوئی تم سے سیکھے
بے وفائی کا نہ کر بلبلِ ناشاد گلہ
پھول کے چاک گریباں کو ذرا دیکھ تو لے
دیکھ مشاطگی زلف نہ کر بادِ صبا
اور الجھیں گے یہ گیسو تیرے سلجھانے سے

'گلستانِ معرفت' میں اردو کے علاوہ فارسی کلام بھی موجود ہے۔ ایک فارسی نظم، بہ عنوان، 'قصیدہ بتقریب تہنیتِ شفا یابی مَلِکِ معظم حضور شہنشاہ جارج پنجم فرمانروائے انگلستان وہند' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تا حشر زندہ باد شہنشاہ انگلستان
بر ما نگاہ او است نگاہِ خدا براں
باشند شاد کام محبانِ پادشاہ
پسپا شکست خوردہ فنا باد دشمناں
غازی بجیرتم چہ دعائے کند گدا
مستغنی از دعاست خداوست حکمراں

(مطبوعہ گلستانِ معرفت: نواب محمد غازی، 1923، ناگپور ص 43)

نواب غازی نے رباعیات کا ایک قلمی نسخہ بھی چھوڑا ہے جس میں 749 رباعیات موجود ہیں۔ ان میں فارسی رباعیات بھی ہیں۔

اپنی موت سے قبل تحریر کی گئی ایک فارسی رباعی میں انھوں نے مرض الوفات کے حالات پر صبر وشکر کا اظہار کیا ہے۔

شاکی نیم ارچہ درد مندم کردی
بہراف وآہ کار بندم کردی
چشمے ز تو شاہ التفاتے باشد
نادم بنواز شی کہ خرسندم کردی

نواب غازی نے ہندی شاعری میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ انھوں نے اس زبان کی ادبی روایات اور متعلقہ اصناف کی شعریات کو بخوبی سمجھتے ہوئے اپنے خیالات کو شعری پیکر عطا کیا تھا۔ چند نظموں کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

لوبھ ترنگیں بھاری بھاری
پھنس گئے پاپ بھنور نر ناری
پربھو راکھیں لاج ہماری
ڈوب نہ جائیں پاپی سارے

> نواب غازی کی حمد وثنا میں فکر وخیال کی گہرائی وگیرائی، تخیل کی بلند پروازی اور علمیت پوری آن بان شان کے ساتھ نظر آتی ہے۔ انھوں نے بعض نئی لفظیات اور نئی تراکیب کا بھی استعمال کیاہے۔ اور خدا کی توحید اور اس کی ربوبیت کو ظاہر کرنے کے لیے نئے نئے خیالات بھی پیش کیے ہیں۔

گانٹھ میں جب تک دمڑی ہے
لوگ پکاریں بابوجی
دام درم جب جات رہیں
سدھ بدھ نہ بچارے کوئی

پیت کا گاوے گیت کوئی
کوئی کہے میں بلیہاری
اوسر پاکر وار کرے
دھر دے جھٹ کنٹھ کٹاری
بس دیکھ چکے ہم بھائی
سب کھوٹی ہے یہ نگری

نواب غازی کی شاعری جہاں ان کے ذاتی جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہے وہیں ان کے عقائد اور خدا کی ذات وصفات پر پختہ یقین کا شاعرانہ اظہار بھی ہے۔

■

Mohd Asadullah
30, Gulistan Colony
Near Amrai Lance
Nagpur- 440013 (MS)
Mob.:9579591149
zarnigar2006@gmail.com

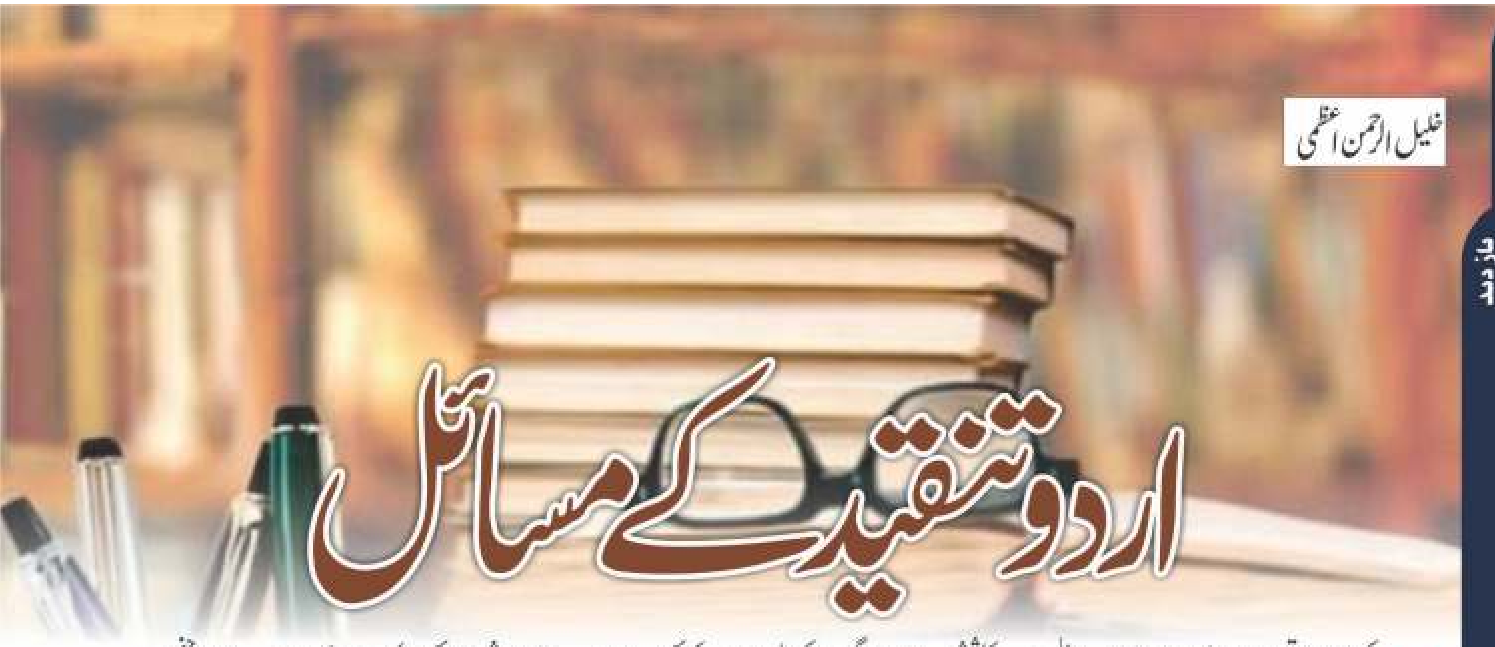

اردو تنقید کے مسائل

خلیل الرحمن اعظمی

دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں تنقید نے علم و ادب کی ایک اہم شاخ اور ایک علیحدہ فن کی حیثیت سے اپنی جگہ پیدا کرلی ہے۔ ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم جو ادب کو محض تفریح، دل بہلاوے اور وقت گزاری کی چیز نہیں سمجھتا بلکہ اسے انسانی تہذیب وتمدن کے اعلیٰ ترین مظاہر میں شمار کرتا ہے، وہ تنقید سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ایک زمانے تک یہ خیال عام تھا اور بعض لوگ اب بھی اسی طرح سوچتے ہیں کہ شعروادب کی تخلیق ایک پراسرار الہامی قوت کے زیراثر ہوتی ہے جو عقل وشعور کی گرفت سے باہر ہے، اس پر منطق و استدلال کا حربہ استعمال کرنا اس کی لطافت کو زائل کرنا ہے، ادب کو ایک زمانے تک جادو اور ٹونے ٹوٹکے کی قسم کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ شاعروں کو تلامیذ الرحمٰن کہا گیا۔ عربی زبان کی کہاوت تھی 'الشاعر کالمجنون' مجنون کے لفظی معنی وہ شخص جس پر جنون کا سایہ ہو۔ انسانی علم نے جہاں کائنات کے اور سربستہ رازوں کا پردہ فاش کیا اور فطرت کے بے شمار عقدوں کو حل کیا وہاں شعر و ادب کے پیچیدہ تخلیقی عمل کی گرہیں بھی کھولیں اور اسے اپنے شعور کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ ادب زندگی کی عکاسی یا آئینہ داری کرتا ہے یا ادب کا مقصد تنقید حیات ہے اس قسم کے فقرے اب اس قدر پیش پاافتادہ ہوچکے ہیں جس طرح یہ کہنا کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد چکر لگاتی ہے، لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ جب کہنے والے نے پہلی بار یہ بات کہی تھی تو اسے اپنے زمانے کا بہت بڑا باغی کہا گیا اور اس کے اس خیال کو کفر والحاد سے تعبیر کرکے اسے پھانسی پر لٹکایا گیا۔

ادب اور مادی زندگی کے رشتوں کو سمجھنے کی کوشش، مادی زندگی ہی کی طرح ادب کو بھی جامد اور اٹل ماننے کے بجائے متحرک اور ارتقا پذیر سمجھنا، مادی زندگی ہی کی طرح ادب میں مثبت ومنفی قوتوں کے تصادم و پیکار کے جدلیاتی عمل کو پہچاننے اور اس سے شعوری طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی فہم وبصیرت کو استعمال کرنے کا نام تنقید ہے۔ مڈلٹن مرے کہتا ہے کہ:

''جس طرح زندگی کا شعور واحساس فن ہے اسی طرح فن کا شعور واحساس تنقید ہے۔''

یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر شعروادب محض تک بندی یا قافیہ پیمائی، محض لفظی بازی گری، ذہنی عیاشی یا بیکاری کا مشغلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک باحواس اور سنجیدہ عمل ہے، تو ہر تخلیقی عمل کے ساتھ ایک تنقیدی شعور بھی کام کرتا ہے اور سب سے پہلے خود شاعر اور ادیب کی اپنی ذات میں ایک نقاد چھپا بیٹھا رہتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ نظم یا نثر کی کوئی تصنیف جب وجود میں آتی ہے، تو وجود میں آنے سے قبل مختلف مراحل سے گزرتی ہے، لکھنے والا ایک موضوع منتخب کرتا ہے، زندگی کے بے شمار مظاہر، احساسات اور تجربات میں سے چند کو چنتا ہے، پھر ان کی ترکیب و تعمیر کرتا ہے، ان میں ترمیم و تنسیخ، حک و اصلاح اور تراش خراش کرتا رہتا ہے۔ اپنے مسودے کو بار بار دیکھتا اور اسے ایک خاص معیار اور سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ کتنی ہی عرق ریزیوں اور جانفشانیوں کے بعد یہ تحریر اس قابل ہوتی ہے کہ خود فنکار کا دل اس سے مطمئن ہو۔ اس کا کہنا ہے ادیب کا یہ تمام عمل اس کے تنقیدی شعور کا ثبوت ہے۔ اسی لیے بار بار اس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اعلیٰ و قیع، زندہ اور پائیدار ادب کی تخلیق وہی ادیب کرسکتا ہے جو اعلیٰ درجے کے تنقیدی شعور کا بھی مالک ہو۔ خود روادیب وشاعر جنھیں زندگی سے کوئی سنجیدہ لگاؤ نہیں، جو مظاہر حیات کی پرکھ یا بصیرت نہیں رکھتے اور نہ جنھیں اپنے تجربات و احساسات کی تعمیر وتنظیم کا سلیقہ اور ہنر آتا ہے اور نہ ہی وہ اس ہنر کے لیے مشقت وریاضت کرتے ہیں، ان کا ادب بھی ویسا ہی حقیر، ناکارہ اور ناپائیدار ہوتا ہے۔ مختلف زبانوں کے تنقیدی ادب کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات چھپی نہیں کہ ادبی تنقید کا ایک خاصا بڑا حصہ ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے جو خود بھی تخلیقی ادیب تھے۔ انھوں نے اپنے مضامین، خطبوں، دیباچوں اور خطوں میں ادبی تخلیق کے متعلق جو بصیرت افروز رائیں دیں یا اپنے تجربات بیان کیے ہیں ان سے شعروادب کے ارتقا میں بڑی مدد ملی ہے۔ اسپنسر، ڈرائیڈن، کولرج، ورڈزورتھ، میتھیو آرنلڈ، شیلی، ہیزلٹ، گوئٹے، ایڈگرایلن پو، ٹی ایس ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ، سی ڈے لیوس، جے بی پریسلے، ای ایم فارسٹر، سامرسٹ مآم، سارترے، ٹیگور اور اردو میں حالی سامنے کے نام ہیں۔

یہاں آکر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور یہی دراصل فساد کی جڑ بھی ہے کہ جو شخص خود ادیب وشاعر ہے، جیسے شعر، افسانہ، ناول، ڈرامہ یا کسی اور تخلیقی صنف ادب کا ذاتی تجربہ ہے اس پر تو بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے تنقیدی خیالات کو قابل اعتنا سمجھا جاسکتا ہے لیکن جو شخص خود ادب کی تخلیق نہیں کرتا اور نہ اسے ان تمام مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جس سے ایک تخلیقی فنکار گزرتا ہے وہ کیسے ان مسائل کو سمجھ سکتا اور ان پر کوئی حکم لگا سکتا ہے۔ اس طرح کا سوال اٹھانے والے ایسے ادیب کے وجود کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں،

جو 'نقاد محض' ہے بلکہ بعض لوگ تو ایسے نقادوں کو ادیب ہی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو ادب میں بے جا مداخلت کرتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ادبی تخلیق کا اپنے آپ کو اہل نہ پا کر یا ادب کے میدان میں ناکام ہو کر تنقید کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ان کی حیثیت طفیلی کی سی ہے۔ یہ ادیبوں کے بل بوتے پر نام کمانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو کسی کی مدح سرائی کرتے ہیں اور ان کی تخلیقات کو

مقبول بنانے کے لیے ایسے مضامین لکھتے ہیں جن سے ان کے ممدوح کا اشتہار ہو یا کسی کی نکتہ چینی اور مخالفت کر کے اس کے کارناموں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی تصور کے ماتحت بہت سے ادیبوں نے نقادوں کے نام پر لعنت بھیجی ہے۔ کسی نے انھیں ادبی جونک کہا، کسی نے انھیں ان مکھیوں سے تشبیہ دی جو گھوڑوں کے اوپر بیٹھتی، انھیں پریشان کرتی اور کام کرنے سے روکتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک نقاد کا وجود ادب کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم نقاد محض کے متعلق کچھ اور کہیں، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تنقید کے نام پر لکھی ہوئی ہر تحریر شاعری یا ادب نہیں کہی جا سکتی۔ شاعری جب اپنے منصب سے گر جاتی ہے تو محض کلام موزوں ہو کر رہ جاتی ہے یا لفظوں کا کرتب، افسانہ اور ناول جب اپنے منصب سے گر جاتا ہے تو محض نثر کا ایک بے جان ٹکڑا ہوتا ہے یا پھر پمفلٹ بازی، کوک شاستر اور محض دل لگی کی چیز، اسی طرح تنقید جب اپنے منصب سے گر جاتی ہے تو مدح سرائی پروپیگنڈہ نکتہ چینی، تنقیص اور خوردہ گیری ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس طرح شاعروں میں متشاعر اور ادیبوں میں جعلی ادیب ہو سکتے ہیں، اسی طرح نقادوں کی صف میں بھی مفتی و مبلغ اور ادبی بہروپیے مل سکتے ہیں۔ جہاں تک نکتہ چینی، مخالفت اور کسی ادیب کی ادبی حیثیت کو تسلیم نہ کرنے کا سوال ہے وہ ہمیشہ نقاد محض ہی کی جانب سے نہیں ہوتی۔ خود شاعروں، ادیبوں اور تخلیقی فنکاروں میں معاصرانہ چشمکیں رہی ہیں۔ یہ اختلافات کبھی تو فنی اور دبستانی ہوتے ہیں اور کبھی ذاتی۔ اردو ادب کا ہر طالب علم میر و سودا، انشا و مصحفی، آتش و ناسخ، انیس و دبیر، غالب و ذوق اور امیر و داغ کے ادبی معرکوں اور ان کی معاصرانہ رقابتوں اور چشمکوں سے واقف ہے۔ ان جھگڑوں میں کس بے چارے نقاد کا ہاتھ تھا۔

اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ جو شخص خود ادیب و شاعر نہیں وہ ادب کے مسائل کو کیسے سمجھ سکتا ہے اور کس طرح اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ فن لطیف کی طرح وہی شخص مائل ہوتا ہے جو خود بھی حس لطیف رکھتا ہو، ابن رشیق کے قول کے مطابق ایسا شخص بھی اپنے اندر تخلیقی جوہر رکھتا ہے۔ ادب کے قاری کے اندر اگر یہ حس لطیف اور تخلیقی جوہر نہ ہو تو اس کے لیے ادب بے مصرف چیز ہے۔ یہ حس اور جوہر بھی جامد اور اٹل نہیں بلکہ متحرک اور ترقی پذیر ہے اور اس میں برابر نشو و نما ہوتی رہتی ہے۔ پہلے زمانے میں شاعر کے لیے یہ لازمی شرط تھی کہ وہ پیدائشی موزونیت پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ اچھے شعرا کے کلام کا مطالعہ کرتا رہے اور اس سے پورے طور پر لطف اندوز ہوتا کہ اس کی حس لطیف اور اس کے اندر کے تخلیقی جوہر جلا پاتے رہیں۔ پرانے اساتذہ کسی شاعر کو اس وقت تک شاگرد بنانے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے جب تک اسے منتخب اور بہترین اشعار خاصی تعداد میں یاد نہ ہوں، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جب تک اس کے ذہن کی اس طور پر تربیت نہ ہوا سے شاعرانہ اور غیر شاعرانہ کلام کا فرق نہیں معلوم ہو سکتا۔

یہ حس لطیف اور تخلیقی جوہر ہی وہ مشترک چیز ہے جس کی بنا پر شعر یا ادب پارہ اپنے اندر ایک وسیع اور عالمگیر حلقۂ اثر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاعر خود شعر کہتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا، ناول، افسانہ، ڈرامہ یا ادب کا کوئی اور نمونہ ناول نگار یا ادیب کے علاوہ دوسرے شخص کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا۔ یہی نہیں بلکہ ایک شاعر کا شعر دوسرے شاعر کے لیے اور ایک ادیب کی تحریر دوسرے ادیب کے لیے بیکار ہوتی۔ شاعر نثر سے لطف نہ اٹھا سکتا اور نثر نگار کے لیے شعر میں کوئی جاذبیت نہ ہوتی۔ کالیداس، ہومر، شیکسپیئر، فردوسی اور بالمیکی جنھوں نے ہزاروں برس پہلے اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار کیا۔ آج کے انسان کے لیے کسی قسم کی دلکشی نہ رکھتے۔ ادیب اور نقاد میں اسی قسم کا فرق ہے، جس طرح کا فرق شاعر اور نثر نگار میں ہوتا ہے۔ شاعر اور نثر نگار دونوں تخلیقی جوہر رکھتے ہیں لیکن ان کی افتاد طبع مختلف ہوتی ہے۔ شاعر میں تخیل اور جذبے کا عنصر نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اور وہ تخیلی اور ترکیبی ذہن رکھتا ہے۔ نثر نگار میں عقل و استدلال کا عنصر نسبتاً حاوی ہوتا ہے اور اس کا ذہن تعمیری اور تجزیاتی ہوتا ہے۔ دونوں تخلیقی ذہن رکھتے ہیں لیکن افتاد طبع مختلف ہونے کی وجہ سے اپنے تجربات و احساسات کے اظہار کے لیے مختلف پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں۔ انھیں عناصر کی کمی بیشی سے خود شاعر اور نثر نگار کی تخلیقات کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ شاعر پر جب تخیل اور جذبے کی گرفت مضبوط نہیں ہوتی تو اس کا کلام موزوں ہونے کے

باوجود نثر کی سرحد میں داخل ہوجاتا ہے اور نثر نگار پر جب تخیل اور جذبے کا غلبہ ہوجاتا ہے اور عقل واستدلال کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے تو اس کی نثر شاعرانہ ہوجاتی ہے۔ پھر شاعر اور نثر نگار تخلیقی جوہر رکھنے کے باوجود چوبیس گھنٹے شاعر اور ادیب نہیں ہوتے۔ تخلیقی جوہر عام طور پر دبا ہوا یا سویا ہوا ہوتا ہے۔ یہ جب پورے طور پر بیدار ہوتا ہے تو ادب پارہ وجود میں آتا ہے۔ یا کوئی شعر یا نثری تحریر مکمل تخلیق بنتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ ہے کہ شاعر کا ہر شعر یکساں نہیں ہوتا، اور نثر نگار کی ہر تحریر اپنے اندر تاثیر نہیں رکھتی۔ کیا وجہ ہے کہ بعض شاعر آخر عمر تک شعر نہیں کہہ پاتے، ایک خاص منزل پر پہنچ کر ان پر شعر نازل نہیں ہوتا یا ان کی شاعری انحطاط پذیر ہوجاتی ہے اس طرح ایک ادیب اپنی زندگی میں چند شاہکار لکھنے کے بعد خاموش ہوجاتا ہے یا پھر اس طرح کی تخلیق پر قادر نہیں ہوتا۔

یہ بات معلوم ہوجانے کے بعد کہ تخلیقی جوہر اور حس لطیف شاعر اور نثر نگار دونوں میں مشترک ہے اور افتادِ طبع کا فرق ان کے لیے مختلف پیرایۂ بیان اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر ہم عام نثر نگار اور نقاد کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ دونوں بعض مشترک عناصر رکھتے ہیں اور بعض اعتبار سے دونوں کی شخصیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ عام ادیب یا نثر نگار زندگی کا شعور و احساس رکھتا ہے اور اس شعور واحساس کو ایک تخلیقی پیکر میں ڈھالتا ہے۔ نقاد بھی زندگی کا شعور و احساس رکھتا ہے لیکن اس شعور و احساس کو کسی تخلیقی پیکر میں براہ راست منتقل کرنے کے بجائے کسی تخلیقی پیکر اور زندگی کے شعور واحساس میں جو پیچیدہ رشتہ ہے اس کی نوعیت اور ماہیت کا ادراک کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہ ادراک بھی ایک طرح کا تخلیقی عمل ہے، اور اس کے وسیلے سے جو ایک نئی تخلیق وجود میں آتی ہے اس میں لکھنے والے کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ درجے کی تنقید بھی اعلیٰ درجے کی تخلیقی نثر ہوتی ہے اور ہر اچھا تنقید نگار اچھا نثر نگار بھی ہوتا ہے۔ جس طرح شاعر اور ادیب کی ایک شخصیت ہوتی ہے اور وہ چند تصورات پر ایمان رکھتا ہے اور اسی اعتبار سے وہ زندگی کے مظاہر سے دلچسپی رکھتا اور اس کے متعلق اپنے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ اسی طرح تنقید نگار بھی اپنی شخصیت اور اپنا زاویۂ نظر بھی رکھتا ہے۔ جس طرح ادیبوں

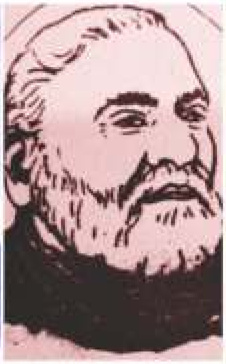

اور شاعروں میں طرح طرح کے ادیب اور شاعر ہیں یعنی کوئی مذہب واخلاق کی طرف مائل ہے، کوئی حسن و محبت سے دلچسپی رکھتا ہے، کسی کے یہاں نشاطیہ عنصر غالب ہے اور کسی کے یہاں حزینہ، کوئی رجائی ہے تو کوئی قنوطی، کوئی عینیت پسند اور رومانی ہے تو کوئی حقیقت پسند اور واقعیت کا دلدادہ، کوئی رنگینی پر فدا ہے تو کسی کا سادگی پر ایمان ہے کسی کو اجتماعیت کا غم ستاتا ہے تو کوئی انفرادیت کا اسیر ہے، کوئی سیاست کو قدرِ اعلیٰ سمجھتا ہے تو کوئی جنس کو، غرض شاعری اور ادب میں شخصیتوں کے فرق سے جو رنگارنگی اور بوقلمونی ہے وہی رنگارنگی اور بوقلمونی نقادوں میں بھی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کے بھی بے شمار دبستان ہیں، رومانی تنقید، داخلی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، اخلاقی تنقید، تاریخی تنقید، وجدانی تنقید، نفسیاتی تنقید، سماجی تنقید، عمرانی تنقید، مارکسی تنقید، لسانی تنقید، فنی تنقید اور اس طرح کی بہت سی اصطلاحیں عام ہوچکی ہیں۔ ہر تنقید کے اپنے حدود ہیں اور اسی اعتبار سے وہ مفید یا غیر مفید ہوسکتی ہے۔ مختلف دبستانوں کے ادیب و نقاد اپنی تنقید کو جامع اور معتبر اور دوسری قسم کی تنقید کو غلط کہتے ہیں۔

ادبی دبستانوں کی طرح تنقیدی دبستانوں میں بھی آویزش و پیکار رہی ہے، اسی لیے موجودہ زمانے میں بعض لوگوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی اس طرح کی تنقید ہو جو ہر زمانے کے ادب کو اور ہر نوعیت کے ادیب کو پرکھنے، اس سے لطف اندوز ہونے اور اس کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے میں کام آسکے۔ جو ہر طرح مکمل، جامع اور ہمہ گیر ہو، جو کسی نوعیت کے ادب کی نہ بے جا طرفداری اور وکالت کرے اور نہ اس کے ساتھ بے انصافی برتے۔ ایسے ادیبوں کا خیال ہے کہ وہی تنقید صحیح معنوں میں تنقید ہوگی اور اسے ادبی تنقید یا سائنٹفک تنقید کہہ سکیں گے۔ اس خیال کا علمبردار آئی، اے رچرڈس ہے۔ رچرڈس کا کہنا ہے کہ تنقید کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ ادبی قدروں کا تعین کرے۔ مختلف زمانے کے ادبی شاہکاروں کا مطالعہ کرکے سب سے پہلے یہ بات طے کی جائے کہ کون سی چیز ادب ہے اور کون سی چیز ادب نہیں ہے۔ پھر مختلف اصناف، اسالیب، ہیئتوں، اور اظہار کے پیرایوں کی ساخت، ان کی نوعیت، ان میں تبدیلی اور ارتقا کے عمل کو سمجھا جائے اور ان کا اس طرح تجزیہ کیا جائے کہ کچھ واضح اصول متعین ہوسکیں۔ اس نظریے کے مطابق وہ نقاد سے بہت سے مطالبے کرتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ ادیب بننا نسبتاً سہل ہے لیکن نقاد بننا مشکل، اس لیے کہ ادیب ایک خاص موضوع، ایک خاص نظریہ زندگی کے ایک یا چند تجربات، ایک مخصوص اسلوب ہیئت یا پیرایۂ اظہار کے حدود یا دائرے میں رہ کر کامیاب ادب کی تخلیق کرسکتا ہے کیونکہ اس کی ذمے داری بس اتنی ہے کہ وہ اپنے مواد کو تخلیقی مراحل سے گزار کر ایک مناسب صورت میں منتقل کردے لیکن نقاد کو ان حدود اور دائروں سے نکل کر ہر طرح کے ادب، ہر طرح کے اسلوب، ہر طرح کے نظریے اور ہر زمانے کی تاریخ اور ہر دور کی تہذیب و معاشرت اور اس کی روح کو سمجھنا ہے۔ پھر ادب کے عالمگیر اصولوں کے علاوہ اپنی زبان کے مخصوص مزاج، اس کے اسالیب کی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے عوامل و محرکات کا پتہ لگانے کی ضرورت ہے، ان شرائط کو پورا کرنے کے بعد ہی ایک نقاد اخلاقی، نظریاتی یا صنفی اور تکنیکی تعصبات سے بلند ہوکر ادبی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کا اہل ہوسکتا ہے۔ اردو میں اس طرح کی سائنٹفک تنقید کے علمبردار کلیم الدین احمد ہیں، جنھوں نے اپنی کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' کا آغاز ان فقروں سے کیا ہے کہ اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا

خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔

صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

یا

جغرافیۂ وجود سارا
ہر چند کہ ہم نے چھان مارا
کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی
لیکن نہ خبر ملی کمر کی

اسی طرح نگاہِ جستجو جغرافیۂ اردو کی سیر کر کے مایوس واپس آتی ہے لیکن تنقید کے جلوے سے مسرور نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اردو میں تنقید کا وجود ہی نہیں تو پھر اردو تنقید پر کئی سو صفحوں کی کتاب لکھنے کی کیا ضرورت تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعتراض زیادہ وزنی نہیں اس لیے کہ کلیم الدین کا خیال ہے کہ تنقید کے نام پر جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے یا اب تک اس کے جو دبستاں ہمارے یہاں مروج رہے ہیں وہ محدود معنوں میں ہی تنقید کہے جاسکتے ہیں۔ صحیح یا سائنٹفک تنقید جیسی وہ چاہتے ہیں کچھ اور ہی نوعیت کی ہوگی اور اسی کو ادبی تنقید کہہ سکیں گے۔ یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے کہ خود کلیم الدین بھی اس نوع کی تنقید کے اہل نظر نہیں آتے جس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی کتاب 'اردو شاعری پر ایک نظر' ہے جس میں اردو شاعروں پر لکھتے ہوئے انھوں نے اردو زبان کے مزاج، اس کی تاریخی تبدیلیوں اور اردو شاعری کی اصناف کے عوامل اور محرکات کا کچھ لحاظ نہیں رکھا، ان کے اندر اس حس لطیف کی بھی کمی ہے، جو ہر ادیب اور نقاد کے لیے شرط اولین ہے۔ البتہ اردو کے تنقیدی سرمائے کے بارے میں جو بات انھوں نے کہی ہے اس میں ورڈس کے خیالات کی ہی بازگشت ہے۔ رچرڈس نے اپنی کتاب 'ادبی تنقید کے اصول' میں ساری دنیا کی تنقید پر یہی رائے دی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''کچھ اٹکل پچو باتیں کچھ پند و نصائح کچھ بے ربط خیالات، بھڑکیلے اقتباسات، شاعرانہ لفاظی اور قیاس آرائی زیادہ تر مفروضات اور کہیں کہیں سچے خیالات، کہیں تشریح و توضیح، کہیں تبلیغ و اشتہار اور کہیں نکتہ چینی اور حرف گیری، بس اسی قسم کی کچھ چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام تنقید ہے۔''

رچرڈس نے جس معیاری اور مثالی تنقید کا تصور

کچھ اٹکل پچو باتیں کچھ پند و نصائح کچھ بے ربط خیالات ، بھڑکیلے اقتباسات، شاعرانہ لفاظی اور قیاس آرائی زیادہ تر مفروضات اور کہیں کہیں سچے خیالات، کہیں تشریح و توضیح، کہیں تبلیغ و اشتہار اور کہیں نکتہ چینی اور حرف گیری، بس اسی قسم کی کچھ چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام تنقید ہے۔

پیش کیا ہے وہ خود انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں محض ایک خوش آئند خواب کی حیثیت رکھتی ہے اور اردو میں تو اس طرح کے نقادوں کی آمد ابھی بہت دور کی بات ہے، اس لیے کہ اردو میں رہی سہی جو بھی تنقید تھی وہ اس وقت ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے۔

یہاں سے گفتگو اس موڑ پر آ پہنچی ہے جہاں زبان کھولتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیکن کیا کیجیے کہے بغیر بھی چارہ نہیں۔ اس لیے کہ اگر یہ محض ذاتی اور انفرادی مسئلہ ہوتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن اس مسئلے سے خود اردو ادب کی بقا اور اس کی آئندہ ترقی کا سوال وابستہ ہے۔ کلیم الدین کے نزدیک اردو تنقید ناقص اور یک طرفہ سہی لیکن حالی سے لے کر اب تک اردو ادب کی جو سمت اور رفتار رہی ہے اس میں جو پیچ و خم اور جو موڑ آئے ہیں اس کا تعلق ہماری تنقید سے بہت گہرا ہے۔ سرسید اور حالی سے پہلے اردو زبان نے ہمیں بعض اعلیٰ درجے کے شاعر دیے ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں لیکن اس سے پہلے کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر ہمارے یہاں خود رو قسم کے شاعر زیادہ تھے، ہماری شاعری ایک جنگل تھی جہاں جھاڑ جھنکاڑ کی بہتات ہوتی ہے۔ درباری ماحول اور انحطاط پذیر معاشرے میں رہ کر شاعری دن بہ دن زوال آمادہ ہوتی جارہی تھی۔ اس کا مقصد محض لفظی الٹ پھیر اور تک بندی تھی یا سستے قسم کے جذبات کی تسکین، اس میں زندگی سے گریز اور تصنع کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ حقیقی شاعروں کے مقابلے میں جعلی شاعروں اور استادوں کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس ماحول میں مصحفی نے انشا کے آگے سپر ڈال دی۔ نہ ناسخ کے مقابلے میں آتش کا سکہ چلا اور نہ ذوق کے آگے غالب کا چراغ جل سکا۔ غدر کے بعد ہمارے یہاں نئی تعلیم اور نئی تہذیب آئی، اس کے ذریعے جو نیا شعور آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہا تھا اس کے نزدیک شاعری کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی تھی۔ ناکاروں کا ایک مشغلہ جو بے عمل بھی بناتا ہے اور اخلاق و کردار پر برا اثر ڈالتا ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں شعرا کے دواوین کو نذر آتش کردینے کا منظر دیکھا جاسکتا ہے۔ حالی نے شاعری کو جو اپنے منصب سے گر گئی تھی نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعے اس منصب تک واپس لانے کی کوشش کی بلکہ 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھ کر اسے سماجی زندگی میں ایک مناسب جگہ دلانے کا تہیہ کیا۔ انھوں نے تصنع، مبالغہ، ابتذال اور اخلاقی پستی کو نمایاں کر کے حقیقی شاعری کے لیے اصلیت، واقعیت سادگی اور خلوص کو ضروری قرار دیا۔ اجتماعی زندگی اور سماج سے اس کے تعلق کو ہی واضح نہیں کیا بلکہ مقدمے میں اس بات پر بھی زور دیا کہ شاعری کا ملکہ بیکار نہیں ہے، یہ قومی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل اور انسانی تہذیب کے فروغ کے لیے مؤثر حربہ ہے۔ شبلی کی موازنہ انیس و دبیر یک طرفہ تنقید سہی لیکن اس کا بنیادی مقصد بھی پر تصنع شاعری کے مقابلے میں حقیقی اور واقعی شاعری کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اردو زبان میں علمی اور ادبی نثر کے مختلف اسالیب کا فروغ بھی سرسید اور حالی کی تحریروں کا ہی مرہون منت ہے۔

بعد میں ہمارے یہاں جن لوگوں نے تنقیدیں لکھیں ان میں امداد امام اثر، وحیدالدین سلیم، عبدالحق، عبدالرحمٰن بجنوری، مہدی افادی، سر عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، حسرت موہانی، پنڈت دتاتریہ کیفی، عظمت اللہ خاں، مسعود حسن رضوی، عبدالماجد دریابادی، نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر یوسف حسین، ڈاکٹر عابد حسین، شیخ محمد اکرام، فراق گورکھپوری اور دوسرے لوگوں کے نام آتے ہیں۔ ان تنقید نگاروں نے ایک طرف تو اپنے ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا، دوسری طرف مشرق و مغرب کے ادبی اور تنقیدی اصولوں پر ان کی نظر تھی ان کے بارے میں یہ تو

کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں میں سے کوئی بہت جامع اور ہمہ گیر شخصیت نہیں رکھتا اور نہ ہر قسم کے ادب یا ہر قسم کے اسالیب سے عہدہ برآ ہونے اور اس کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ بعض لوگوں کی نظر مشرقی ادب پر زیادہ ہے، مغربی ادب پر کم، بعض مغرب سے زیادہ واقف ہیں لیکن مشرقی سرمائے سے ان کی واقفیت سرسری ہے۔ بعض قدیم کی طرف زیادہ مائل ہیں بعض کو جدید سے لگاؤ ہے، بعض کسی صنف ادب کے دلدادہ ہیں تو بعض دوسری اصناف کے، لیکن ان سب میں ایک بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ ادب کی ادبیت کے منکر نہیں۔ اس لیے اپنے اپنے میدان میں رہ کر انھوں نے جو کچھ لکھا اس سے ہمارے ادب کو مجموعی طور پر فائدہ پہنچا اور ہمارے شعور اور بصیرت میں اضافہ ہوا۔ ان تنقیدوں کے ذریعے ہم نے اپنے ماضی کے شاعروں اور ادیبوں کو ازسرنو دریافت کیا اور ان کی قدر و قیمت متعین کی۔ نظیر اکبر آبادی، مصحفی، آتش، مومن اور غالب کی شاعری کی معنویت نمایاں طور پر سامنے آئی اور یہ بھی کہ ماضی کے ان شعرا کے یہاں ایسے کون سے عناصر ہیں جو ہمارے شعور اور ہمارے مزاج سے ہم آہنگ ہوسکتے ہیں۔ اردو غزل کے امکانات کا ازسرنو جائزہ لیا گیا، اس کے مضر پہلوؤں کو ترک کرنے اور اس کے قابل قدر پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور انھیں زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنایا گیا۔ نثر میں نئے نئے اسالیب اور نئی نئی اصناف اور ہیئتوں کے فروغ کا امکان پیدا ہوا۔ مغرب کے ادب سے استفادے کا میلان آگے بڑھا، اس کے ساتھ ساتھ اچھے اور قابل شعرا اور ادیبوں کی عزت افزائی اور نااہل ادیبوں اور سستی شہرت کے طلب گاروں کی پردہ کشائی بھی ہوتی رہی۔ اردو ادب اور شاعری میں اجتماعی اور قومی شعور، ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور ہندوستانی زندگی کے وسیع اور پیچ در پیچ مسائل کا عکس اور ادبی تحریروں کو اپنے زمانے کے مطالبات پورا کرنے کے قابل بنانے کا ہنر آیا۔

1935 کے لگ بھگ ہمارے یہاں نئے ادب کی تحریک شروع ہوئی۔ یہ تحریک زبان و ادب میں اپنے ساتھ جو تبدیلیاں لائی اس نے ایک تہلکہ مچا دیا، اس تحریک میں نوجوان اور پرجوش ادیب تھے، باغی اور انقلابی تھے، ان کے اندر عزم و حوصلہ تھا اور ان کا یہ جوش اور ولولہ، ان کی یہ بغاوت اور انقلاب پسندی بے معنی یا غیر فطری نہ تھی، اس کے پیچھے سماجی عوامل اور محرکات تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ساری بے اعتدالیوں کے باوجود ہمارے ادب کو بعض اعتبار سے فائدہ پہنچا، زندگی کے بارے میں حقیقت پسندانہ رویہ پیدا ہوا، رومانی اور خیالی ادب کی جگہ ایسے ادب نے جگہ لی، جو انسانی مسائل سے آنکھیں چار کرسکتا تھا، افسانے اور ناول میں مواد اور ہیئت کے اعتبار سے ایک جدید شعور پیدا ہوا اور مغربی ادب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے امکانات سامنے آئے، شاعری میں اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے تازگی پیدا ہوئی، نفسیات کا علم گہرا ہوا، لیکن یہ ادبی تحریک جو بعد میں دو گروہوں میں بٹ گئی، صالح اور متوازن تنقید سے محروم ہوگئی۔ جدید تنقید کے یہ علمبردار ماضی کے تنقید نگاروں کو شارح اور مفسر کہنے لگے، ان کی تنقید کو داخلی، رومانی، تاثراتی، اسلامی، ذوقی، وجدانی اور فنی تنقید وغیرہ کے نام سے یاد کرنے اور انھیں حقیقی معنوں میں نقاد ماننے سے انکار کرنے لگے، ایسا کہنا بھی غلط نہ ہوتا۔ اگر ہماری جدید تنقید پچھلی تنقیدوں کے تنگ دائرے سے نکل کر ایک وسیع اور ہمہ گیر نقطۂ نظر پیدا کرتی اور نہ صرف ادب اور زندگی کے پیچیدہ تعلق کو سمجھنے کی کوشش کرتی بلکہ فن پاروں کی تخلیق اور ادبی نوعیت پر نظر رکھتی۔ ہوا یہ کہ اس دور میں جو نقاد سامنے آئے، انھوں نے ان تحریکوں کے مبلغ، وکیل اور مدافعت کرنے والے کا منصب سنبھال لیا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ایسے تھے جن کے اندر حس لطیف کی بے حد کمی تھی یا انھوں نے اس کی مناسب تربیت نہ کی تھی، اس لیے شاعر اور متشاعر میں تمیز کرنے یا ادب اور غیر ادب کے فرق کو سمجھنے کا انھیں شعور نہ تھا۔ زندگی اور سماج کے عوامل پر بھی ان کی نظر گہری نہ تھی۔ انھوں نے بعض نظریات اور بعض اصطلاحات کا کتابی علم حاصل کرلیا تھا اس دور میں دو قسم کی تنقیدوں کو فروغ ہوا ایک تنقید 'ترقی پسند' یا مارکسی تنقید تھی، دوسری تنقید نفسیاتی اور ہیئتی تھی۔ ترقی پسند تنقید نے پہلے ماضی کے سارے ادب سے روگردانی کی اور اسے جاگیردارانہ سماج کی یادگار بتایا، اسے میر اور غالب کی شاعری فراری اور قنوطی نظر آنے لگی۔ جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اقبال اور ٹیگور رجعت پسند اور بیمار ادب کے علمبردار سمجھے گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ان شعرا میں انقلابی رجحانات تلاش کیے جانے لگے۔ چونکہ ادب اور غیر ادب کی پہچان نہ تھی اور اس کے تخلیقی عنصر کی پرکھ کا کوئی سلیقہ نہ تھا۔ اس لیے غالب اور میر کے وقیع اور جاندار اشعار کو چھوڑ کر بعض رسمی، روایتی اور بے جان اشعار کی بنیاد پر ان کے سماجی شعور کا تجزیہ کیا جانے لگا۔ تخلیقی ادب کے شعور کے اس فقدان کی وجہ سے ہم عصر ادب سے بھی انھوں نے موضوعات کے بنانے کا کام شروع کیا، کسی شاعر نے اگر ہنگامی واقعات اور سیاسی خیالات کو صرف نظم کردیا ہے اور کسی افسانہ نگار نے اشتہاری انداز میں بغیر فنی نزاکتوں اور تخلیقی عمل کی صعوبت اٹھائے اخبار کی خبروں کی بنیاد پر موضوعات کی رپورٹنگ کردی ہے تو وہ بھی ان کے نزدیک ادب ٹھہرا۔ اس قسم کے جائزوں اور فہرستوں نے نااہل ادیبوں اور متشاعروں کو زیادہ اہمیت دے دی اور حقیقی ادیب و شاعر نظر انداز ہونے لگے پھر صحت مند اور غیر صحت مند، مریضانہ داخلیت، بے لاگ خارجیت، سماجی شعور، بین الاقوامی شعور، طبقاتی شعور، حقیقت نگاری وغیرہ کی اصطلاحات بھی میکانکی طور پر استعمال کی جانے لگیں۔ ان اصطلاحات سے متعلق یا تو مضمون لکھے نہیں گئے یا جو لکھے گئے وہ بے حد الجھے ہوئے تھے اور جو عملی تنقید یا جائزے لکھے جاتے تھے وہ اس الجھن میں اور اضافہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک کے زیر اثر ہنگامی اور صحافتی ادب کی پیداوار کثرت سے ہونے لگی جس نے بالآخر اس تحریک کو ادبی طور پر بانجھ کردیا اس تحریک کے نمایاں اور صف اول کے شعرا کو وقت کے ظالم نقاد نے اپنی کسوٹی پر رکھا تو اپنے سنگھاسن سے گرا دینے کے لیے اور انھیں اس پر ایسی شرمندگی دامن گیر ہوئی کہ یا تو شاعری سے کنارہ کشی اختیار کرلی یا بے ضرر قسم کی غزل گوئی میں پناہ لے لی جو شاعر حقیقی معنوں میں شاعر تھے اور ترقی پسند خیالات سے بھی متاثر تھے۔ وہ اپنے طور پر شاعری کرتے رہے لیکن نقادوں پر ان کا ایمان نہ رہا۔ حقیقی ادیب اور نقاد ایک دوسرے کے حریف اور دشمن نظر آنے لگے اور ادیبوں کے حلقے میں پھر وہی خیالات دہرائے جانے لگے جو نقادوں کے بارے میں عام ہیں یعنی ادیبوں کی راہ کا روڑا ہیں۔

نفسیاتی اور ہیئتی تنقید اگرچہ اتنی ہنگامہ خیز ثابت نہیں ہوئی، اور نہ ہی اسے پسپائی کا یہ منہ دیکھنا پڑا لیکن

اس نوعیت کی تنقید نے بھی ابھی تک ہمارے ادب کو مثبت طور پر متاثر نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفسیاتی تنقید کے بیشتر علمبردار بھی ادب سے کم اور نفسیات کے اصولوں سے زیادہ واقفیت اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے فرائڈ، اڈلر اور ژونگ کے دیے ہوئے فارمولے تو ضرور سیکھے لیکن یہ ہر کس و ناکس پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ جدید افسانہ اور جدید نظم میں سے ایسی چیزوں کو اپنے مطالعے کے لیے منتخب کرنا جو تخلیقی ادب کا وقیع یا قابل قدر نمونہ نہیں ہیں اور ان کو پیش نظر رکھ کر خواہ مخواہ فنکار کی نفسیات کا مشاہدہ کرنے کی کوشش ایک طرح سے تضیع اوقات بن کر رہ جاتی ہے۔ ویسے اس تنقید کے بعض نمونے اچھے بھی مل جاتے ہیں۔ ہیئتی تنقید والوں میں بھی یہ عیب رہا کہ انھوں نے مواد اور ہیئت کے تخلیقی تعلق کو دیکھنے کے بجائے ہیئت کو مقصود بالذات سمجھ لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر آزاد نظم یا ہر ایسی تجرباتی نظم قابل توجہ قرار پائی جو کسی تجربے، احساس یا تخلیقی عمل سے وجود میں نہیں آئی بلکہ ظاہری سانچے کی پابند ہے۔ فرانسیسی انگریزی اور امریکی شاعروں کی نظموں کا اردو کے بعض ایسے شاعروں نے بھی چربہ اڑانے کی کوشش کی جن میں بنیادی شعریات کا فقدان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نظم اور آزاد شاعری کو برگ و بار لانے کا پورے طور پر موقع نہ مل سکا اور متشاعروں کی نظموں نے بعض لوگوں کو اس قدر بدظن کر دیا ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے حالانکہ بعض شعرا نے اس کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔

جدید اردو ادب میں جو انتشار و اختلال پیدا ہوا اور اس کی صحیح سمتیں متعین نہ ہوسکیں اس کی وجہ ہمارے یہاں متوازن اور ہمہ گیر شخصیت رکھنے والے نقادوں کی کمی ہے۔ پرانے نقاد نئے ادبی تقاضوں کو پورے طور پر نہ سمجھ سکے اس لیے یا تو وہ نئے ادب کی مخالفت کرتے رہے یا خاموش رہے، بعض نئی اصناف اور ہیئتوں کا شعور نہیں رکھتے تھے، اور اس معاملے میں اتنے قدامت پسند تھے کہ اسے بعض مغرب زدگی سے تعبیر کرتے تھے، بعض جنس یا سیاست کو ادب کے لیے شجر ممنوعہ سمجھتے تھے۔ غرض پرانے نقادوں کے اپنے حدود تھے اور وہ نئے ادب سے عہدہ برآ نہ ہوسکے، اور اس سے پورے طور پر انصاف نہ کرسکے تو اس میں ان کا زیادہ قصور نہیں، لیکن نئے نقادوں میں بعض اس کام کے اہل تھے۔ یہ لوگ تنقید کے جدید اصولوں سے واقف تھے اور نئے عوامل اور محرکات کا بھی انھیں شعور تھا لیکن ان لوگوں نے اپنے مختصر تنقیدی مضامین میں جدید ادبی و تنقیدی اصطلاحات اور تصورات پر اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کی یا پھر ہم عصر ادیبوں کی تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھ کر ان کی سرپرستی اور ہمت افزائی کرتے رہے۔ اس طریقہ کار نے انھیں بھرپور تنقیدی کارنامے پیش کرنے کی مہلت نہیں دی، نئے

جدید اردو ادب میں جو انتشار و اختلال پیدا ہوا اور اس کی صحیح سمتیں متعین نہ ہوسکیں اس کی وجہ ہمارے یہاں متوازن اور ہمہ گیر شخصیت رکھنے والے نقادوں کی کمی ہے۔

ادب کے منفی عناصر غالب آتے گئے اور ان حضرات کی تنقیدیں سمٹتی چلی گئیں۔ آخر مختصر تنقیدی مضامین کے چند مجموعوں کے علاوہ ان حضرات نے کچھ نہیں دیا اور اب جب کہ اردو ادب کو ان کی رہنمائی کی بے حد ضروری تھی یہ سب لوگ تبرک بن کر رہ گئے ہیں۔ سال دو سال میں کوئی مختصر تحریر ان کے قلم سے نکل جائے تو اسے دعائیہ اور کلمۂ خیر سمجھیے۔

صورت حال یہ ہے کہ اس وقت تنقید کے نام سے بازار میں ایسی چیزیں آرہی ہیں جو مدرسانہ یا مکتبی قسم کی ہیں، نقاد اب امدادی کتب تیار کر رہے ہیں۔ یہ کتابیں ادب اور ادیبوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں، ان کے بارے میں مختلف رایوں کو جمع کردیتی ہیں، ان کے خیالات کا خلاصہ تیار کردیتی ہیں۔ ان چیزوں سے طلبا کو تو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس سے ادبی تخلیق کے عمل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ پھر یہ کتابیں ماضی کے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں ہوتی ہیں اور ان کی نوعیت ماضی کے ادب کو زمانہ حال کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے والی نہیں بلکہ تاریخی اور تشریحی ہوتی ہے اس لیے وہ موجودہ دور کے ادیبوں کے مصرف کی نہیں۔ موجودہ دور کا شاعر اور ادیب نئی زندگی کے مسائل اور ان کی پیچیدگیوں کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے اس وقت اسے نہ نقاد کی رہبری حاصل ہے اور نہ اس کی رفاقت۔

رسالوں میں ایسے مضامین کی اب بھی بھرمار ہے جنھیں تنقید کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے لیکن یہ مضامین زیادہ تر طالب علموں کے ہوتے ہیں جو ابھی زیر تعلیم ہیں اور ادب بھی ان کے نصاب میں شامل ہے یا ان اساتذہ کے جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں انھیں درس دیتے ہیں۔ ان مضامین سے کلاس نوٹس کی بو آتی ہے۔ یہ مضامین پچھلی تنقیدوں کو الٹ پلٹ کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ہم عصر ادب پر قلم اٹھاتے ہیں تو فہرست سازی، کھتونی اور مردم شماری یا اقتباسات نقل کرنے سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی تمام تنقید اچھی نثر کا نمونہ بھی نہیں ہوتی۔ ان میں سے کوئی نقاد یا مضمون نگار ایسا نہیں جو اپنا طرز یا اپنی ادبی شخصیت رکھتا ہو۔ ادیبوں اور شاعروں کا حلقہ آج انھیں ادیب کے زمرے میں شمار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس قسم کی تنقیدیں تبلیغی یا مفتیانہ تنقید کے مقابلے میں بے ضرر ہیں۔ لیکن ایسی تنقیدیں مستقبل کے ادب کی تعمیر و تشکیل میں کوئی مدد نہیں دے سکتیں۔ بعض رسالوں میں ادبی مسائل پر بحثیں چلتی ہیں جو بہت جلد ذاتی ہوجاتی ہیں اور تو تو میں میں کے اندر تبدیل ہوجاتی ہیں۔ بعض لوگ انھیں کو اب تنقید سمجھنے لگے ہیں۔ غرض کہ اس وقت اردو میں نقاد کا لفظ ہنسنے ہنسانے کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ نئے ادیبوں میں سے بعض کبھی کبھی تنقیدی مضمون لکھتے ہیں اور ان میں خاصی تخلیقی اپج اور شعور ہوتا ہے لیکن موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے ایسے ادیب بھی اپنے آپ کو نقاد کہلوانا پسند نہیں کرتے اور نہ تنقید کو اپنے ادبی مشاغل میں کوئی مستقل جگہ دینے کے لیے تیار ہیں، کبھی کبھی اچھی کتاب یا ترشا ترشایا مضمون نظر آجاتا ہے تو آس بندھتی ہے کہ شاید اب صالح تنقید اردو میں پیدا ہورہی ہے۔ لیکن اس سے قبل لکھنے والا ادب کے مسائل پر توجہ کرے طومار نویسوں کے لگائے ہوئے انبار میں وہ کتاب، وہ مضمون اور وہ نام گم ہوجاتا ہے۔

■

ماخذ: زاویۂ نگاہ، **مصنف:** خلیل الرحمٰن اعظمی، **قیمت:** 138 روپے، **پہلی اشاعت:** 2008، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

علاج بذریعہ غذا

حکیم احتشام الحق قریشی

اخروٹ

شناخت: ایک درخت کا پھل ہے۔ یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک اصلی دوسرا صحرائی۔ اصلی میں دو قسمیں ہیں۔ ایک کا درخت بویا جاتا ہے اور دوسرا اپنے آپ لگتا ہے۔ بوئے ہوئے کا چھلکا پتلا ہوتا ہے، اس کو کاغذی اخروٹ کہتے ہیں۔ اپنے آپ اگنے والے کا چھلکا موٹا ہوتا ہے۔ اس کا درخت ہمالیہ میں کشمیر سے لے کر منی پور تک اور دوسرے ملکوں میں بھی ہوتا ہے۔ یہ درخت ایک سوفٹ سے ایک سوبیس فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔ اس پیڑ کی گولائی بارہ فٹ سے اٹھائیس فٹ تک ہوتی ہے۔ اس کے پتے گول اور کچھ کچھ لمبائی لیے ہوتے ہیں جن کی وضع ساذج ہندی کے پتوں جیسی ہوتی ہے۔ لکڑی سیاہی مائل بے ریشہ اور جوہر دار ہوتی ہے۔ اس کے پتے جاڑوں میں گر جاتے ہیں اور ماگھ کے مہینے سے چیت تک دوسرے پتے نکل آتے ہیں۔ اس میں سفید پھولوں میں گچھے لگتے ہیں جن کی شکل مدن پھل کے پھولوں کی سی ہوتی ہے۔ یہ درخت جب تمیں چالیس برس کا ہو جاتا ہے تب اس میں پھل آنے لگتے ہیں۔ پھلوں کو اکٹھا کرنے کے تین مہینوں کے بعد ان میں سے تیل نکالا جاتا ہے کیونکہ اس زمانے تک اس میں دودھ کی طرح ایک رطوبت رہتی ہے، بعد اس کے وہ جم کر مینگ بن جاتی ہے۔ چیت بیساکھ میں اس کے پھول لگ جاتے ہیں اور اساڑھ آنے تک پھل پک جاتے ہیں۔

مزاج: گرم دوسرے درجہ میں، خشک تیسرے درجہ میں۔

فوائد: اس کی مینگ لطیف ہے۔ اجابت خلاصہ لاتی ہے۔ اعضاء رئیسہ کو قوت پہنچاتی ہے۔ خصوصاً دماغ کو قوت دیتی ہے۔ حواس کو روشن کرتی ہے، بوڑھوں کے موافق ہے، تازہ کھانا چاہیے۔ خون صالح پیدا کرتی ہے۔ انزروت کے ساتھ معدے کے کیڑے نکالتی ہے۔ چوٹ کے نشان پر تازہ مینگ کا لیپ کرنے سے نشان جاتا رہتا ہے۔ اس کے لگانے سے چھائیں جاتی رہتی ہے، اس کا لیپ سداب اور شہد کے ساتھ پٹھے کے التوا کے لیے مفید ہے، اس کی مینگ نہار نہ چاب کر داد پر لگانے سے جاتا رہتا ہے، اس کی مقشر مینگ بادام کی مینگ سے معدے کے زیادہ موافق ہے۔ پرانی مینگ معدے کے لیے ردی ہے، خاص کر پرانا جلدی فاسد ہوجاتا ہے۔ خلط صفراوی اور دخانیت کی طرف مستحیل ہوجاتا ہے، اخروٹ کی مینگ باہ اور حافظ کو قوت دیتی ہے۔ آتشک کی بیماریوں کو مفید ہے، ریاح دور کرتی ہے، مادہ ردی کو تحلیل کرتی ہے، بدہضمی کو مانع ہے، بھنی ہوئی مینگ کھانسی کو فائدہ مند ہے۔ اس کو پیس کر ناف پر لیپ کیا جائے تو مروڑ جاتی رہتی ہے۔

اس کو پانی میں جوش دے کر پانچ روز تک پینے سے سر کا تنقیہ ہو جاتا ہے، ذہن اور فکر میں تیزی آجاتی ہے، سرکے میں پرورش کی ہوئی مینگ ضعف معدے کے لیے تریاق کا حکم رکھتی ہے۔ سیل اور دمہ میں مفید ہے۔ اخروٹ کی پرانی مینگ کو چاب کر گوشہ چشم کے ناسور پر لگانا فائدہ مند ہے۔ اخروٹ کی مینگ کو منہ پر ملنے سے منہ کا تشنج دور ہو جاتا ہے۔ ساڑھے دس گرام اخروٹ کی مینگ ہم وزن مصری کے ساتھ سات روز تک کھانے سے وجع الورک کو فائدہ ہوتا ہے، انجیر خشک اور سداب اور نمک کے ساتھ کھانے سے ہر قسم کے زہر کو نفع دیتی ہے، خاص کر کسی زہر سے قبل اسے کھا لیا جائے تو زہر اثر انداز نہیں ہوتا ہے کیونکہ اخروٹ میں ایک قسم کی تریاقیت ہے، ابن زہر کہتا ہے کہ انجیر کے ساتھ کھانے سے زہر اثر نہیں کرتا۔ اگر شہد نمک اور پیاز کے ساتھ دیوانے کتے کے کاٹے ہوئے مقام پر لگائیں تو نفع دیتا ہے۔ اخروٹ کی مینگ قابض نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی اس میں خشونت پائی جاتی ہے، البتہ اس کے اندرونی چھلکے میں جو مینگ پر ہوتا ہے، تھوڑا سا قبض ہے لیکن وہ بھون لینے سے زیادہ قابض ہو جاتا ہے۔

علامہ گیلانی رقمطراز ہیں کہ اس درخت کے تمام اجزا میں قوت قابضہ پائی جاتی ہے اور اگر اخروٹ کے سب سے اوپر ہوئے چھلکے میں قبض ظاہر ہے اور تمام اجزا میں تلخی ہے، پرانی مینگ میں قوت جلا قوی ہوتی ہے۔ اس کی مینگ کڑوی جلدی ہو جاتی ہے۔

ادرک

شناخت: اک جڑ ہے، مزہ چرپرہ ہوتا ہے، زمین کے اندر پائی جاتی ہے، تر و تازہ کو ادرک اور خشک کو سونٹھ کہتے ہیں، اس لیے اطبا اسے زنجبیل رطب بولتے ہیں اور بعض نے سونٹھ کی قسم سے بتایا ہے اور بعض کے قول سے ظاہر ہے کہ سونٹھ سے غیر بحالت تری مشابہ سونٹھ کے اور خشک ہونے پر اس کے مغائر ہوتی ہے اور تر اپنے تک کامل الجواص ہے، خشک ہونے پر خفیف مگر یہ قول تحقیق کا محتاج ہے، کوہی ادرک زیادہ قوی ہوتی ہے، ادرک میں سے ڈالیاں نکلتی ہیں، ہر ڈالی ہری اور سیدھی اور ہاتھ دو ہاتھ تک لمبی اور چھنگلیاں کے برابر پتلی ہوتی ہے، جڑ کے قریب اوپر کا رنگ سرخ ہوتا ہے،

اس پر گنوں کے پتوں کی طرح پتے لپٹے ہوتے ہیں، جوگنوں کے پتوں کی طرح ملائم اور بہت سبز ہوتے ہیں، ہر پتہ بالشت دو بالشت لمبا اور اس سے چھوٹا بھی ہوتا ہے۔

مزاج: گرم و گراں ہے۔

فوائد: ادرک ملین ہے، دماغ کو گرم کرتی ہے، ہاضم ہے اگر تحلیل غذا کے وقت کھائیں تو جلدی ہضم ہو جاتی ہے اور اگر کھانے سے قبل نمک لاہوری کے ساتھ کھائیں تو نفخ دور کر دیتی ہے، ہاضمہ کو قوت دیتی ہے، ریاح کو تحلیل کرتی ہے، بھوک کو بڑھاتی ہے، بلغم اور رطوبت معدہ کو دفع کرتی ہے، معدہ اور جگر کی قوت کو بڑھاتی ہے، اس کے رس میں شہد ملا کر چاٹنا بلغمی کھانسی کو مفید ہے اور ارد کی دال میں ڈالنا اس کی اصلاح کرتا ہے، سرد مزاج والوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ وید کہتے ہیں کہ گرمی بدن کے موافق گرم ہے، طبیعت کو خوش کرتی ہے، ورم اعضا سقوط اشتہا لاغری بلغم سینے کان اور ناک کے امراض کے لیے نافع ہے، بواسیر گٹھیا اور استسقا کو دور کرتی ہے، کھانسی دمہ، ثقل، سمع اور خروج مقعد کو مفید ہے، مدر ہے داء الثعلب کو مفید ہے اورام ریحی بارد اور بائے کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس کا مربہ سونٹھ کے مربے سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ اس میں بمقابلہ اس کے گرمی بھی کم ہے۔ ادرک ساڑھے دس ماشہ پرانا گڑ ساڑھے سترہ ماشہ دونوں کو نہار منھ کئی دن استعمال کرنے سے بند آواز کھل جاتی ہے۔ ادرک کا دو سیر پانی پاؤ بھر تل کے تیل میں ملا کر یہاں تک جوش دیں کہ پانی خشک ہو جائے اور روغن باقی رہ جائے تو اس کی مالش درد ریاحی کے لیے اور جوڑوں کا درد اور جوڑوں کی سختی کے لیے سودمند ہے، کھانا کھانے سے پہلے ادرک کے ٹکڑوں پر نمک چھڑک کر کھانے سے کھانے کی طرف سے نفرت اور اشتہا کا نہ ہونا موقوف ہو جاتا ہے۔ بعض کا بیان ہے کہ ادرک مضعف باہ ہے مگر یہ قول تحقیق طلب ہے کیونکہ سونٹھ مقوی باہ ہے اور وہ ادرک سے بنتی ہے تو پھر کیا وجہ کہ ادرک مقوی باہ نہ ہو اور یہ تو نہایت تعجب کی بات ہے کہ مضعف باہ ہو ادرک کے رس میں دودھ ملا کر سونگھنے سے ماتھے کا درد اور دوسرے امراض دفع ہو جاتے ہیں، ادرک کے رس میں شہد ملا کر چاٹنے سے قوت ہاضمہ درستی پر آ جاتا ہے، لیکن جس کا سبب صفرا ہو اس کے رس کی دو تین بوندیں آنکھ میں ٹپکانے سے آنکھوں کا درد رفع ہو جاتا ہے، اس

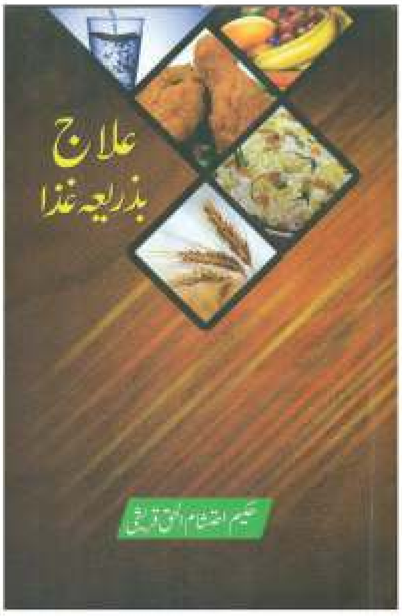

رس کو سونگھانے سے تپ کی بے ہوشی رفع ہو جاتی ہے۔

ادرک کے ٹکڑوں کو نمک میں لپیٹ کر دانت میں دبانے سے سردی کی وجہ سے جو دانتوں میں درد ہوتے ہیں جاتے رہتے ہیں، ادرک تر پھلا اور گڑ کو اکٹھا کر کے دینے سے یرقان کو نفع ہوتا ہے، اس کو نمک کے ساتھ کھانے سے ضعف اشتہا جاتا رہتا ہے۔ اس کے رس میں شہد ملا کے چٹانے سے دمہ کھانسی زکام اور بلغم مٹتے ہیں، اس کے رس میں اجوائن کو پیس کر بدن پر مالش کرنے سے بادی کا درد دفع ہو جاتا ہے، اس کے خالص رس میں پرانا گڑ ملا کر پلانے سے سب بدن کی سوجن اترتی ہے مگر اس کے استعمال کے وقت مریض کو بکری کا دودھ استعمال کرانا چاہیے، اس کا رس نیم گرم کر کے ٹپکانے سے کان کے بادی کا درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔

اس کا اچار کھانے سے بھوک لگتی ہے، غرض خلاصہ یہ ہے کہ ادرک اپنے اندر صدہا خصوصیات لیے ہوئے ہے۔

السی

شناخت: السی کے پودے کی ساق پتلی اور قریب ایک ہاتھ کی لمبی، پھول لاجوردی ہوتا ہے، اس کی گھنڈی جس میں بیج ہوتے ہیں چنے کے دانے کے برابر ہوتی ہے۔ اس میں بیج بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ بیج چکنے ہوتے ہیں۔ بعض کا رنگ زردی ویزگی مائل اور بعض کا سرخی مائل اور بعض کا سیاہی مائل اور بعض کا سفید ہوتا ہے۔ اس پودے کی چھال سے ایران وغیرہ میں کپڑے بنتے ہیں اور کپڑے کو کتاں کہتے ہیں۔ جب مطلق السی بولتے ہیں تو بیج مراد ہوتے ہیں۔ گیلانی کہتے ہیں کہ طبیبوں کی یہ عادت پڑ گئی ہے کہ جب مطلق بزر بولتے ہیں تو بزر کتاں یعنی السی مراد ہوتی ہے۔ بعد اس کے یہ اصطلاح مقرر کر لی ہے کہ جب مطلق بزر بولیں تو اس سے السی کا تیل مراد ہوتی ہے بہتر وہ بیج ہیں جو تازہ اور بھاری اور موٹے ہوں۔

مزاج: پہلے درجہ میں گرم و خشک۔

فوائد: السی کا کپڑا پہننا حرارت کو دور کرتا ہے، پسینہ کم کرتا ہے، خارش اور ورم سخت کو بہت نافع ہے۔ اس میں جوئیں کم پڑتی ہیں، شریف نے لکھا ہے کہ اگر یہ چاہیں کہ بدن دبلا ہو جائے تو جاڑوں میں کتاں کا کورا کپڑا بغیر دھلا ہوا پہنیں اور گرمیوں میں کورا پہنیں، اس کا پودا دماغ کا سدہ کھولتا ہے، زکام کو بے حد نفع بخش ہے، دھواں خرابیِ رحم کی اصلاح کرتا ہے، اس کو جلا کر راکھ تازہ زخموں پر چھڑکنے سے خون بند ہو جاتا ہے۔ سوزش اور درد بھی بند ہو جاتے ہیں۔ زخموں میں اس کا کپڑا بھرنا مفید ہے، زخم کو بھر دیتا ہے، اس کا پھول مفرح و مقوی دل ہے۔ اس کے بیجوں کا لعوق بلغم کھانسی کو دور کرتا ہے اور سینے کی رطوبت پاک کرتا ہے۔ اس کے بیج قبض رفع کرتے ہیں اور سینے کو جلا دیتے ہیں اور ورم کو تحلیل کرتے ہیں۔ گردے اور مثانے کے زخم بھرتے ہیں۔ پیشاب آور ہیں، قوت باہ بڑھاتے ہیں، مغلظ منی ہیں مثانے اور گردے کی پتھری توڑ کر نکال دیتے ہیں، تخم کتاں پیس کر مصری یا شہد کے ساتھ قوام میں ملا کر چاٹنے سے بلغمی کھانسی دور ہو جاتی ہے۔ تخم کتاں میں رطوبت فضلیہ ضرور ہے۔ خاص کر تازہ السی میں اسی وجہ سے نفخ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے لیپ سے جھائیں اور داد جاتے رہتے ہیں۔ ناخنوں میں خشکی آ جائے اور پھٹنے اور چھلکے اترنے لگیں تو ان کو پیس کر شہد کے ساتھ لگانا

چاہیے۔ صحت کاملہ ہوگی اسے پیس کر تل کے تیل میں ملا کر لگانے سے ہر قسم کے ورم کو نفع دیتے ہیں۔ درد اور سوزش دفع ہوجاتی ہے۔ گرم پانی میں پیس کر درد سردائی کے لیے لگانا مفید ہے۔ تین بار لگانے سے بالکل جاتا رہتا ہے۔ سر کے درد اور گنج کو دفع کرتا ہے۔ اس کی دھونی سے گرم زکام جاتا رہتا ہے۔ ناک کا سدہ کھل جاتا ہے۔ اس کا لعاب آنکھ میں ٹپکانے اور لیپ کرنے سے اس کی سرخی دفع ہوجاتی ہے۔ ان کا استعمال تھوک میں خون آنے کو روکتا ہے۔ تر کھانسی کو مفید ہے۔ روغن گل ملا کر حقنہ کرنے سے آنتوں کے پھوڑوں کو بہت نفع ہوتا ہے۔ ان کا لعاب روغن کے ساتھ پینے سے بھی گردے اور مثانے اور رحم کے زخموں کو نفع پہنچاتا ہے۔ ہر روز سوا دو ماشہ السی کے بیج کھانے سے آنتوں کا درد جاتا رہتا ہے۔ پیشاب اور پسینہ اور

ڈاکٹر السی کے بیجوں کا جوشاندہ کھانسی اور زکام اور دستوں اور پیچش میں مفید بتاتے ہیں اور اس کی کھلی کی پلٹس بناتے ہیں۔

دودھ اور حیض جاری ہوجاتا ہے۔ قبض رفع ہوجاتا ہے، منی بڑھتی ہے، گردے اور مثانے کے زخم اور پھوڑے کو نفع پہنچاتا ہے، لیکن پیشاب جاری کرنے کے بارے میں ان کی طاقت ضعیف ہے، البتہ بھوننے سے طاقت آجاتی ہے۔ اس لیے کہ قبض شکم ہوکر مثانے کی طرف رطوبات رجوع ہوجاتے ہیں۔ ایک تولہ السی کے بیج پانی میں جوش دے کر چھان لیں اور پی لیں کئی دن ایسا کرنے سے مثانے کی پتھری خارج ہوجاتی ہے اور اگر اسے کوٹ کر تھوڑی سی کالی مرچ کے ساتھ شہد میں چاٹا کریں تو باہ کو بے حد فائدہ ہوتا ہے۔ کیسی بھی کمزوری ہوجاتی رہتی ہے اور تنہا بھی پونے دو ماشہ روز کھانے سے منی بڑھتی ہے۔ ان میں عجیب خوبی ہے کہ سرد اور گرم دونوں قسم کے ورموں کو خواہ وہ اعضائے ظاہری میں ہوں یا باطنی میں تحلیل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر السی کے بیجوں کا جوشاندہ کھانسی اور زکام اور دستوں اور پیچش میں مفید بتاتے ہیں اور اس کی کھلی کی پلٹس بناتے ہیں۔

امڑہ

شناخت: اس کے درخت ہندوستان میں اکثر سب جگہ بوئے جاتے ہیں اور اپنے آپ بھی اگتے ہیں۔ یہ درخت پچیس فٹ اونچا ہوتا ہے۔ اس کے تنے کی گولائی چار فٹ تک ہوتی ہے۔ اس کے پتے شاخ کے دونوں طرف برابر لگتے رہتے ہیں۔ پکنے پر ہرے اور چمکدار ہوجاتے ہیں اور ان کو ملنے سے ایک خاص طرح کی بو آتی ہے، یہ پتے چھوٹے چھوٹے نرم اور باریک ہوتے ہیں، پہلے اس میں پھول پھل لگتے ہیں۔ اس میں آم کی بور کی طرح بور آتا ہے اور پھل کندوری کی طرح چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، ان کے چھلکے پر پیلے اور کالے داغ ہوتے ہیں، چھلکوں کے پاس کا گودا بہت کھٹا ہوتا ہے اور گٹھلی کے پاس کا گودا بہت میٹھا ہوتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ پھل جب تک کچا ہوتا ہے سبز و ترش اور تھوڑا تلخ ہوتا ہے اور جتنا پکتا جاتا ہے زرد اور قدرے کھٹ مٹھا ہوتا جاتا ہے، اخروٹ سے ذرا چھوٹا ہوتا ہے، چیت میں اس کے پھول لگتے ہیں اور جاڑوں کے شروع میں اس کے پھل پکتے ہیں، اس کے درخت میں ایک قسم کا گوند لگتا ہے، پتوں کا مزہ ترش اور نہایت بکسا ہوتا ہے، پھول بھی ترش مزہ ہوتے ہیں، کونپلوں اور پھولوں کو پکا کر کھاتے ہیں، مچھلی میں ڈالنے سے نہایت خوش ذائقہ معلوم ہوتے ہیں، امڑے کا درخت بنگال میں کثرت سے ہوتا ہے۔

مزاج: سرد دوسرے درجہ میں خشک پہلے درجہ میں۔

فوائد: امڑہ صفراوی دستوں کو نافع ہے اور صفراوی بیماریوں کو کھوتا ہے، گرم مزاج والوں کے موافق ہے، اس کے پھل کی مینگ کھلانے سے وہ ضعف ہاضمہ دفع ہوجاتا ہے، جو صفرا کی وجہ سے ہوتا ہے، پتوں کا سفوف اور چھال کا جوشاندہ دستوں میں اگر آنوں آتی ہے تو اسے دینے سے فائدہ ہوتا ہے، اس کا گوند دوا کی تیزی کو کم کرنے کے لیے اس میں ملایا جاتا ہے۔ اگر کان میں بادی کی وجہ سے درد ہو تو اس کے پتوں کا رس باہر کی طرف لگانا چاہیے اور اندر بھی ڈالنا چاہیے، اس کے پھل کو پیس کر زہر میں بجھے ہوئے تیر کے زخم پر لگانے سے فائدہ ہوتا ہے، اس کے زہر کو اتارنے کے لیے سوکھا یا تر و تازہ پھل کھلاتے ہیں۔ اگر اس کا پھل نہ ملے تو اس کی جگہ پھٹکری کام میں لاتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بدن پر ایسے زخموں کو کسیلی چیزیں فائدہ پہنچاتی ہیں، مسوڑھوں کا درد دور کرنے کے لیے اس کے پھل کو جوش دے کر مل کر چھان کر یا سرد پانی میں بھگو کر مل کر چھان کر یا گرم پانی میں بھگو کر مل کر چھان کر اس سے کلیاں کرانا چاہیے۔ اس کے پھل کی چٹنی بنائی جاتی ہے، اس کا کچا پھل کھانے کے کام آتا ہے، اس کی گٹھلی کی مینگ خون حیض بند کرتی ہے، اس پھل کے زیادہ کھانے سے بدن میں خارش پیدا ہوتی ہے۔

بعض وید کہتے ہیں کہ دودھ بڑھاتا ہے، معدے کو قوت دیتا ہے، بھوک زیادہ کرتا ہے، بعض ویدوں کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امڑے کا پھل صفرا پیدا کرتا ہے۔

اس کے درخت کی دو تولہ چھال پیس کر بکری کے دودھ کے ساتھ کھانا تین روز تک مرض اہوہ کو مٹاتا ہے اور ایسے مریض کے سر اور ہتھیلی اور تلوؤں پر بھی ملتے ہیں، اہوہ ایک مرض ہے جو بنگال میں پیدا ہوتا ہے، ناک میں پھنسی پیدا ہوکر بہت درد اور تیز تپ ہوتی ہے۔

■

ماخذ: علاج بذریعہ غذا، **مصنف:** حکیم احتشام الحق قریشی، **دوسرا ایڈیشن:** 2006، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

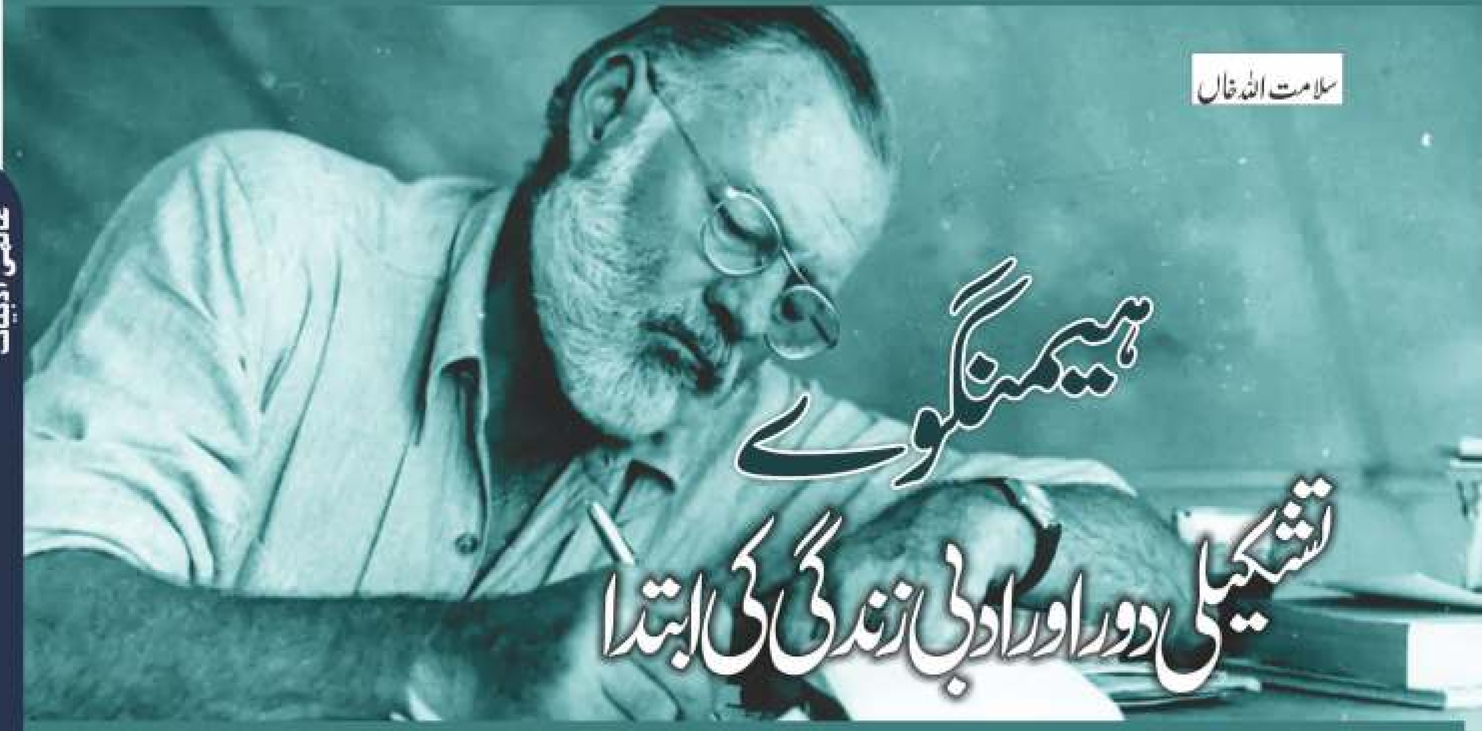

ہیمنگوے
تشکیلی دور اور ادبی زندگی کی ابتدا

سلامت اللہ خاں

ارنیسٹ ملر ہیمنگوے (Krnest Miller Heming Way)، 21 جولائی 1899 کو شکاگو کے نواحی قصبہ اوک پارک (Oak Park) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈاکٹر کلیرنس ایڈمنڈس ہیمنگوے (Clarence Edmonds Hemingway) معالج تھے جنھوں نے شکاگو کے میڈیکل کالج سے ایم۔ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی اور اوک پارک میں پریکٹس کرتے تھے۔ ان کو سکے اور ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا لیکن ان کو خصوصی دلچسپی ہر طرح کے شکار اور کھانا پکانے سے تھی۔

ارنیسٹ کی والدہ گریس ہیمنگوے (Grace Hemingway) نے اوک پارک ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی مدھم سر (Contralto) آواز بہت اچھی تھی، اس لیے ان کے اساتذہ نے ان کی ہمت افزائی کی تھی کہ وہ موسیقی کو اپنا کیریئر (Career) بنائیں اور اوپیرا (Opera) میں حصہ لیں۔ بچپن میں ان کو قرمزی بخار (Scarlet Fever) ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں کمزور ہوگئی تھیں اور تیز روشنی میں ان کے سر میں درد ہو جاتا تھا۔ اسٹیج کی فٹ لائٹ کو بھی وہ برداشت نہیں کر پاتی تھیں۔ وہ اچھے ڈیل ڈول کی خاتون تھیں۔ ان کے نقش و نگار نمایاں اور آنکھیں نیلی تھیں۔ موسیقی سے گہرے شغف کے علاوہ ان کو مذہب سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ مقامی گرجا گھر کی سرگرم رکن تھیں اور اس کے فلاحی کاموں میں پر جوش حصہ لیتی تھیں۔

ڈاکٹر ہیمنگوے سے ان کی شادی اکتوبر 1896 میں ہوئی اور شادی کے بعد ڈاکٹر ہیمنگوے اپنی سسرال منتقل ہوگئے جو ان کے والدین کے گھر کے سامنے سڑک کے پار تھی۔ ارنیسٹ ہیمنگوے کی ولادت ننھیال میں ہوئی۔

پیدائش کے وقت وہ تندرست تھے۔ ان کا وزن ساڑھے نو پونڈ اور قد تیئس انچ تھا۔ بچپن میں وہ نہایت لطف اندوزی سے کھاتے، سوتے اور کھیلتے تھے۔ وہ بہت خوش مزاج تھے۔ وہ ناچتے، کودتے اور لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہوکر دوڑتے اور شیر کی آواز میں گرجتے تھے۔ رات میں سونے سے پہلے وہ اپنی والدہ کے ساتھ دو زانو ہوکر دعا میں شریک ہوتے تھے، لیکن ایک دو دعائیہ جملوں کے بعد ہی 'آمین' کہہ کر بستر پر چڑھ جاتے تھے۔ دو سال سے کچھ کم عمر میں ہی وہ 'ہگ۔ہگ' کرتے بھیڑوں کو ہانکتے دیکھے گئے۔ تین سال کی عمر میں یہ پوچھے جانے پر کہ وہ کس چیز سے ڈرتے ہیں، وہ بڑے جوش اور یقین

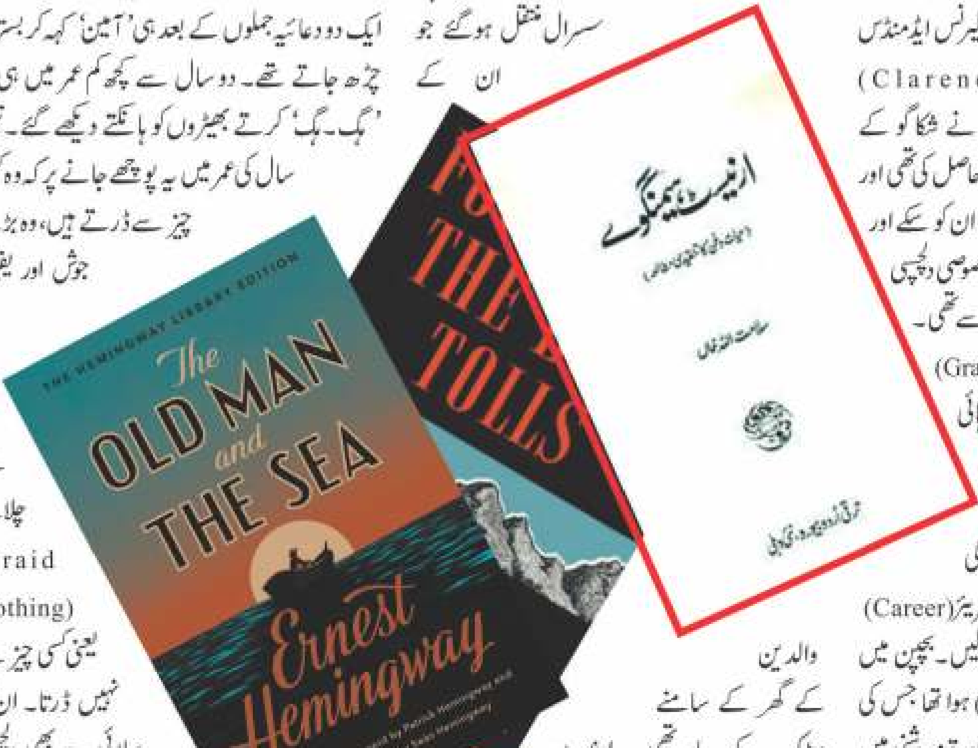

سے چلاتے (Fraid Nothing) یعنی کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ ان کو سلائی سے بھی دلچسپی تھی اور سلائی کے کمرے میں ان کی والدہ نے ایک پرانی پتلون رکھ چھوڑی تھی جس پر وہ اپنی سلائی کی مشق ستم فرماتے تھے۔ تیسری سالگرہ پر وہ اپنے والد کے ساتھ مچھلی کے شکار پر پہلی مرتبہ گئے۔ ساڑھے پانچ

سال کی عمر میں وہ بغیر کسی مدد کے اپنا لباس تبدیل کر لیتے تھے۔ لکڑی کے گتوں سے وہ قلعے اور توپیں بنایا کرتے تھے۔ سرکس دیکھ کر آتے تو ہاتھی کی چال کی نقل اتارتے تھے اور بڑے انہماک سے قلابازیاں کھاتے تھے۔ وہ ہر طرح کی کہانی بڑے شوق سے سنتے تھے۔ چڑیوں کی ایک باتصویر کتاب ان کی پسندیدہ تھی جس میں دیکھ کر وہ چڑیوں کو پہچان لیتے تھے۔ وہ ایک نیچر اسٹڈی (Nature Study) گروپ کے بھی ممبر تھے اور اپنے سے بڑی عمر کے لڑکوں کے ساتھ، اپنے والد کے ہمراہ جنگلوں میں جاتے تھے اور جھاڑیوں میں چڑیوں کو پہچاننے اور ان کا نام یاد رکھنے کی سعی کرتے تھے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کے بچپن کی بیشتر خصوصیات غیر معمولی حد تک بڑی عمر میں بھی قائم رہیں۔ ان کا یہ قول کہ ان کو کسی چیز کا ڈر نہیں ان کے ضابطۂ عمل کے لیے مشعل راہ رہا اور زندگی کی ہر مصیبت اور افتاد میں وہ اس پر کاربند رہے۔ وہ تمام عمر جرأت، حوصلہ مندی اور قوت برداشت کے حامی رہے جس کی تعلیم بچپن ہی سے ان کے ذہن پر نقش ہوگئی تھی۔ اس طرح فطرت کے خارجی مناظر سے محبت اور سیر و شکر کا شوق ان کو بچپن ہی سے تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے جنگلوں کی وسعت میں، جھیل اور سمندر کی سطح پر، آزادی کا احساس اور اس سے حاصل کردہ مسرت تمام زندگی وہ محسوس کرتے رہے۔ اپنے والد کی طرح وہ کھانے کے شوقین تھے اور بچپن ہی سے مچھلی، جس کو وہ فش کے بجائے ہش (Hish) کہتے تھے، اور شکار کا گوشت انھیں بہت پسند تھا۔ کچے جنگلی پیاز کے سینڈوچ جو ان کے والد نے بنانا سیکھا تھا وہ ہمیشہ ان کو مرغوب رہے۔ جسمانی محنت کے کام وہ نوجوانی کے بعد بالعموم نہیں کرتے تھے، لیکن ان کو ایسے کھیلوں سے دلچسپی تھی جس میں جسمانی مشقت لازمی تھی۔ ان کو تیراکی چہل قدمی، ہائیکنگ (Hiking) سے عمر بھر محبت رہی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے ذہن صاف اور جسم صحت مند رہتا ہے۔ وہ ہر کام خوش اسلوبی سے کرنے کے قائل تھے اور ان سب کی تعلیم ان کے والد نے ان کو بچپن میں دی تھی۔ موسیقی کے معاملے میں وہ بچپن ہی سے کمزور تھے اور اپنے والد کی طرح ہمیشہ بے سرے رہے حالانکہ ان کی والدہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اس فن میں مہارت حاصل کریں، لیکن مصوری، خصوصاً روغنی تصویر (Oil Painting)

وہ ہر طرح کی کہانی بڑے شوق سے سنتے تھے۔ چڑیوں کی ایک باتصویر کتاب ان کی پسندیدہ تھی جس میں دیکھ کر وہ چڑیوں کو پہچان لیتے تھے۔ وہ ایک نیچر اسٹڈی (Nature Study) گروپ کے بھی ممبر تھے اور اپنے سے بڑی عمر کے لڑکوں کے ساتھ، اپنے والد کے ہمراہ جنگلوں میں جاتے تھے اور جھاڑیوں میں چڑیوں کو پہچاننے اور ان کا نام یاد رکھنے کی سعی کرتے تھے۔

کی قدر شناسی میں وہ کافی درک رکھتے تھے۔ اسی طرح تخلیقی عمل کا ذوق ان کو اپنی والدہ سے وراثت میں ملا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا رجحان افسانوی ادب کی طرف تھا جو ان کی والدہ کے لیے ہمیشہ حیران کن رہا۔

گرامر اسکول میں اپنی تعلیم کی ابتدائی منزلیں طے کرنے کے بعد ہیمنگوے ستمبر 1913 میں اوک پارک کے ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ان کے مضامین الجبرا، لاطینی، انگریزی اور جنرل سائنس تھے۔ وہ انگریزی کے علاوہ بقیہ سبھی مضامین سے خائف تھے۔ لاطینی زبان انھیں اتنی مشکل معلوم ہوئی کہ ان کی والدہ کو ایک نجی اتالیق مقرر کرنا پڑا تاکہ ابتدا صحیح ہو۔ ہیمنگوے کی دلچسپیاں متنوع تھیں۔ وہ فٹ بال ٹیم میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ اسکول آرکیسٹرا کی رکنیت کے لیے چیلو (Cello) پر مستعدی سے مشق کرتے تھے۔ رقص کے ایک اسکول میں اپنی بڑی بہن مارسیلین (Marcelline) کے ساتھ رقص سیکھنے بھی جایا کرتے تھے۔ ایک ہائیکنگ کلب (Hiking Club) کے بھی ممبر تھے اور اکثر سنیچر کو پچیس یا تیس میل کے گل گشت پر جایا کرتے تھے۔ ان کی خصوصی دلچسپی مچھلی کے شکار سے تھی جس کے لیے وہ جھیل مشی گن (Lake Michigan) اپنے ساتھیوں کے ساتھ تعطیلات میں جاتے تھے۔ اس جھیل سے ملی ہوئی ان کے والد کی جائیداد تھی اور اس پر ایک کاٹج بھی تھی جس کا نام ونڈی میر (Windemere) تھا، لیکن ارنیسٹ جھیل کے کنارے خیمہ لگا کر رہتے تھے۔ 1916 میں انھوں نے مکے بازی سیکھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے یہ فن شکاگو کے پیشہ ور مکے بازوں سے سیکھا اور یہ کہ ان کی بائیں آنکھ مکے بازی میں لگی چوٹ سے کمزور ہوگئی تھی۔ یہ دونوں من گھڑت کہانیاں تھیں۔ ان کی بائیں آنکھ پیدائشی کمزور تھی اور یہ کمزوری دوسرے بہن بھائیوں میں بھی تھی۔ پیشہ ور مکے بازوں سے سیکھنے کا ثبوت نہ دورانِ تعلیم میں کہیں ملتا ہے اور نہ کبھی بعد میں۔ اپنے مضبوط اور جری ہونے کے دعوے میں ہیمنگوے اکثر بے پر کی اڑاتے تھے اور ان جھوٹی کہانیوں کو اتنے اعتماد سے بیان کرتے تھے کہ سننے والے کو یقین آجاتا تھا۔

یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہیمنگوے کی صحافتی نوآموزی اور افسانہ نویسی کی ابتدا ان کی طالب علمی کے زمانے میں ہوئی۔ وہ اپنے اسکول سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار ٹریپیز (The Trapeze) کے نامہ نگار تھے جس کے لیے آخری سال میں وہ ہر ہفتہ واقعہ نویسی کرتے تھے۔ رسالہ ٹیبولا (Tabula) میں ان کی تین ابتدائی کہانیاں شائع ہوئی تھیں۔ پہلی کہانی 'رنگ کا معاملہ' (A Matter of Colour) مزاحیہ کہانی تھی۔ بوڑھے مکے باز باب نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ایک ہونہار نوعمر مکے باز ڈان کا مقابلہ ایک نیگرو جو سے ہوا۔ ڈان کو فتح یاب کرنے کے لیے ایک مضبوط سویڈ (Swede) کو پردے کے پیچھے ایک کنارے خفیہ طور پر کھڑا کیا گیا تاکہ وہ جو کو موقع پاکر بیس بال کے بلے سے مار کر گرا دے۔ مگر سویڈ نے غلطی سے ڈان کو مار گرایا۔ جب انتہائی خفگی سے باب نے اس کی وجہ پوچھی تو سویڈ نے بتایا کہ وہ رنگ اندھا (Colour Blind) ہے۔ دوسری کہانی ایک امریکی انڈین کی ہے جس کو شبہ ہے کہ اس کے ساتھی نے اس کا بٹوہ چرایا ہے۔ وہ اسے ایک جال میں پھنسا دیتا ہے۔ بعد میں یہ معلوم ہونے پر کہ اس کے بٹوے کی چور ایک گلہری ہے، وہ اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے دوڑتا ہے

لیکن جنگلی بھیڑیئے اس کا کام تمام کر چکے ہوتے ہیں۔ وہ احساس جرم سے خود کو ریچھ پھنسانے والے جال میں پھنسا دیتا ہے۔ کہانی کے اختتام پر قبل اس کے کہ بھیڑیئے اس پر حملہ کریں، وہ خودکشی کے ارادے سے اپنی رائفل اٹھاتا نظر آتا ہے۔ تیسری کہانی ایک کتے کی ہے جو اپنے مالک کی ایک قاتل سے انتقال میں مدد کرتا ہے۔ ان تینوں کہانیوں میں کسی نہ کسی شکل میں تشدد کا بیان ہے۔ ان سب میں باضابطہ پلاٹ ہے اور ان کے بیان میں ایج اور جدت پسندی نمایاں ہے۔ ان کہانیوں اور اخبار کی واقعہ نویسی سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہیمنگوے کا شروع ہی سے رجحان صحافت اور افسانہ نگاری کی طرف تھا۔

II

1917 میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے لیے تین راستے اختیار کرنے کے لیے کھلے تھے۔ وہ کالج میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے تھے، جیسا کہ ان کے والد چاہتے تھے۔ وہ عالمی جنگ میں شریک ہوسکتے تھے حالانکہ ان کے والدان کی نوعمری کی وجہ سے اس کے شدید مخالف تھے۔ یا پھر وہ اپنا پسندیدہ ذریعہ معاش اختیار کرسکتے تھے۔ امتحان کے بعد ہی جون 1917 میں انھوں نے اپنے چچا کے ذریعہ کینسس (Kansas) شہر کے اخبار اسٹار (Star) میں نامہ نگار کی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ستمبر تک وہاں کوئی جگہ خالی ہونے والی نہیں تھی۔ موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے والد کے فارم پر کام کرنے کے بعد ہیمنگوے نے بالآخر یہی طے کیا کہ وہ اخبار اسٹار میں کام کریں۔ اوک پارک کی محدود قصباتی زندگی میں وہ پلے بڑھے تھے اور وہاں سے نکل کر وہ اپنے تجربات کو وسعت دینا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ خیال بھی تھا کہ اس طرح وہ خاندانی رشتوں اور اس کے دباؤ سے آزاد ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ اب تک انھوں نے صحافت اور افسانہ نگاری کے بنیادی اور ابتدائی اصول عملاً سیکھے تھے اور انھیں بہت کچھ سیکھنا تھا۔ ان مقاصد کے پیش نظر وہ کینسس شہر روانہ ہوگئے اور ان کے غمزدہ والد نے ان کو رخصت کیا۔ وہاں پہنچ کر انھیں نامہ نگار کی جگہ پندرہ ڈالر فی ہفتہ تنخواہ پر مل گئی۔ شروع میں ان کو جرائم اور حادثات پر رپورٹ پیش کرنے کا موقع ملا اور وہ برابر پولیس کوتوالی، ریلوے اسٹیشن اور جنرل اسپتال کے چکر لگاتے رہتے تھے۔ اس سے زندگی کے تشدد آمیز اور ناخوشگوار پہلو سے ان کی واقفیت ہوئی اور کچھ مشتبہ اور بدنام لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی جو ناجائز کاروبار کرتے تھے۔

ہیمنگوے تجربہ کار اور پرانے صحافیوں سے برابر دریافت کرتے رہتے تھے کہ وہ کس طرح واقعات معلوم کرتے ہیں اور اسے کس طرح اخبار کے لیے لکھتے ہیں۔ اخبار اسٹار کا طرز تحریر کے بارے میں اپنا ہدایت نامہ (Style-Book) بھی تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح توضیحی جملہ لکھنا چاہیے، کس طرح فرسودہ صفت اور توصیفی فقروں سے پرہیز کرنا چاہیے اور کس طرح بیان کو دلچسپ بنانا چاہیے۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کامیاب نامہ نگاری کے لیے یہ ضروری تھا کہ چھوٹے

گرامر اسکول میں اپنی تعلیم کی ابتدائی منزلیں طے کرنے کے بعد ہیمنگوے ستمبر 1913 میں اوک پارک کے ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ان کے مضامین الجبرا، لاطینی، انگریزی اور جنرل سائنس تھے۔ وہ انگریزی کے علاوہ بقیہ سبھی مضامین سے خائف تھے۔ لاطینی زبان انھیں اتنی مشکل معلوم ہوئی کہ ان کی والدہ کو ایک نجی اتالیق مقرر کرنا پڑا تاکہ ابتدا صحیح ہو۔

جملے اور مختصر پیراگراف لکھے جائیں۔ توانا اور کارگر زبان استعمال کی جائے۔ الفاظ کی نشست پر نظر رکھی جائے تاکہ بیان کی ہمواری اور اس کا تسلسل مجروح نہ ہو۔ بیان منفی کی بجائے اثباتی ہونا چاہیے تاکہ واقعات کا بیان قطعی اور مطلق ہو۔ اس کے علاوہ اسٹار کے دفتر میں ایک ادبی شعبہ بھی تھا جہاں نئی اور پرانی کتابوں کے اقتباسات اور امریکی و غیرملکی اخبارات و رسائل سے ایسے ٹکڑے منتخب کیے جاتے تھے جو پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے استعمال کیے جاسکیں۔ اس طرح اسٹار کی نامہ نگاری کے دور میں ہیمنگوے نے فن صحافت کی تعلیم حاصل کی اور ایسی نثر لکھنا سیکھا جو صاف ستھری، صریح اور ابہام سے پاک ہو اور جس میں کم سے کم الفاظ میں مفہوم کی مکمل ادائیگی کی گئی ہو۔ یہ فنی انضباط اور مشق ان کی آئندہ ادبی زندگی کے لیے بہت مفید اور کارگر ثابت ہوئی۔ اس زمانے کے تجربات کی بنیاد پر انھوں نے آئندہ چل کر تین خاکے لکھے جس میں قابل ذکر خاکہ 'حضرات، خدا تمھیں خوش رکھے' (God Rest You Merry, Gentlemen) تھا۔

اسٹار کی نامہ نگاری کے زمانے میں وہ جنگ کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے اور یہ پوچھتے رہتے تھے کہ وہ کس طرح اس میں شریک ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بہن کو ایک خط میں لکھا ''میں اتنے بڑے تماشے کو بغیر اپنی شرکت کے نہیں گزرنے دوں گا۔'' بالآخر وہ ریڈ کراس (Red Cross) میں بہ حیثیت ایمبولنس ڈرائیور بھرتی ہوگئے اور تین ہفتے کی ٹریننگ کے بعد 23 مئی 1918 کو شکاگو نامی فرانسیسی جہاز سے بوغدو (Bordeaux) کے لیے روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچ کر رات کی گاڑی سے پیرس کے لیے چل پڑے۔ دو دن کے انتظار کے بعد وہ میلان (Milan) پہنچے اور تمام راستے گاڑی کے کھلے دروازے سے باہر پیر لٹکائے گاتے اور ہنستے رہے، جیسے وہ اور ان کے ساتھی سیر و تفریح کے لیے نکلے ہوں۔ میلان کے قریب ایک گولہ بارود کی فیکٹری آتشی دھماکے سے اڑ گئی تھی۔ ہیمنگوے اور ان کے ساتھیوں کا یہ کام تھا کہ پہلے وہ اس آگ کو بجھائیں جو قریب کی لمبی گھاس میں پھیل گئی تھی اور اس کے بعد مرے ہوئے لوگوں کی لاشیں اکٹھا کریں۔ ان مرنے والوں میں سب عورتیں تھیں۔ ہیمنگوے نے اب تک صرف چڑیوں اور چھوٹے جانوروں کا شکار کیا تھا اور انھیں مرا ہوا دیکھا تھا۔ جنگ کا یہ پہلا دہشت انگیز نظارہ تھا جہاں انھوں نے اتنی بہت سی عورتوں کو مردہ دیکھا۔

بہ حیثیت ایمبولنس ڈرائیور ان کا کام زخمی سپاہیوں کو محاذ جنگ سے پیچھے میدانی اسپتالوں میں لانا تھا۔ ہیمنگوے بہت جلد اس کام سے اکتا گئے جیسا کہ انھوں نے ایک ساتھی کو بتایا کہ ایمبولنس سیکشن سے نکل کر 'وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اس جگہ کو ڈھونڈھ سکتے ہیں یا نہیں جہاں جنگ ہے' ان کی یہ آرزو جلد ہی پوری

ہوگئی اور وہ ایک گاؤں فوسالٹا (Fossalta) کے پاس ریڈ کراس کی قائم کردہ کینٹین (Canteen) پر منتقل ہوگئے۔ یہاں ان کی ملاقات ایک نوعمر پادری سے ہوئی جو فلورنس کے رہنے والے تھے اور جن سے بعد میں ان کی دوستی ہوگئی۔ ان کا کام محاذ جنگ کی خندقوں میں تعینات سپاہیوں کو سگرٹ، چاکلیٹ اور پوسٹ کارڈ وغیرہ بانٹنا تھا اور اس کام میں وہ برابر دشمن کی گولیوں اور بموں کی زد میں رہتے تھے۔ 8 جولائی 1918 کو آدھی رات کے قریب جب وہ خندق میں سپاہیوں کو سگرٹ وغیرہ بانٹ رہے تھے۔ ہیمنگوے مارٹر (Mortar) کے ایک بم پھٹنے سے بری طرح زخمی ہوئے۔ قریب ہی ایک زخمی سپاہی پڑا کراہ رہا تھا۔ اپنے زخموں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھوں نے زخمی سپاہی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور چل پڑے۔ وہ پچاس گز گئے ہوں گے کہ ان کے داہنے گھٹنے کی چپنی میں مشین گن کی گولی لگی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ وہ پھر اٹھے اور سو گز مزید چل کر کمانڈ پوسٹ (Command Post) پر زخمی سپاہی کو اتارا جو مر چکا تھا اور خود بیہوش ہوگئے۔

وہ بہ وقت تمام ایک میدانی اسپتال میں پہنچائے گئے۔ جہاں ان کے پیر سے اٹھائیس لوہے کے ٹکڑے نکالے گئے۔ پانچ دن کے بعد وہ ملانو (Milano) کے اسپتال میں منتقل ہوگئے۔ یہاں ان کے دو بڑے آپریشن ہوئے جس میں ان کے پیر کے تکوے اور گھٹنے کی چپنی سے مشین گن کی گولیاں نکالی گئیں۔ ملانو کے اسپتال ہی میں ان کو اطلاع ملی کہ شجاعت کے لیے سب سے بڑے اطالوی انعام چاندی کے تمغے کے لیے ان کے نام کی سفارش کی گئی جو انھیں جلد ملے گا۔

اسی اسپتال کی ایک امریکی نرس ایگنس حناوان کوروسکی (Agnes Hannah Von Kusowsky) سے ہیمنگوے کو شدید محبت ہوگئی لیکن یہ محبت اس تیزی سے پروان نہ چڑھ سکی جتنی کہ وہ چاہتے تھے۔ کچھ تو اسپتال کی عائد کردہ پابندیاں تھیں جو راہ میں حائل تھیں۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایگنس نے رضا کارانہ اپنی خدمات فلورنس کے ایک اسپتال کو پیش کردی تھیں اور جلد ہی وہ وہاں چلی گئیں۔ ہیمنگوے دوبارہ محاذ جنگ پر گئے لیکن ایک ہفتے کے اندر یرقان میں مبتلا ہوکر ملان اسپتال لوٹ آئے۔ 3 رنومبر 1918 کو اٹلی اور آسٹریا کے درمیان صلح ہوگئی۔ ہیمنگوے کو معلوم تھا کہ اٹلی میں اب

اسٹار کی نامہ نگاری کے دور میں ہیمنگوے نے فن صحافت کی تعلیم حاصل کی اور ایسی نثر لکھنا سیکھا جو صاف ستھری، صریح اور ابہام سے پاک ہو اور جس میں کم سے کم الفاظ میں مفہوم کی مکمل ادائیگی کی گئی ہو۔ یہ فنی انضباط اور مشق ان کی آئندہ ادبی زندگی کے لیے بہت مفید اور کارگر ثابت ہوئی۔

وہ صرف کچھ دن قیام اور کرسکتے ہیں۔ ایگنس نے ہیمنگوے کو برابر ہی صلاح دی کہ وہ امریکہ واپس چلے جائیں۔ اور دبے چھپے الفاظ میں یہ بھی اشارہ کیا کہ ایک یا دو سال میں ممکن ہے کہ ان کی شادی ہوجائے حالانکہ وہ عمر میں ہیمنگوے سے سات سال بڑی تھیں۔

21 جنوری 1919 کو جب ہیمنگوے واپس وطن لوٹے اور نیویارک میں سمندری جہاز سے اترے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک نامور شخصیت ہوگئے ہیں۔ وہ پہلے امریکی تھے جو اٹلی میں زخمی ہوئے تھے اس لیے ان کے بارے میں امریکی اخباروں میں بڑھ چڑھ کر نشر و اشاعت ہوئی تھی۔ ملک میں ایک نیوز ریل (Newsreel) بھی دکھائی گئی تھی جس میں وہ ملانو کے اسپتال میں پیر پر پلاسٹر چڑھوائے ہوئے ایک پہیے دار کرسی پر بیٹھے ہیں۔ اوک پارک پہنچنے پر ان کا ہیرو جیسا خیر مقدم کیا گیا۔ ان کے اعزاز میں جلسے کیے گئے جس میں انھیں اپنے جنگ کے تجربات بیان کرنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن مارچ 1919 میں انھیں ایک شدید جذباتی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ ایگنس سے ان کی خط و کتابت جاری تھی اور مارچ میں انھوں نے بڑی نرمی سے لکھا کہ ان کو ایک اطالوی افسر سے محبت ہوگئی ہے اور وہ جلد ہی شادی کرنے والی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ شاید ہیمنگوے اس وقت اسے نہ سمجھ سکیں لیکن آئندہ کسی دن شاید وہ انھیں معاف کردیں اور ان کے شکر گزار ہوں۔ اس صدمے سے ہیمنگوے بیمار ہوگئے۔ جب وہ بیماری سے اٹھے تو ان کا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے ایگنس کو شراب اور دوسری عورتوں کی مدد سے بھلا دیا ہے لیکن یہ صرف کہنے کی بات تھی اور جھوٹا افسانہ تھا۔ سچائی صرف اتنی تھی کہ بے وفائی کے صدمے سے ان کی محبت کا نشہ ہمیشہ کے لیے اتر گیا تھا کیونکہ جون میں جب ایگنس نے اپنی محبت اور مجوزہ شادی کی ناکامی کی تفصیل خط میں لکھی تو ہیمنگوے نے صرف ہمدردی کا اظہار کیا اور ان کے مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا۔

وہ افسانہ نگاری کی طرف پھر رجوع ہوئے اور سیر و شکار کے ساتھ لکھنے کی برابر کوشش کرتے رہتے تھے۔ اٹلی میں ان کے پیر کے بارہ آپریشن ہوچکے تھے لیکن وہ اب بھی چلنے میں لنگڑاتے تھے۔ ان کو اندھیرے میں نیند نہیں آتی تھی اور وہ رات میں اکثر بھیانک خواب دیکھتے تھے۔ وہ کچھ دنوں کے لیے شمالی مشی گن میں رہے جہاں ان کا وقت مطالعہ، مچھلی کے شکار اور اپنے مستقبل کے بارے میں غور و فکر میں گزرتا تھا۔ بالآخر یہ بات ان کے ذہن میں صاف ہوگئی کہ انھیں افسانوی ادب کی تخلیق کرنا ہے اور اس میں کامیابی حاصل کرنا ہے، لیکن جب تک وہ اس قابل نہیں ہوجاتے کہ صرف افسانہ نگاری سے اپنے مصارف پورے کرسکیں، ان کو بہ حیثیت صحافی کام کرنا چاہیے اور اپنے بچے ہوئے اوقات میں ادب کی تخلیق کرنا چاہیے۔ موسم گرما اور خزاں میں وہ برابر اپنے تجربات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی سعی کرتے رہے۔ موسمِ سرما میں وہ کناڈا گئے جہاں ان کا تعارف ٹورانٹو سے شائع ہونے والے روزنامہ اور ہفتہ وار اخبار ٹورانٹو اسٹار ویکلی (Star Weekly) اور اسٹار روزنامہ (Daily Star) کے ایڈیٹر سے ہوا اور انھوں نے کچھ مزاحیہ اور طنزیہ فیچر اس اخبار کے لیے لکھے۔ اس اخبار میں پر لطف اور چٹ پٹے واقعات کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور نامہ نگاروں سے خصوصی تاکید کی جاتی تھی کہ وہ ایسے واقعات لکھیں جن میں انسانی دلچسپی کا پہلو نمایاں ہو۔ اخبار کی اس پالیسی کے پیش نظر ہیمنگوے کی صحافتی تحریروں میں ایک نیا عنصر نمودار ہوا۔ ان کے مضامین اور فیچر کہانی سے قریب تر ہوتے گئے جس میں مکالمہ بھی ہوتا تھا اور ان لوگوں کا مختصر خاکہ بھی جن کے بارے میں وہ لکھتے تھے۔

1920 میں وہ شکاگو لوٹ آئے اور ایک مقامی

اخبار میں کام کرنے لگے۔ ان کی ملاقات ایلیز بتھ ہیڈلے رچرڈسن (elizbeth Hidlay Richard-Son) سے ہوئی جو اپنی والدہ کے انتقال کے بعد اپنی ایک ساتھی لڑکی سے ملاقات کے لیے شکاگو آئی ہوئی تھیں۔ بقول ہیڈلے، ہیمنگوے نے ان کو تین وجوہات کی بنا پر پسند کیا۔ ان کے بال سرخ تھے۔ وہ لمبا گھاگھرا (Skirt) پہنتی تھیں اور وہ اچھا پیانو بجاتی تھیں۔ تین ہفتے بعد وہ سینٹ لوئی (St Louis) لوٹ گئیں لیکن ہیمنگوے سے خط و کتابت ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ ان کی محبت بڑھتی گئی اور 3 ستمبر 1921 کو ان کی شادی ہوگئی۔ ہیڈلے کی عمر اس وقت انتیس سال تھی اور ہیمنگوے سے سات سال عمر میں بڑی تھیں۔ وہ لمبے قد کی صحت مند اور دل کش خاتون تھیں اور اپنے والد مرحوم کے قائم کردہ ٹرسٹ فنڈ سے ان کی دو تین ہزار ڈالر سالانہ کی ذاتی آمدنی تھی۔ شادی کے بعد دونوں نے اٹلی کی سیاحت کا قصد کیا لیکن اس کے لیے صرف ہیڈلے کی آمدنی کافی نہیں تھی۔ ہیمنگوے نے ٹورانٹو اسٹار روزنامہ کو اس بات پر رضامند کرلیا کہ وہ اس کے یوروپی گشتی مراسلہ نگار ہوجائیں اور اپنا ہیڈ کوارٹر پیرس میں رکھیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ مراسلہ کے لیے مروجہ شرح پر ان کو رقم دی جائے گی اور سفر خرچ وغیرہ بھی دیا جائے گا جو اس سلسلے میں ہوگا۔ ہیمنگوے کے لیے یہ بات بے حد اطمینان بخش تھی۔ ان دونوں شکاگو میں شیر وڈ اینڈرسن (Sherwood Anderson) بھی رہتے تھے جن سے ہیمنگوے کی ملاقات تھیں۔ اینڈرسن نے ان کو تعارفی خطوط دیے اور بتایا کہ پیرس میں دریائے سین کے بائیں کنارے (Left Bank) پر کئی مشہور تارک وطن رہتے تھے۔ وہاں ہیمنگوے بھی رہ کر لکھ سکتے تھے۔ سفر کے انتظامات مکمل ہوتے ہی ہیمنگوے اور ہیڈلے یوروپ کے لیے دسمبر 1921 میں روانہ ہوگئے۔

III

پیرس پہنچنے کے بعد 1921 سے 1923 کا زمانہ ہیمنگوے کی ادبی نوآموزی کا دوسرا اور نسبتاً اہم دور تھا۔ اپنی تخلیقات کے صحیح ادبی معیار کو قائم رکھنے کے لیے انھوں نے افسانوی ادب کے ماہر نثر نگاروں کا بغور مطالعہ کیا۔ یہ لکھنے والے ترگنیف (Turgenev)، چیخوف (Chekov)، ٹالسٹائی (Tolstoy) اور دوستووسکی (Dostoevsky)، اسٹنڈ ہال (Stendhal)، بالزک (Balzac) اور فلابیئر (Flauberi)، مارک ٹوین (Mark Twain)، اسٹیفن کرین (Stephen Crane) اور ہینری جیمس (Henry James)، ٹامس مان (Tomas Mann)، جوزف کونارڈ (Joseph Conard) اور جیمس جوائس (James Joyace) تھے۔ ان تمام لکھنے والوں سے انھوں نے کسی نہ کسی شکل میں کچھ ضرور سیکھا تھا لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ انھوں نے ان میں سے کسی مصنف کی طرز تحریر کا تتبع کیا تھا۔ ان کا اسلوب بیان اچھوتا اور بدیع تھا کیونکہ انھوں نے اپنی سعی اور مشق سے نثر نگاری میں ایک نئی راہ نکالی تھی۔ لیکن یہ بات بلاشبہ صحیح ہے کہ

شکاگو کے زمانے سے اب تک کی غیر مطبوعہ نظموں اور افسانوں کا مسودہ جو مسز ہیمنگوے کے ہمراہ ایک سوٹ کیس میں تھا، وہ سفر کے دوران چوری ہوگیا۔ چند نظمیں اور دو کہانیاں جس میں سے ایک اشاعت کے لیے بھیجی جاچکی تھی، اس حادثے سے بچ گئی تھیں۔ 1923 میں ہیمنگوے نے اس میں ایک کہانی اور کچھ نظموں کا اور اضافہ کیا اور تین کہانیاں اور دس نظمیں (Theree Stories and Ten Poems) کے عنوان سے ان کا یہ ملا جلا مجموعہ شائع ہوا۔

ان مشاہیر کی تخلیقات کی مدد سے اور ان کی اعلیٰ مثال کی روشنی میں ہیمنگوے نے اپنے تنقیدی اور جمالیاتی نظریات کی تشکیل کی تا کہ ان کی کسوٹی پر وہ اپنی تخلیقات کا جائزہ لے سکیں۔ دریائے سین کے بائیں کنارے پر رہنے والوں میں ایزرا پاؤنڈ (Ezra Pound) اور گرٹروڈ اسٹین (Gertrude Stein) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پاؤنڈ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے تھے اور ان کی تخلیقات کی اشاعت میں ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ گرٹروڈ اسٹین نہایت سنجیدگی سے ہمیشہ صحیح رائے اور مشورہ دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ ان دونوں کو ہیمنگوے نے اپنی چند نظمیں، کہانیاں اور ایک ناول کا ابتدائی حصہ پڑھنے کے لیے دیا اور ان کی رائے مانگی۔ پاؤنڈ نے ان کی نظموں کو پسند کیا اور ان کی نثر کی تازگی کو سراہا لیکن گرٹروڈ نے بلا کسی جھجک کے یہ رائے دی کہ ہیمنگوے کے بیان میں جھول اور غیر ضروری پھیلاؤ ہے۔ ان کو پوری توجہ سے از سر نو پھر لکھنا چاہیے۔ وہ خود اس کوشش میں تھے کہ ایسا جملہ لکھ سکیں جو بالکل درست ہو اور اپنے مفہوم سے ہم آہنگ ہو اور لفظی آرائش وسجاوٹ سے پاک ہو۔ اس لیے گرٹروڈ اسٹین کی نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا۔

اس زمانے میں ٹورانٹو اسٹار اور اسٹار ہفتہ وار کے لیے ہیمنگوے نے صحافتی سرگرمیاں جاری رکھیں اور یورپ کے مختلف ممالک میں سفر کرتے اور گھومتے رہے۔ انھوں نے 1922 میں جنیوا میں منعقد ہونے والی اقتصادی کانفرنس کی رپورٹنگ کی۔ اٹلی میں ابھرتی ہوئی فاشسٹ تنظیم پر مراسلات بھیجے۔ مسولینی سے انٹرویو پر مراسلہ بھیجا۔ وہ اسپین، سوئیزرلینڈ اور جرمنی گئے۔ وہ قسطنطنیہ گئے جہاں انھوں نے یونان اور ترکی کی جنگ میں نامہ نگار کے فرائض انجام دیے۔ اسی طرح انھوں نے لیوذان (Lausanne) اقتصادی کانفرنس اور رُہر (Ruhar) سے متعلق فرانس اور جرمنی کے تنازعہ پر سیاسی تبصرے لکھے، لیکن ان صحافتی سرگرمیوں کے دوران وقفے وقفے سے وہ ہلکی پھلکی چیزیں مثلاً پہاڑوں میں مچھلی کا شکار، موسم سرما کے کھیل اور پیرس کا سماجی منظر بھی لکھتے رہے۔ ان تحریروں سے ان کو معقول آمدنی تھی اور اس میں سے وہ کچھ پس انداز بھی کرتے تھے تا کہ وہ جلد صحافت سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنا پورا وقت ادبی تخلیقات پر صرف کرسکیں۔ اسی دوران ان کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ شکاگو کے زمانے سے اب تک کی غیر مطبوعہ نظموں اور افسانوں کا مسودہ جو مسز ہیمنگوے کے ہمراہ ایک سوٹ کیس میں تھا، وہ سفر کے دوران چوری ہوگیا۔ چند نظمیں اور دو کہانیاں جس میں سے ایک اشاعت کے لیے بھیجی جاچکی تھی، اس حادثے سے بچ گئی تھیں۔ 1923 میں ہیمنگوے نے اس میں ایک کہانی اور کچھ نظموں کا اور اضافہ کیا اور تین کہانیاں اور دس نظمیں (Theree Stories and Ten Poems) کے عنوان سے ان کا یہ ملا جلا مجموعہ شائع ہوا۔

■

ماخذ: ارنیسٹ ہیمنگوے، **مصنف:** سلامت اللہ خاں، **دوسرا ایڈیشن:** 1989، **ناشر:** ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ 66

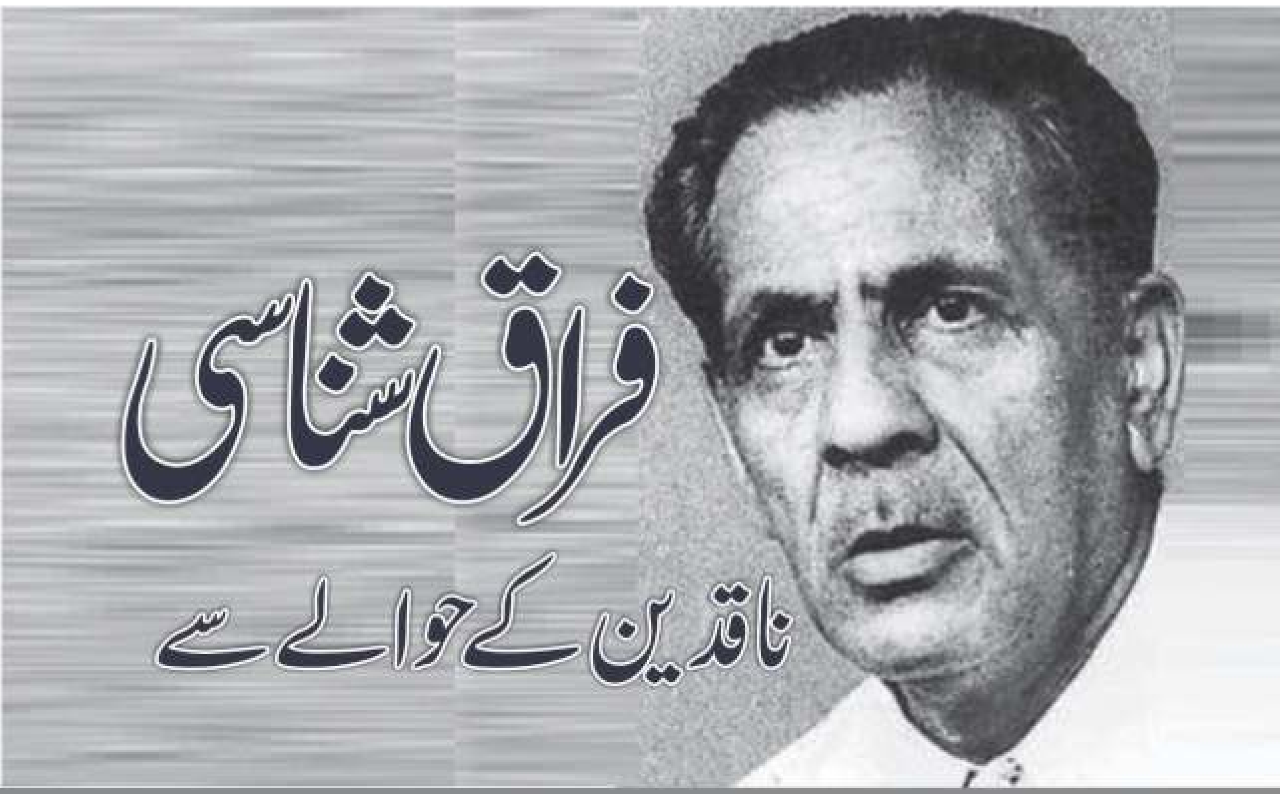

فراق شناسی
ناقدین کے حوالے سے

تجمل حسین

روایت کی پاسداری اور جدید آہنگ کی آمیزش سے جن شاعروں نے اپنی شاعری کا خمیر تیار کیا۔ ان میں فراق، یگانہ اور شاد عارفی کے نام کافی نمایاں ہیں۔ فراق اپنی شاعری میں نئے موضوعات، نئے آہنگ کے ساتھ ساتھ اسلوب کی سطح پر بھی جدت پسند تھے۔ انھوں نے ہندو فلسفہ اور ہندو دیومالا کو اپنی شاعری میں خوبصورتی سے پرو کر غزل کی ایرانی تہذیب میں ہندوستانی فکر و فلسفہ کی خوبصورت آمیزش کی ہے۔ فراق نے اپنی شاعری کے ذریعے نئی نسل کے غزل گو شعرا کی ذہنی رہنمائی کی ہے۔ بقول ابو الکلام قاسمی فراق نے نئی نسل کے لوگوں کی رجحان سازی کی ہے۔ اس لیے فراق کو رجحان ساز شاعر قرار دینا کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ فراق نے 1950 کے آس پاس شاعری کے منظرنامے پر نمودار ہونے والے شعرا کی ذہنی تربیت کی اور نئی نسل کے شعرا نے ان کے اسلوب کو اپنایا بھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، ناصر کاظمی اور احمد مشتاق جیسے شاعروں کے کلام میں فراق کی ذہنی تربیت اور ان کے اسلوب کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ فراق کا ایک شعر ہے۔

تیرے پہلو میں کیوں ہوتا ہے محسوس
کہ تجھ سے دور ہوتا جا رہا ہوں

اس شعر میں نئی زندگی کے تقاضے کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غزل کی روایتی شاعری میں پہلو میں ہونا قرب کی علامت اور محبت کے استعارے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جب کہ فراق پہلو میں ہو کر بھی دور ہونے کا اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں۔

ایسی راتیں بھی ہم پہ گزری ہیں
تیرے پہلو میں تیری یاد آئی

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

پہلو میں ہونا عشق کی انتہا اور وصال کا نتیجہ ہوتا تھا مگر نئے اسلوب نے پہلو میں یاد آنے کے استعارے سے دوری کا احساس اور تنہائی کے خوف کا ایک پیکر تخلیق کیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی نے فراق کو عشق کی مختلف کیفیتوں اور عشق کے تجربوں کے بیان کا شاعر قرار دیا ہے۔ محمد حسن عسکری نے کہا ہے کہ فراق نے محبوب کو ایسی معروضی حیثیت دی ہے جو اردو شاعری میں پہلے اسے حاصل نہیں تھی۔ انھوں نے محبوب کو عاشق کی ہستی سے الگ کر کے بھی دیکھا ہے۔ ان کا محبوب ایک کردار ہے اور اس کردار کی نفسیات بھی سیدھی سادی نہیں ہے۔ ایسی ہی پیچ در پیچ ہے جیسے عاشق کی نفسیات۔ یہ بات سچ ہے کہ فراق نے محبوب کی آزاد ہستی کی ترجمانی کی لیکن فراق کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے عشق کی مختلف کیفیات کو اور عشق کے غیر رسمی ارتعاشات کو بھی حسی پیکروں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

"بیسویں صدی کے معاشرے نے احساس کے جن نئے گوشوں کا اضافہ کیا ہے ان کی جھلک فراق کے اشعار میں ضرور دیکھی جا سکتی ہے۔ اگر آپ شعروں میں فراق کے لہجے کا تعین کریں تو پتا چلتا ہے کہ وہ اپنا لہجہ استفہامیہ رکھتے ہیں اور یہ استفہام بھی خود کلامی کا انداز لیے ہوئے ہے۔" (شاعری کی تنقید، ص:83)

فراق نے اپنی شاعری میں عشق کی مختلف کیفیات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر نقاد نے فراق کی شاعری میں بہت سارے سقم کی نشاندہی کے باوجود ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ محمد حسن عسکری فراق کے مداحوں میں شمار ہوتے ہیں۔ عقیل احمد نے بھی فراق کی شاعری کی تعریف و توصیف بیان کی ہے۔ فراق کا اسطور قائم کرنے میں نیاز فتح پوری کا نہایت اہم رول رہا ہے۔ انھوں نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "یو پی کا ایک نوجوان ہندو شاعر فراق گورکھپوری" جس میں انھوں نے فراق کی شاعری میں دلکشی، معنی آفرینی اور کیفیت کی نشاندہی کی تھی۔ یہ مضمون 1937 میں شائع ہوا تھا۔ فراق کا اسطور قائم کرنے میں یہ مضمون سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے نیاز فتح پوری کے مضمون کے عنوان کی سخت گرفت کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب نیاز فتح پوری فراق کو نوجوان شاعر کے لقب سے نواز رہے تھے اس وقت فراق کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اسی عمر میں میر نے اپنا پہلا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ غالب نے اپنی مشہور غزلیں چوبیس برس کی عمر میں کہی تھیں۔ کیٹس Keats شیلی Shelly بالترتیب پچیس برس اور انتیس برس کی عمر میں فوت کر گئے۔ ان نوجوان شاعروں میں لہجے کے انوکھے پن اور

اسلوب کی جدت کی وجہ سے جو پختگی نظر آتی ہے۔ فراق کی چالیس سالہ نوجوانی کی شاعری میں وہ پختگی نظر نہیں آتی۔ شمس الرحمٰن فاروقی آل احمد سرور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فراق کی شاعری میں ان کی آخری زندگی تک پختگی نہیں آسکی۔ ان کے اسلوب کا تعین اس لیے بھی مشکل ہے کہ فراق نے اپنا کوئی اسلوب متعین نہیں کیا بلکہ وہ ہوا کی طرح بہتے گئے جب کہ میر کے پہلے دیوان میں جو پختگی نظر آتی ہے اور ان کا جو لہجہ متعین ہوتا ہے وہ ان کے چھٹے دیوان میں بھی نظر آتا ہے۔ یعنی میر نے شاعرانہ پختگی اور اسلوب کی ندرت جو اپنی اوائل عمر میں حاصل کر لیا تھا فراق آخری عمر تک بھی وہ پختگی نہ پا سکے اور نہ ہی اسلوب میں اپنی انفرادیت حاصل کر سکے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے فراق کو اردو غزل کی روایت سے انجان بتایا ہے جب کہ ابوالکلام قاسمی نے فراق کی شاعری اور غزل گوئی کو اردو غزل کی روایت کی توسیع اور تسلسل قرار دیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی کہتے ہیں کہ فراق نے غزل کی روایت کی پاسداری کی ہے مگر روایت میں انھوں نے جدید فکر کو شامل بھی کیا ہے۔ اس لیے فراق کے یہاں روایتوں کی تقلید نہیں بلکہ احترام کا جذبہ نظر آتا ہے۔ فراق کی شاعری میں ہندوستانی عناصر کی شمولیت اور ہندو دیو مالا کو اردو کا غزلیہ آہنگ دینے کی بات بھی متواتر دہرائی جاتی ہے حالانکہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس بات کا انکار کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ فراق کی شاعری کی دوسری صنف کے لیے ہندوستانی عناصر کی شمولیت کی بات کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان کی رباعیوں میں اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہو مگر غزل میں ہندو دیو مالا اور ہندو فلسفے کی شمولیت سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس طرح کے مضامین غالب کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ جب کہ ابوالکلام قاسمی فراق کی شاعری میں ہند اسلامی کلچر کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور فراق کی شاعری میں ہندوستانی عناصر پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ ان کی لفظیات کس حد تک ان کی شاعری کے مزاج کو ہندوستانی ثابت کرتی ہے تو اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ انھوں نے سیاق وسباق سے اپنے لفظوں کا مزاج متعین کرنے اور بعض مشتقات بنانے میں ہندی سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ الفاظ کے استعمال سے ہندوستانیت یا ہندو دیو مالا کا تاثر قائم کرنے کا عمل قدیم شعرا کی غزلوں میں بھی ملتا ہے مگر اس سلسلے میں فراق کا امتیاز یہ ہے کہ وہ محض لفظ یا اس کے مشتقات تک ہی خود کو محدود نہیں رکھتے بلکہ کبھی کبھی وہ ایسے حسی پیکر تراشتے ہیں جس کے پہلے حصے سے ایک طرف اسلامی روایت کا پس منظر ابھرتا ہے تو دوسری طرف ہندو دیو مالا یا اجتماعی حافظہ پیکر کے کسی دوسرے حسی پیکر کو متحرک کر دیتا ہے ان کا شعر ہے۔

سکوت توڑ کہ قم کی صدا ہے تیری صدا
نظر اٹھا کہ ان آنکھوں کا رس ہے سنجیون

یا اسی طرح ان کی غزلوں میں جگہ جگہ ایسے اشعار ملتے ہیں جن کی فضا یا جن کا کوئی نہ کوئی پہلو مقامی سرزمین اور ہندی زبان کی روح سے مربوط اور اس سے کسب فیض حاصل کرتا معلوم ہوتا ہے۔''

(شاعری کی تنقید،ص:86)

یہ سچ ہے کہ فراق نے اپنی شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے اور ان کی غزل میں ہندی اور ہندوستانی عناصر کی منظر کشی ہوئی ہے جیسے ان کا ایک شعر ہے۔

چپکے چپکے اٹھ رہا ہے مدھ بھرے سینوں میں درد
دھیمے دھیمے چل رہی ہے عشق کی پروائیاں

فراق نے ہندی الفاظ کو خوبصورتی سے برتا بھی ہے مگر قاسمی صاحب نے ہند اسلامی کلچر کی نمائندگی کرنے والے جس شعر کو نقل کیا ہے یا وہ شعر جس میں عربی کا ایک لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کی بنیاد پر فراق کو ہند اسلامی کلچر کا ترجمان یا عکاسی کرنے والا شاعر بتایا ہے۔ وہ دراصل دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوالکلام قاسمی نے اس نوع کا کوئی دوسرا شعر نقل نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہند اسلامی کلچر کی عکاسی کے لیے اسلامی تاریخ سے جس قدر واقفیت ہونی چاہیے اور عربی وفارسی زبان پر جس قدر گرفت ہونی چاہیے یہ دونوں باتیں فراق کے یہاں مفقود تھیں بلکہ فراق کی معلومات فارسی میں بالکل سطحی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فراق کی شاعری میں فارسیت نہیں ملتی اور جہاں کہیں انھوں نے بہ تکلف فارسی استعمال کرنا چاہا اس کا مناسب استعمال نہ کر سکے اور فارسی سے گہری واقفیت کے بغیر اسلامی کلچر کی ترجمانی ممکن نہیں ہے۔ فراق کی شاعری میں فارسیت کی کمی کی شکایت ایک بار رشید احمد صدیقی نے بھی کی تھی جس پر فاروقی صاحب نے کہا تھا کہ رشید احمد صدیقی نے فراق کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ فراق فارسی الفاظ کے معانی ومفاہیم سے تو باخبر تھے مگر اس لفظ کی خاصیت اور اس کے مزاج سے ناواقف تھے جس کی وجہ سے وہ فارسی کے الفاظ کو پوری توانائی سے برتنے میں ناکام رہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''فراق صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ وہ فارسی کے الفاظ اور اس کے لغوی معنی تو اکثر جانتے تھے لیکن ان کی روح اور مزاج سے بے خبر تھے۔ اس لیے انھوں نے فارسی عربی الفاظ کو اس طرح برتا کہ وہ شعر میں اپنا پورا فائدہ نہیں دیتے اور کبھی کبھی تو اس طرح برتا کہ زبان کا مزاج اس کو کبھی قبول نہیں کر سکا۔ 'جلوہ' کا استعمال ان کے یہاں 'دیکھو ہو' والی غزل کے ایک شعر میں ہے۔ یہاں یہ لفظ شعر کا حسن بڑھانے کے بجائے مفہوم کو خبط کر رہا ہے۔

کبھی بنا دو ہو سینے کو جلوؤں سے رشک گلزار
کبھی رنگ رخ بن کر تم یاد آتے ہی اڑ جاؤ ہو

فراق کی شاعری میں ہندوستانی عناصر کی شمولیت اور ہندو دیو مالا کو اردو کا غزلیہ آہنگ دینے کی بات بھی متواتر دہرائی جاتی ہے حالانکہ شمس الرحمن فاروقی نے اس بات کا انکار کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ فراق کی شاعری کی دوسری صنف کے لیے ہندوستانی عناصر کی شمولیت کی بات کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان کی رباعیوں میں اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہو مگر غزل میں ہندو دیو مالا اور ہندو فلسفے کی شمولیت سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس طرح کے مضامین غالب کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔

زہے آب گل کی یہ کیمیا ہے چمن کے معجزہ نمو
خزاں ہے کچھ نہ بہار کچھ وہی خار وخس وہی رنگ و بو
میری شاعری کا یہ آئینہ کرے ایسے کو تیرے روبرو
جو تیری ہی طرح ہو سر بسر جو تجھ ہی سے ملتا ہو ہو بہو
وہ چمن پرست بھی ہیں جنھیں یہ خبر ہوئی ہی نہ آج تک
کہ گلوں کی جس سے ہے پرورش رگ خار میں ہے وہی لہو

ان اشعار میں 'کیمیا' رنگ و بو، سر بسر، سوز، رنگ نشاط، ایسے الفاظ اور فقرے ہیں جو یا تو پوری طرح کارگر نہیں ہے مثلاً رنگ و بو کیونکہ اس میں اور 'خار وخس' میں مناسبت نہیں ہے اور 'سر بسر' کیونکہ 'مو بہ مو' جیسے خوبصورت فقرے کے سامنے 'سر بلند' نہیں ہوسکتا۔ 'کیمیا' جس کا تعلق نمود سے تو ہوسکتا ہے نمو سے نہیں اور ''سوز و ساز'' جس کا بہار سے اور غم کی بو آنے سے کوئی تعلق نہیں۔''

(فراق شاعر اور شخص، شمیم حنفی، مصطفی بک ڈپو، 1983، ص:64)

اس اقتباس میں فاروقی صاحب اپنے مخصوص وضاحتی انداز میں فراق کی فارسی الفاظ کے مزاج اور کیفیت سے عدم واقفیت کا اظہار کر چکے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو غزل کی روایت میں جو چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے یعنی فارسی اس سے فراق بہرہ مند نہیں تھے تو پھر ہند اسلامی کلچر کی ترجمانی کی بات ہی فارسی سے عدم واقفیت کی بنا پر ختم ہو جاتی ہے کہ ہند اسلامی کلچر کا خمیر ہی عربی و فارسی سے اٹھتا ہے۔ البتہ قاسمی صاحب کی یہ بات درست ہے کہ فراق نے ہندو تہذیب اور ہندوستانی عناصر کو خوبصورتی سے اردو کے غزلیہ آہنگ میں ڈھالا ہے۔ حالاں کہ دوسرے شعرا نے بھی ہندو تہذیب و ثقافت کو اپنی شاعری میں شامل کیا ہے مگر فراق اس معنی میں اہم ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے الفاظ سے تمام مناظر کو ہندوستانی رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ فراق نے میر کے طرز میں بھی غزلیں کہی ہیں اور خود فراق نے طرز میر کو بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ طرز میر میں فراق کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

حسن کو اتنا یاد کرو ہو چلتے پھرتے سائے تھے
ان کو مٹے تو مدت گزری نام و نشان کیا پوچھو ہو
کتنی وحشت اتنی وحشت صدقے اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو میں نہ شکاری دور اتنا کیوں بھاگو ہو

ان اشعار میں طرز میر کے نام پر وہی 'آؤ ہو'، 'جاؤ ہو' اور 'بھاگو ہو' جیسے الفاظ ملیں گے۔ نہ میر جیسی تہہ داری ہے نہ میر کا استعاراتی اسلوب ہے اور نہ ہی میر جیسی

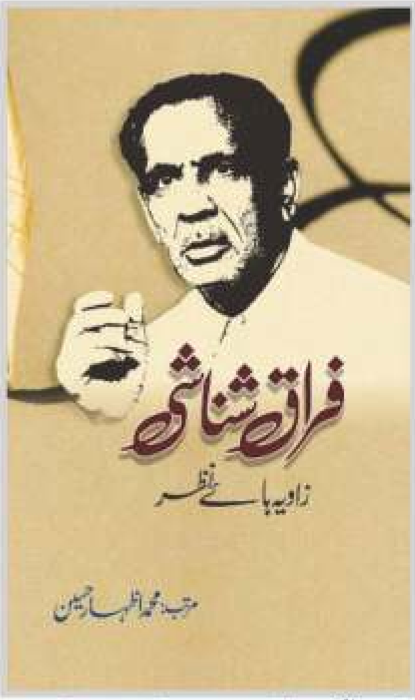

کفایت لفظی۔ فراق صاحب معمولی مطالب کے بیان کے لیے بھی بہت سارے الفاظ کا ضیاع کرتے ہیں جن میں بعض دفعہ ربط و تسلسل کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ میر کی شاعری میں دھیمے پن اور استعاراتی نظام سے جو گداز اور کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے فراق کے طرز میر والی شاعری یکسر خالی معلوم ہوتی ہے۔

اک شخص کے مرجانے سے کیا ہو جائے ہے لیکن
ہم جیسے کم ہوئے ہیں پیدا پچھتاؤ گے دیکھو ہو فراق

یہ شعر میر کے اس بے مثال شعر کے طرز میں کہا گیا ہے۔

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو یہ بستی اجاڑ کے

اس شعر میں میر شہر دل کے اجڑنے اور برباد ہونے پر کوئی آہ و فغاں نہیں کرتے ہیں، کسی قسم کے رنج و الم کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ تو یہ بھی نہیں کہتے کہ میرا شہر دل اجاڑ کر تم پچھتاؤ گے۔ بس مطلق دل کے نگر کے اجاڑنے اور برباد کرنے سے منع کر رہے ہیں۔ کیونکہ میر کو اپنے دل کے ٹوٹنے اور شہر دل کے اجڑنے سے کہیں زیادہ ملال اس بات کا ہے کہ معشوق کو پچھتاوا نہیں ہوگا۔ اس لیے میر اپنے دل کے ٹوٹنے کی تکلیف سے بے پرواہ ہو کر ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح معشوق اس پچھتاوے سے بچ جائے۔ اس مضمون میں ایک طرح کی بلندی ہے۔ عشق کے پاکیزہ اور فطری جذبے کی سچی ترجمانی ہے۔ جب کہ فراق کے شعر میں سوائے خود ستائی اور خود نمائی کے کچھ نہیں ہے۔ پہلے مصرعے میں وہ تجاہل عارفانہ سے کام تو لیتے ہیں کہ ایک شخص کے مر جانے سے کیا ہو جائے گا مگر اگلے مصرعے میں 'ہم جس سے کم ہوئے ہیں پیدا' کہہ کر خود کو یکتہ روزگار کہنے کا موقع نہیں چوکتے۔ جب کہ میر یہ نہیں کہتے کہ میرا دل یا میر کا دل توڑ کر پچھتاؤ گے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے فراق کی شاعری میں تہہ داری و استعاراتی اسلوب کے فقدان اور ان کی شاعری میں لفظی و معنوی ربط کی کمی پر تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک استعاراتی اسلوب کا مسئلہ ہے اس کی وضاحت کے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ ایک بار جی کڑا کر کے آپ میر کے کلیات غزل کے کوئی چھ صفحے پڑھ لیجیے اور دیکھیے کہ ایک ہی تجربے یا ایک ہی طرح کے تجربے مثلاً معشوق کی سرد مہری، عاشق کی نارسائی، کائنات کا غیر ہمدرد اور اجنبی ہونا کے لیے کتنے استعارے میر نے استعمال کیے ہیں پھر فراق صاحب کے کلیات پر بھی تجربہ کیجیے۔ حقیقت خود ہی کھل جائے گی۔''

(فراق شاعر اور شخص، ص:63)

لیکن ابوالکلام قاسمی فاروقی صاحب کی اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فراق صاحب کے یہاں تشبیہ و استعارے کا خوبصورت نظام موجود ہے جس سے وہ لفظوں کی مدد سے ایک سی امیج بناتے ہیں اور پیکر تراشی کرتے ہیں۔ فراق کے تخلیق کردہ پیکروں میں ان کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس لیے قاسمی صاحب فراق کے یہاں موجود تشبیہ و استعارے پر مبنی امیج سازی اور پیکر تراشی کو بنیاد بنا کر فراق کی شاعرانہ حسن کاری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر رسمی تشبیہات و استعارات پر مبنی امیج سازی کو اگر فراق کی شاعرانہ حسن کاری کا زاویہ نظر بنا کر نئے سرے سے دیکھا جائے تو ہوسکتا ہے فراق کے مطالعے کا کوئی ایسا تناظر فراہم کر دے جس سے فراق کی شاعری کے تعین قدر کا ایسا وسیلہ ہاتھ آجائے جس کو بہت کم بروئے کار لایا گیا ہے۔

(شاعری کی تنقید، ص:77)

یقیناً فراق صاحب کی شاعری کو مختلف اور متعدد زاویہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور تعین قدر کے ان وسیلوں کو بھی بروئے کار لانے کی ضرورت ہے جو ان کے شاعرانہ نظام کو سمجھنے میں معاون ہو۔

Tajammul Husain
Research Scholar JNU
Mob.: 7905623176
Email: Rahatzubeen@gmai.com

مظہر امام کی شاعری

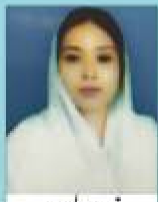

نیر وہاب

بیسوی صدی سماجی، معاشی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، اقتصادی ہر لحاظ سے بہت اہم صدی رہی ہے۔ عالمی سطح پر بھی صدی میں کئی انقلابات رونما ہوئے۔ ہندوستان میں سیاسی سطح پر تقسیم کا واقعہ پیش آیا۔ تاہم ادب میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحانات اور نظریات نے ادب میں اسالیب، زبان، موضوعات اور خیالات میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کا ایک بڑا حلقہ سامنے آیا اور اپنی تخلیقات سے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔

مظہر امام کا شمار جدید غزل گو شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ 1943 کے آس پاس تیرہ چودہ سال کی عمر میں اپنی ادبی سفر کا آغاز کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اپنے شاعری کی ابتدا کرنے کے ساتھ ہی مظہر امام نے اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ ان کے ابتدائی زمانے کے کلام سے ہی ان کے ذاتی محسوسات و جذبات کی شدت اور انفرادی تجربہ اور مشاہدہ ان کے ہم عصروں میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ تقسیم کے بعد جدید شاعری کے آغاز کے زمانے میں جب ترقی پسندوں کا اثر کم ہوا اور وقت اور حالات کے تقاضوں کے تحت مغربی افکار و خیال کے اثرات اردو ادب پر پڑنے لگے تو اکثر ادیب اور فنکار اپنی فکر میں تبدیلی محسوس کرنے لگے۔ مظہر امام نے ہر چند کے کسی بھی تحریک یا نظریے سے خود کو کبھی بھی مکمل طور سے وابستہ نہیں کیا۔ ان کے یہاں ہونے والی تبدلیاں ادب کے تقاضوں کی غمازی ضرور کرتی ہیں۔ مظہر امام نے نہ صرف نئی غزل کے حوالے سے شناخت قائم کی بلکہ اردو میں جو تنقیدی اور تاثراتی نوعیت کے مضامین قلم بند کیے ہیں ان مضامین سے ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے ان کی تخلیقی اور تنقیدی بصیرتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے شاعرانہ اسلوب نگارش نے آنے والے شعرا کو متاثر بھی کیا ہے اور نئی نسل کے شعرا کے کلام میں ان کے اسلوب کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔

مظہر امام نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی لیکن 1950 کے بعد افسانہ نگاری ترک کر کے شاعری کو اپنے افکار و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مظہر امام اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے متعلق لکھتے ہیں:

''میں نے افسانہ نگاری اور شاعری اندازاً تیرہ سال کی عمر میں شروع کر دی تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں اس وقت کی غزلوں میں اکثر مصرعے ناموزوں ہوتے تھے اور افسانوں میں زبان و بیان کی غلطیوں کے علاوہ بعض اوقات مضحکہ خیز غیر حقیقی واقعات ہوتے تھے۔ البتہ ایک بات شاید دلچسپی کی ہو کہ اس وقت میری شاعری افسانہ نگاری کا محور حسن و عشق نہیں، زندگی کے دوسرے موضوعات تھے اور صرف افسانوں میں ہی نہیں بلکہ اشعار میں بھی جذباتی افلاطونی محبت کا مذاق اڑایا گیا تھا۔''

(مظہر امام نئی نسل کے پیش رو: مناظر عاشق ہرگانوی، نرالی دنیا پبلی کیشنز، 2003، ص 18)

اس کے علاوہ مظہر امام کو شاعری کی طرف مائل کرنے میں اس وقت کے ادبا و شعرا نے بھی اہم رول ادا کیا۔ مظہر امام نے چونکہ شاعری کی ابتدا ترقی پسند تحریک کے زمانے میں کی اس لیے ان کے یہاں ترقی پسند تحریک کے اثرات کا ہونا لازمی تھا۔ ہر چند کہ مظہر امام نے جدیدیت کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کی۔ ترقی پسند شاعروں اور دانشوروں نے ادب کو زندگی کی ترجمانی کا وسیلہ قرار دیا۔ غریبوں، مزدوروں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کا جذبہ، سرمایہ داروں اور حاکم طبقوں کی مخالفت اس تحریک اور اس سے منسلک دانشوروں کا اہم کارنامہ تھا۔ انھوں نے ادب کو ایک خاص مقصد کے تحت تخلیق کیا، جس نے عوام کے دکھوں کی ترجمانی اور ان کی زندگی کو درد و آلام اور مصائب سے نکال کر خوشیوں کی راہ دکھانا اور تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔

بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔''

(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی، ص 32)

سردار جعفری کا خیال ہے کہ:

''اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ایک بنیادی کردار ہے اور ہماری ساری جدوجہد یہ ہے کہ ہمارا ادب عوامی ادب بنے۔

(ترقی پسند ادب: سردار جعفری، ص 11)

مظہر امام کی غزلیہ شاعری کا ذکر ہو چکا ہے ان کی نظموں کی بات چلے۔ ان کے متاخرین اور پیش روشعرا اور ناقدین سبھی نے ان کے کلام کے حسن، ان کے دلفریب اسلوب اور فکر وفن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی انفرادیت کا اعتراف کیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی ان کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں رطب اللسان ہیں:

''مظہر امام کو اپنے لہجے کی انفرادیت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حیات وکائنات سے ان کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ اس کا تصور کسی روایتی فکر سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا کرب ان کا تجسس، ان کی برہمی، ان کی بے چارگی، پر تفکر محزونی ان عناصر کو الگ الگ کر کے دیکھیں تو یہ عصر حاضر کی عمومی فضا میں جگہ جگہ مل جائیں گے۔ لیکن کسی شعری فکر کی انفرادیت نے ان مختلف دھاروں کو یکجا کر کے انھیں اپنے کوزے میں بند کر لیا ہے اور یہی وہ نقشہ ہے جس میں کم تر درجے کے شعرامات کھا جاتے ہیں۔'' (رابطہ، مظہر امام نمبر ص 125)

جدیدیت کے زیر اثر وجودی فکر کے تناظر میں مظہر امام کی نظم 'اشتراک' کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

''خیر اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
اس قبیلے میں کوئی کسی کا نہیں
ایک غم کے سوا چہرہ اترا ہوا بال بکھرے ہوئے
نیند اچٹی ہوئی
خیر اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
آؤ ہم لوگ جینے کی کوشش کریں''

ایک دوسری نظم بہ عنوان 'دھوپ میں ایک مشورہ'

اور تم
اپنے آدرش کی لاش کو
اجنبی، سرد، جلتی ہوئی رہ گزر سے پرے پھینک کر
اپنا مفلوج غصہ لیے لوٹ آؤ گے
پھر گڑگڑاتی ہوئی التجا...
'مجھ کو پہچاننے کی نہ کوشش کرو!'

ڈاکٹر وحید اختر نے لکھا کہ:

''مظہر امام کی نظمیں سیاست دوراں کو سمجھنے کی کوششوں سے بھی عبارت ہیں اور غم ذات وغم جاناں کی آئینہ دار بھی۔ وہ آج کے ہر سوچنے والے حساس ذہن کی طرح خود کو اپنے عہد میں اجنبی مانتے ہیں لیکن

مظہر امام نے نہ صرف نئی غزل کے حوالے سے شناخت قائم کی بلکہ اردو میں جو تنقیدی اور تاثراتی نوعیت کے مضامین قلم بند کیے ہیں ان مضامین سے ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے ان کی تخلیقی اور تنقیدی بصیرتوں کا پتہ چلتا ہے. ان کے شاعرانہ اسلوب نگارش نے آنے والے شعرا کو متاثر بھی کیا ہے اور نئی نسل کے شعرا کے کلام میں ان کے اسلوب کی گونج صاف سنائی دیتی ہے.

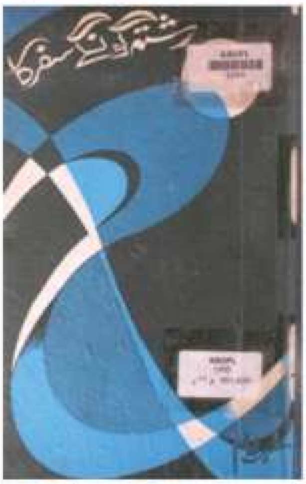

چونکہ یہی احساس اجنبیت آج کے شعروادب کا سب سے اہم موضوع ہے، اس لیے وہ اپنے ہم عصروں کے درمیان نہیں۔ نظمیں ہوں یا غزلیں دونوں ایک ہی دل ودماغ کی پیداوار ہیں۔''

(زخم تمنا: نئی شاعری کی ایک قابل مطالعہ مثال، ص 86-85)

مظہر امام کی غزلیں جدیدیت اور نئی غزل کے منظر نامے پر بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی انفرادیت کی نمایا مثال بھی ہیں اور کسی نہ کسی حد تک مظہر امام کی شہرت ومقبولیت میں اضافے کا سبب ہے۔

اب تو کچھ بھی یاد نہیں ہے
ہم نے تم کو چاہا ہوگا

یہ آرزو تھی کہ یک رنگ ہو کہ جی لیتا
مگر وہ آنکھ جو شیطاں بھی ہے فرشتہ بھی

چیخوں کے ازدہام میں تنہا ہے آدمی
اے زندگی بتا کہ کدھر جا رہی ہے تو؟

بیٹھیں کچھ دیر مہکتی ہوئی یادوں کے تلے
شکر ہے آج ذرا کار جہاں بھی کم ہے

مظہر امام کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ انھوں نے اردو شعروادب کی جو خدمات انجام دیں، اس کا اعتراف کم وبیش تمام ناقدین نے کیا ہے۔ مظہر امام کا شمار یوں تو غزل گو شعرا میں ہوتا ہے مگر انھوں نے نظموں میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ ساتھ ہی ساتھ آزاد غزل کا تجربہ کر کے بہت سی آزاد غزلیں بھی لکھیں۔ اس کے علاوہ مظہر امام نے تنقید کے میدان میں بھی اپنی شناخت قائم کی۔ ابتدائی چھ دہائیوں کے طویل سفر میں ان کی متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں۔ ان کی شعری تصانیف میں پانچ کتابیں ہیں جو غزلوں، نظموں، خاکوں اور تنقیدی موضوعات پر مشتمل ہیں۔

زخم تمنا، رشتہ گونگے سفر کا، پچھلے موسم کا پھول، بند ہوتا ہوا بازار، پالکی کہکشاں کی، اور سات کتابیں جو نثری تصانیف پر مشتمل ہیں: آتی جاتی لہریں، ایک لہر آتی ہوئی، اکثر یاد آتے ہیں، آزاد غزل کا منظر نامہ، جمیل مظہری، تنقید نما، نگاہ طائرانہ قابل ذکر ہیں۔ مظہر امام کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی اعزازات ملے۔ 1987 میں ساہتیہ اکیڈمی ایواڈ اور شعری مجموعہ 'پچھلے موسم کا پھول' 1994، غالب ایواڈ برائے اردو شاعری اہم ہیں۔

مظہر امام نے اپنی شاعری اور نثر کے حوالے سے جو اثاثہ یادگار چھوڑا ہے وہ انھیں اپنے معاصرین میں نایاب حیثیت عطا کرتا ہے۔ غزل اور نظم میں اپنی انفرادی شناخت قائم کرنے کے علاوہ آزاد غزل کا تجربہ بھی مظہر امام کا اہم کارنامہ ہے۔ ان کی تنقیدی کتابیں ان کے نظریات، رجحانات ان کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی پیش کرتی ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے، ادب کی اہم شخصیات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ مختصر یہ کہ مظہر امام کی شاعری اور فن اپنی مختلف خوبیوں کی بدولت ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

یہ راہ خار و سنگ مرا انتخاب بھی
جو مرحلے بھی آئے وہ حسب قیاس تھے

■

Nayyar Wahab
Research Scholar,
V.K.S University Ara - 802302 (Bihar)
Mob.: 9905244346
mahboobcam@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

معالجات (جلد اوّل، دوم، سوم، چہارم)

مصنف: وسیم احمد اعظمی،

صفحات: 12+526 (پہلی جلد)، 14+737 (دوسری جلد)

16+578 (تیسری جلد)، 9+434 (جلد چہارم)

قیمت: 970 (مکمل سیٹ)، سنہ اشاعت: 2024

مبصر: ڈاکٹر ثاقب فریدی، H-74، فورتھ فلور، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

معالجات وسیم احمد اعظمی کی چار جلدوں پہ مشتمل کتاب ہے۔ ان چار جلدوں میں انھوں نے علاحدہ علاحدہ طور پر مختلف امراض کی تشخیص و علاج کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ وسیم احمد اعظمی کی یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے پہلی مرتبہ 1992 میں شائع ہوئی تھی اور اب اس کا پانچواں ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ جلد اول 526 صفحات پر محیط ہے۔ جلد اول میں 'امراض نظام اعصاب و دوران خون و تنفس' کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس عنوان کو اگر بغور دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں تین عناوین موجود ہیں۔

اول نظام اعصاب، دوم نظام دوران خون اور سوم نظام تنفس۔ ان عناوین کے تحت مختلف امراض کے بارے میں بات کی گئی ہے اور کئی ذیلی عناوین بھی قائم کیے گئے ہیں۔ ان ذیلی عناوین کے تحت بھی ذیلی عناوین ہیں۔ اس طور سے اصل عنوان کے تحت جتنے بھی امراض ہو سکتے ہیں وسیم احمد اعظمی نے انھیں بہت آسان اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔

نظام اعصاب کے دو ذیلی عناوین ہیں:

1۔ امراض دماغ اور 2۔ امراض نخاع۔

اس کے بعد امراض نظام دوران خون کے تحت بھی دو ذیلی عناوین ہیں:

1۔ امراض قلب اور 2۔ امراض صمامات قلب و اوعیہ خون۔

امراض نظام تنفس کے تحت بھی دو ذیلی عناوین موجود ہیں:

1۔ امراض ریہ اور 2۔ امراض صدر۔

وسیم احمد اعظمی نے ہر عنوان کے تحت اولاً موضوع کی وضاحت کی ہے۔ مثال کے طور پر امراض نظام اعصاب کے تحت انھوں نے نظام اعصاب کی مختصر تشریح و منافع کے عنوان سے انھوں نے اس مرض کی پوری تشریح اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔ پھر ذیلی عناوین کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور مختلف امراض کے بارے میں مفصل گفتگو کی جاتی ہے۔ ان امراض میں صداع، اس کی اقسام، عصابہ، شقیقہ، سرسام، سدر، دوار، قوما، جمود و شخوص، سہر، کابوس، مالیخولیا، قطرب، صرع، فالج، استرخاء جسم اسفل، لقوہ، رعشہ، اختلاج، سکتہ جیسے اور دوسرے امراض کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ مصنف پہلے مرض کی تشخیص کرتے ہیں۔ پھر اس کی علامتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس کے بعد اس کا علاج بتاتے ہیں۔ اس طور سے اس مرض کے متعلق بہت سی معلومات یکجا ہو جاتی ہے۔ زبان اس قدر آسان اور سادہ ہے کہ مسائل سمجھنے میں دشواری نہیں آتی۔

معالجات کی دوسری جلد میں 737 صفحات ہیں۔ اس میں امراض نظام ہضم و تولید و تناسل کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس میں امراض کبد، امراض مرارہ، امراض طحال، امراض معدہ و امعاء، امراض امعاء،

امراض بانقراس، امراض غدہ درقیہ، امراض کلیہ وحالب، امراض مثانہ، امراض اعضائے تناسل مردانہ، امراض صفاق، امراض نقص تغذیہ بیان کیے گئے ہیں۔ ان امراض میں بعض امراض وہ ہیں جن کے متعلق ہم نے سنا ہے لیکن ان امراض کی شناخت کیسے کی جاسکتی ہے اس کے متعلق عوام کو علم نہیں ہوتا۔ ان موضوعات کو پڑھ کر ان امراض کی شناخت آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔

ان عناوین کے تحت جو ذیلی عناوین ہیں ان میں سے بعض عناوین کو دیکھ کر بھی نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سرطان، یرقان، ضعف معدہ، سوئے ہضم، سرطان معدہ، جوع الکلب، جوع البقر، قے، ہیضہ، قبض، بواسیر، ذیابطیس وغیرہ ایسے ذیلی عناوین ہیں جن کے بارے میں ہم روز کوئی نہ کوئی واقعہ سنتے ہیں اور ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سارے افراد موجود ہیں جو ان امراض میں مبتلا ہیں لیکن ان کا صحیح علاج نہیں ہو رہا ہے۔

ان موضوعات کو پڑھ کر نہ صرف مرض کی تشخیص ممکن ہے بلکہ اس کے علاج کی صورت بھی نکل آئے گی۔ بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک عرصے تک کسی مرض میں مبتلا رہتے ہیں لیکن ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا ہے کہ ہم کس مرض میں مبتلا ہیں۔ ہم خاموش رہتے ہیں اور کسی اور سے اپنی پریشانیوں کا ذکر نہیں کرتے۔ یا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مرض یوں ہی اپنے آپ کسی دن ختم ہو جائے گا۔ گویا ہمارا یہ عمل تساہلی اور ناواقفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان موضوعات و مضامین سے ہمیں نہ صرف راہنمائی ملے گی بلکہ ہمیں جب بھی کوئی پریشانی صحت کے متعلق پیش آئے گی ہم اس کے بارے میں پڑھ سکتے ہیں اور وقت پر اس کا علاج کرواسکتے ہیں۔

معالجات کی تیسری جلد 578 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں حمیات، حمیات خلطیہ و امراض متعدی کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ حمی کے معنی بخار کے آتے ہیں۔ یعنی اس جلد میں بہت تفصیل کے ساتھ مختلف قسم کے بخار پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کی مختلف قسموں، اس کے درجات، اس کی لازمی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ بخار اپنے ساتھ ساتھ دوسرے امراض بھی لے آتا ہے، لہٰذا ان امکانات کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ بخار کے سبب اموات بھی عمل میں آتی ہیں اس کا بھی علاحدہ طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ مختلف بخاروں کی تشخیص اور علاج کس طرح کیا جائے گا اس کی تفصیلات ان عناوین کے تحت کی گئی ہیں۔ بخار ایک ایسا مرض ہے جس کی طرف ہم سب سے کم توجہ کرتے ہیں۔ بخار آتے ہی بازار سے کوئی دوا لے کر کھا لیتے ہیں اور اس کی نوعیت کے متعلق بے خبر رہتے ہیں۔

مصنف نے جس تفصیل کے ساتھ بخار کے اقسام بیان کیے ہیں وہ حیران کرنے والے ہیں۔ ان اقسام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بخار کی تعلق سے ہم کس قدر بے خبر رہتے ہیں۔ بخار کے بعد اس جلد میں امراض متعدی کا ذکر کیا گیا ہے۔ تعدیہ کے معنی انفیکشن کے ہوتے ہیں۔ مصنف نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ 'طبی اصطلاح میں میزبان کی بافتوں میں بیماری پیدا کرنے والے زندہ خردبینی اجسام کی سرایت اور اس کے نتیجے میں ماہیتی تبدیلیوں کے رونما ہونے کو تعدیہ کہتے ہیں'۔ اس نوع کے امراض بعض اوقات بہت خوفناک صورت اختیار کر لیتے ہیں اور مریض کے لیے پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔ کتاب میں اس کی صورت حال اور اقسام کے متعلق تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

معالجات کی چوتھی جلد 434 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں امراض جلد و متعلقات جلد سے علاقہ رکھنے والے امراض پر بات کی گئی ہے۔ اس موضوع کے تحت بھی امراض جلد، امراض شعر، امراض اظفار، امراض مفاصل وعظام جیسے ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ جلد سے متعلق بہت سے امراض ہوتے ہیں۔ ان امراض کو اس سبب بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا کہ وہ بہت جلد نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان میں برص، عرق الدم، ورم، سرطان جلد وغیرہ خاص طور سے اہم ہیں۔ امراض جلد اور امراض شعر وغیرہ کے حوالے سے بعض امراض ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم ان کے اصل نام سے نہیں جانتے بلکہ علامتوں کے ذریعہ ان کی شناخت کرتے ہیں۔ اس کتاب میں اس حوالے سے بھی قابل قدر گفتگو کی گئی ہے۔

وسیم احمد اعظمی کی کتاب معالجات کی چاروں جلدیں اپنے موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں اور اس لائق ہیں کہ انھیں مطالعے کا حصہ بنایا جائے اور پڑھا جائے۔ اس کی قرأت اور مطالعے سے نہ صرف ہمارے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ مختلف امراض کے متعلق ہم بخوبی آگاہ بھی ہوں گے اور وقت رہتے ہوئے ان امراض کی شناخت اور تداوی کر سکیں گے۔

اس کتاب کے حوالے سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمام موضوعات کو انھوں نے بہت تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کے تمام نکات کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ ان موضوعات کو پڑھتے ہوئے موضوع اور اظہار کی سطح پر پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ ضرور ہے کہ طبی میدان سے تعلق نہ رکھنے والے قارئین کے لیے یہ موضوعات نئے ہوں گے لیکن اس کے باوجود امراض سے موقع بہ موقع انسان کا سابقہ پڑتا ہے لہٰذا اس تناظر میں ان موضوعات کی قرأت سے اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ بعض موضوعات یا امراض تو ایسے ہیں جن کے بارے میں نہ صرف ہم جانتے ہیں اور ان سے واقف ہیں بلکہ ہمارے اطراف میں ہم نے ان امراض میں مبتلا افراد کا مشاہدہ بھی کیا ہوتا ہے۔ اس سبب دیکھا جائے تو اس نوع کے موضوعات میں خاطر خواہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کا سرورق بھی خاصا دیدہ زیب اور خوبصورت ہے۔ کتاب اگرچہ چار جلدوں میں ہے لیکن مصنف نے موضوعاتی لحاظ سے اس کی ایسی تقسیم کی ہے کہ قاری کو ان جلدوں کی ضخامت کا کم کم احساس ہوتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون 011-26109746، فیکس 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

اردو شاعری کی تنقید

مصنف: پروفیسر ابوبکر عباد

صفحات: 279، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: جولائی 2024

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: عظمیٰ رضوان، محلہ مولاگنج شاہ آباد ہردوئی۔ 241124

پیش نظر کتاب میں اردو شاعری کی تنقید پر مشتمل 14 مضامین شامل ہیں۔ ابتدا میں 'اردو شاعری کی تنقید، بہ انداز دگر' کے عنوان سے نایاب حسن کا مضمون شامل ہے جس میں کتاب کے تقریباً تمام مضامین کے حوالے سے خاصی دلچسپ اور معلوماتی گفتگو ملتی ہے۔

کتاب میں تمام مضامین کی سرخی ہی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اس کے اندر نئی جہت، نئی روش اور نئے زاویۂ فکر کی کثرت پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ بطور نمونہ چند مضامین کے عنوانات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ آپ بھی ان مضامین میں موجود جدّت کی جھلک کو محسوس کرسکیں۔ مثلاً: ناقدین کی سہو کا شکار: فانی بدایونی، ناقدین کے عجائب خانوں کا قیدی: میراجی اور کلیم عاجز: ایک اور پہلو سے وغیرہ۔

زیرِ نظر کتاب کے تمام مضامین فن کار کی خلاقانہ صلاحیت اور ناقدانہ قابلیت کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب کے کسی بھی مضمون کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے ایک نئی بحث چھیڑ رکھی ہے، روایتی انداز سے بغاوت کا علم بلند کر رکھا ہے اور فرسودہ افکار ونظریات کی تردید کرتے نظر آرہے ہیں یا پھر کسی نئے گوشے کی بازیافت کا سہرا ان کے سر بندھتا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر مضمون 'پنڈت آنند نرائن ملا: ایک بازیافت' کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''انھوں نے غزل کو نیا معنوی رنگ وآہنگ بخشنے کے علاوہ اس کے کرداروں کے جدید ذہنی اُفق کو دریافت کرنے کی کوششیں کیں، داخلی سطح پر گہری رمزیت اور ابہام سے پرہیز کیا، شاعری میں نفسیات کے بیان کو ترجیح دی، غزل کی ریزہ خیالی کو نظم کا سا ذہنی ارتقا دینے کا بیڑہ اٹھایا اور محض کسی خیال یا فکر کو نظم میں ڈھالنے کے بجائے، نظم میں افسانوی پلاٹ اور فکشنل بیانیے کو داخل کیا.. ملا صاحب کی اس جدّت اور ان کی ایسی افسانوی نظموں کے لیے ایک نئی اصطلاح 'نظمانے' (نظم پلس افسانے) اختیار کی جاسکتی ہے جس میں نظم کی چاشنی اور ترنگ بھی ہے، اور افسانے کا تجسس اور تاثر بھی۔'' (اردو شاعری کی تنقید: ابوبکر عباد، مرکزی پبلی کیشنز، دہلی 2024، ص 129)

مذکورہ بالا اقتباس تو صرف ایک نمونہ ہے۔ زیر بحث مجموعے سے اس طرح کی درجنوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ فن کار نے جب فیض پر گفتگو کی تو اسے کمیونسٹوں کا مردِ مومن قرار دیا، مجروح پر قلم اٹھایا تو اسے مجدد عصر کی مسند پر جا بٹھایا اور فانی پر لب کشا ہوئے تو اسے ناقدین کی سہو سے نجات دلانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان خیالات کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ پیش نظر مجموعے کے تمام تر مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ادب کے مختلف پہلوؤں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں ساتھ ہی قاری کو گہرے فکری مطالعے کی طرف راغب کرتے ہیں تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔

اس مجموعے میں موجود تمام مضامین کی نوعیت دیکھی جائے تو احساس ہوتا ہے کہ فن کار کی تحریریں شعرا کے اصل متن کے آس پاس گھومتی نظر آرہی ہیں۔ ان کے مطالعے سے اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں سلاست اور روانی ہونے کے ساتھ ساتھ دلنشیں اسلوب کی آمیزش بھی ہے۔ علاوہ ازیں تنقیدی بحث میں جدت اور دلائل میں پختگی کے سبب قاری کا ذہن بوجھل ہونے کے بجائے مکمل تحریر کا مطالعہ کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے، تاکہ نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ کتاب کی ابتدا میں نایاب حسن نے پروفیسر ابوبکر عباد کے اسلوب کی رنگینی کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔ نمونے کے طور پر یہ اقتباس دیکھیں:

''زیر بحث موضوع کو پیش کرنے کا ان کا انداز بھی بڑا متاثر کن اور دلچسپ ہوتا ہے۔ ان کی تنقید صرف اس لیے بھی پڑھی جاسکتی ہے کہ اس کی نثر نہایت خوب صورت، دل آگیں اور سلیس وسحر انگیز ہوتی ہے۔'' (ایضاً، ص 9)

زیر بحث تصنیف 'اردو شاعری کی تنقید' نہ صرف ایک علمی کارنامہ ہے بلکہ اردو ادب کے قارئین کے لیے ایک قیمتی سرمایہ بھی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر قاری اردو شاعری کے مختلف پہلوؤں کو بہتر انداز میں سمجھ سکتا ہے۔ مصنف نے اپنی اس تصنیف کے ذریعے اردو شاعری کی تنقید میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے جو آنے والے اوقات میں اردو ادب کے دیوانوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ امید ہے کہ پروفیسر ابوبکر عباد کی دیگر تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی ادبی مجلسوں اور محفلوں میں نمایاں اور منفرد مقام حاصل کرے گی اور ہر اہلِ ذوق افراد کے مطالعے کا حصہ بنے گی۔ اس قابلِ ستائش کارنامے کے لیے وہ تبریک کے مستحق ہیں۔

جموں و کشمیر کی شاعرات

مصنف: ڈاکٹر محمد یاسین گنائی

صفحات: 705، قیمت: 800 روپے، سنہ اشاعت: 2024

پبلشر: جی این کے پبلی کیشنز

مبصر: ڈاکٹر گلزار احمد وانی، ٹینگ پورہ، پلوامہ، کشمیر

'جموں وکشمیر کی شاعرات' کتاب حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے، جسے جی این کے پبلی کیشنز نے خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کو تین بڑے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

باب اول: جموں وکشمیر میں اردو شاعری

باب دوم: وادی کشمیر کی شاعرات

باب سوم خطۂ جموں کی شاعرات

باب اول میں جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے حوالے سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ یہاں شاعری کے سلسلے میں پہلا نمونہ 1121 ہجری بمطابق 1700 میں ملتا ہے اور یہ نمونہ غلام محی الدین کی مثنوی 'گلزار فقیر' کی شکل میں ملتا ہے اس مثنوی کے بارے میں حافظ محمود شیرانی یوں رقمطراز ہیں:

''گجرات دکن میں اگرچہ اردو تالیفات دسویں صدی ہجری سے شروع ہوجاتی ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں دو صدی بعد تک ان کا پتہ نہیں چلتا۔ دہلی میں ابھی اردو داستان

قائم بھی نہیں ہوتا ہے کہ پنجاب میں لوگ اردو کے شیخ غلام محی الدین کی مثنوی 'گلزار فقیر' 1131 ہجری میں ختم کر دیتے ہیں۔" (مقالات شیرانی، حصہ دوم ص 82)

مذکورہ مثنوی کے بعد ایک سو سال تک ریاست میں کوئی دوسرا شعری نمونہ کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ پھر کمال الدین حسین رسوا کا نام آتا ہے۔ جسے یہاں کا پہلا باقاعدہ غزل گو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جموں و کشمیر میں تخلیقی زرخیزیت نہ صرف شعرا کے یہاں نظر آتی ہے۔ بلکہ شاعرات نے بھی شانہ بہ شانہ نہ صرف شعر گوئی میں حصہ لیا ہے بلکہ اس کی آبیاری بھی کی ہے۔ ان کے موضوعات بھی وہی ہیں جو شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ البتہ شاعرات کے یہاں جس تومندی سے نسوانی جذبات و احساسات کا اظہار ملتا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

باب دوم، وادی کشمیر کی شاعرات پر مشتمل ہے۔ جس میں حصہ 'الف' میں شمالی کشمیر کی شاعرات سے کل نو شاعرات کی سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے نمونہ کلام کو بھی شامل کتاب کیا گیا ہے، جن میں ارنی مال، شبنم عشائی قاضی افروزہ، روبینہ قریشی رتبہ، شاہینہ یوسف، وردہ فاطمہ، سکینہ اختر، غزالہ انجم اور نگہت نسرین صاحبہ شامل ہیں۔ ان میں سے چند ہی شاعرات کے اردو کلام کا مجموعہ منصۂ شہود پر آیا ہے اور کچھ نے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اردو شاعری میں طبع آزمائی کی ہے جس کے بعد وہ نثر کی طرف گامزن ہوئیں۔ ان میں چند شاعرات ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں چھپ چکی ہیں اور چند شاعرات کا ابھی تک ایک بھی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ مذکورہ باب کا حصہ 'ب' وسطی کشمیر کی شاعرات پر مشتمل ہے جس میں کل چوبیس شاعرات شامل کتاب ہوئی ہیں۔ کچھ شاعرات مذکورہ باب سے ناپید ہیں، جس کے اسباب کتاب کے 'اپنی بات' حصے میں بیان ہوئے ہیں۔ وسطی کشمیر سے روپہ بھوانی، پران کشوری، سوشیلا ٹکو، شہزادی کلثوم، عائشہ مستور، سلمیٰ فردوس، عابدہ احمد، نصرت رشید، کسم دھر شاروا، صاحبہ شہریار، شفیقہ پروین، رخسانہ جبین، پروین راجہ، نصرت آرا چودھری، فریدہ کول، ترنم ریاض، نسرین نقاش، درخشاں اندرابی، نگہت فاروق نظر، شبینہ پروین، کوثر رسول، عذرا حکاک، اور افروزہ رشید کا نام شامل کیا گیا ہے۔

باب دوم کے حصہ 'ج' میں جنوبی کشمیر کی شاعرات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جن میں لل دید، حبہ خاتون، زینب بی بی محجوب، سنتوش شاہ ناداں، رخشندہ رشید، فیروزہ مجید، عتیقہ صدیقی، شبینہ شبیر، مدثر لالی، نگہت صاحبہ، شبینہ آرا پٹھان، مصروف قادر، شمیم صدیق شمی، یاسمین اقبال خان، روحی جان، اور روشن آرا وغیرہ۔ اگرچہ مذکورہ بالا فہرست میں چند شاعرات نے صرف اور صرف کشمیری زبان میں شاعری کی ہے اور حیرانی کی بات ہے کہ انھیں اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ ورنہ یہاں پر اردو شاعرات کا ذکر کرنا ہی مقصود تھا۔ اگرچہ اولین نعت گو شاعرہ زینب بی بی محجوب کا نام لیا جاتا ہے۔ انھوں نے ریاست میں خواتین کے لیے باقاعدہ شعر و شاعری کی راہیں ہموار کی ہیں، وہ نہ صرف کشمیر کی پہلی اردو شاعرہ ہیں بلکہ نعت گوئی کے ابتدائی نقوش بھی انہی کے یہاں ملتے ہیں۔ زینب بی بی محجوب کو اولیت کا درجہ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'کشمیر میں اردو' میں دیا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'گلبن نعت' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا ہے۔

باب سوم: خطۂ جموں کی شاعرات پر مبنی ہے، مذکورہ باب کو بھی تین حصوں ا، ب، اور ج، میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ 'الف' میں وادی چناب کی شاعرات، حصہ 'ب' میں پیر پنچال کی اور حصہ 'ج' میں ڈوگرہ دیس کی شاعرات کے بطور ترتیب پایا گیا ہے جن میں کل بیس شاعرات کا نام اور کلام شامل کتاب ہوا ہے۔ جن میں مہتاب بیگم، شائستہ مسعود، فوزیہ مغل، روبینہ میر، زاہدہ خانم، ستارہ نرگس نسیم اختر اور گینکا کو بلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خواتین کے حوالے سے اب تک یہ کام تشنہ تھا اور اب یہ کتاب ان شاعرات پر ایک انسائکلو پیڈیا کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ جس کی مبارکبادی کا سہرا ڈاکٹر محمد یاسین کے سر جاتا ہے۔

ترتیب

ڈاکٹر انور حسین خاں اور ان کی بکھری تحریریں (حصہ اول)

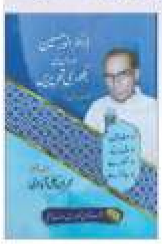

ترتیب و تحقیق: عمران علی آبادی

صفحات: 272، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: اظہر حسین میموریل سوسائٹی، نیورہ، ضلع ایودھیا

مبصر ڈاکٹر محضر رضا،

ریسرچ اسسٹنٹ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ماتا سندری لین، نئی دہلی

ڈاکٹر انور حسین خاں کی تحریروں کا بنیادی سروکار علاقائی ادب، سماجی اور تہذیبی مسائل کی پیش کش اور تفہیم ہے۔ انھوں نے چودھری محمد علی ردولوی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ یہ موضوع بھی ان کے بنیادی میلان کو نشان زد کرتا ہے۔ اگر بات یہیں تک ہوتو اسے اختصاص نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ گرد و پیش کے مسائل سے کون واقف نہیں ہوتا اور اس پر تاثرات پیش کرنا بھی عمومی رویہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ادب کے تمام حاوی رجحانات پر نظر رکھنے کے سبب ان مسائل کو بڑے سیاق میں پیش کرنے پر قادر ہیں۔ ان کی دلچسپی کا میدان خاصا وسیع ہے جس کا اندازہ زیر تبصرہ کتاب کے سرسری مطالعے سے بھی ہو جاتا ہے۔ عالمی مسائل پر نظر اور جدید سہولتوں سے واقفیت کے باجود اگر کوئی خاص خطہ ہمیں پکڑ لے تو ضرور اس میں کچھ ایسی طلسمی کشش ہے جس کی نظیر دوسرے خطے فراہم نہیں کرتے۔ ڈاکٹر انور حسین خاں اگر اپنے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے جن پر ایک زمانے سے لکھا جا رہا ہے اور آج بھی ان موضوعات میں قارئین کی دلچسپی بدستور ہے تو شہرت عام کی دولت ان کے حصے میں نسبتاً زیادہ آتی۔ لیکن وہ موضوعات اظہار سے محروم رہ جاتے جن کی طرف نہ کے برابر توجہ کی جاتی ہے۔ ان کی اہم تصانیف کو شاید رسالوں کی فائلوں میں اپنے قارئین کا طویل انتظار کرنا پڑتا۔ خوش قسمتی سے عمران علی آبادی جیسے قدر شناس نے ان کو کتابی شکل میں یکجا کر کے بڑی سہولت فراہم کر دی ہے۔ ڈاکٹر انور حسین خان نے بھی اپنے لیے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ان کی توجہ کے سبب بھٹی قوم کی تاریخ اور واصف ردولوی کی شاعری محفوظ ہوگئی۔ واصف ردولوی ایک کہنہ مشق شاعر تھے جن کے مداح اور شاگرد قرب و جوار میں پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کا کلام مرتب شکل میں سامنے نہیں آیا تھا۔ انور حسین خاں نے ایک جامع مقدمے کے ساتھ اسے شائع کر کے امتداد زمانہ کی دست درازی سے محفوظ کر دیا ہے۔ انور حسین خاں کی تمام نگارشات کو یکجا دیکھنے کی غرض سے عمران علی آبادی کی کتاب 'ڈاکٹر انور حسین اور ان کی بکھری تحریریں' ایک مفید ذریعہ ہے۔ اس کتاب

میں ان کے مضامین، افسانے اور تبصرے مرتب شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول ڈاکٹر انور حسین اور ان کی تمام تحریروں کے تعارف کا وسیلہ ہے۔ صرف چار صفحات میں قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ آئندہ صفحات میں اسے کس قسم کے موضوعات کا سامنا ہوگا۔

دوسرے باب میں شعرا سے متعلق مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ جن میں علامہ اقبال، شمسی مینائی، میکش لکھنوی، مختار بھٹی، کیف ردولوی، شاہ اقبال ردولوی، فرزانہ سبطین فرزی وغیرہ جیسے سخنوروں پر تنقیدی اور تجزیاتی نوعیت کے مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر انور حسین تخلیق کار کو اس کے تہذیبی سیاق میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ ان کے مضامین میں اکثر تخلیق کار کی بود و باش اور تہذیبی سروکار کو ابھارنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اقبال ہوں یا شمسی مینائی ہر تخلیق کار کے تہذیبی رویے کو انھوں نے تخلیق کے ساتھ مربوط کیا ہے۔

تیسرا باب متفرق مضامین کے لیے مختص ہے۔ اسی باب میں ڈاکٹر انور حسین کی ادارتی اور مراسلاتی تحریریں بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ان کی ادارتی تحریروں کے ذریعے ان کی شخصیت کا مختلف پہلو سامنے آتا ہے۔ یعنی ان کے مذہبی افکار سے ہم واقف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انور حسین خاں نے مہمان مدیر کی حیثیت سے انجمن رفاہ ملّت ردولی کے یادگاری مجلّے کے اداریے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر انور حسین کے یہاں مذہب کا تصور اخلاقیات کا ہی متبادل نام ہے۔ وہ راست بازی، دیانت داری ایفائے عہد وغیرہ کو مذہب کی سب سے اہم بنیاد تصور کرتے ہیں۔ اس طرح تمام ادیان عالم اور ان کے عقیدے میں ایک فکری وحدت قائم ہو جاتی ہے۔ اس کا ثبوت اس طرح بھی فراہم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اداریے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اس نظم کو نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کی تلقین کی ہے۔

چوتھے باب میں وہ تبصرے ہیں جو ڈاکٹر انور حسین نے مختلف موضوعات کی کتابوں پر لکھے ہیں۔ ان میں شاعری، ادب، مذہب، تاریخ، سوانح جیسے موضوعات شامل ہیں۔ بعض تبصرے تو برائے تبصرہ ہیں لیکن کچھ تبصرے بڑی تفصیل کے ساتھ کتاب کی اہمیت اور خامیوں کو واضح کرتے ہیں۔ اس طرح کے جامع تبصروں سے ڈاکٹر انور حسین کی تنقیدی بصیرت اور تاریخی شعور زیادہ واضح انداز میں سامنے آتے ہیں۔ یہ تبصرے زیادہ تر ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئے تھے۔ اس باب میں بارہ بنکی کے شعرا کے لیے علاحدہ فصل قائم کی گئی ہے۔

پانچویں باب میں ابتدائی دور کے دو افسانے 'چودھری جی' اور 'شکاری' شامل ہے۔ رومانی انداز کے یہ افسانے ڈاکٹر انور حسین کی ابتدائی تحریروں میں شامل ہیں اور انھیں اسی نظر سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ 'چودھری جی' ایک چھوٹے سے گاؤں کی کہانی ہے جس میں یہ سبق ہے کہ تعلیم سے اگر نوکری نہ بھی ملے بصیرت ضرور ملتی ہے۔ رمیش نامی نوجوان اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور وہ سماج کو سدھارنے کا عزم رکھتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ کوئی بڑا انقلابی قدم نہیں اٹھاتا لیکن اس کی تعلیمی بصیرت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ گاؤں میں بڑا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری کہانی 'شکاری' گاؤں کے دبے کچلے اور سادہ لوگوں کی معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھانے والے غیر انسانی رویوں کو بیان کرتی ہے۔ اس کہانی کا راوی ایک نوجوان ہے جو امتحان کی تیاری کے لیے ایک مناسب مکان کی تلاش میں ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ دونوں کہانیوں میں تعلیم یافتہ نوجوان یا تو مرکزی کردار میں ہے یا راوی کی شکل میں۔ یہ صاف اشارہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان ہی معاشرے میں بیداری پیدا کر سکتے ہیں۔ ان دونوں کہانیوں کے بین السطور میں ظلم کے خلاف لوگوں کی خاموشی کو بھی ظلم کی اصل وجہ بتایا گیا ہے۔

چھٹے باب میں ڈاکٹر انور حسین کی تحریروں پر شائع ہونے والے تبصرے شامل ہیں۔ اسی ذیل میں مشاہیر کے خطوط کے ان اقتباسات کو بھی پیش کیا گیا ہے جن میں کتاب پر اظہار خیال ہے۔ گویا یہ بھی ایک تبصرہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے خطوط کے تین اقتباسات انور حسین خاں سے ان کے تعلق کو نمایاں کرتے ہیں۔

ساتویں اور آخری باب میں ڈاکٹر انور حسین کی تحریر کا عکس اور ان کی تصویریں اس کتاب کو ایک یادگار مرقع بناتی ہیں۔ یہ کتاب ڈاکٹر انور حسین خاں کی شخصیت اور ادبی زندگی کے تعارف کے علاوہ ان کی تحریروں کے ذریعے ہماری معلومات میں اضافے کا بھی سبب ہے۔ کتاب کی دوسری جلد زیر ترتیب ہے۔ عمران علی آبادی نے مضامین کی تلاش اور ترتیب میں کمال مشقت اور سلیقے کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان دونوں جلدوں کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر انور حسین کی ادبی شخصیت مکمل وضاحت سے سامنے آئے گی اور ادب کے بہت سے نیم روشن پہلو ہم پر واضح ہوں گے۔

فکشن

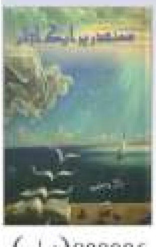

سمندر پر ایک اذان

مصنف: اختر واصف

صفحات: 144، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: اشفاق عادل، 403، دود پلازہ اپارٹمنٹ، پتھر کی مسجد، پٹنہ۔ 800006 (بہار)

'سمندر پر ایک اذان' اختر واصف کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اختر واصف 80 کی دہائی کے معتبر افسانہ نگار ہیں۔ اختر واصف نے 1973 سے افسانہ نگاری کی ابتدا کی تھی۔ جب اردو افسانے کی فضا پر علامتی اور تجریدی افسانوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ انھوں نے جو کہانیاں لکھیں ان میں سے 15 منتخب کر کے 'سمندر پر ایک اذان' میں یکجا کر دی ہیں۔

زیر تبصرہ کہانیوں سے گزرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اختر واصف متوسط طبقہ کے افراد و واقعات سے کہانیوں کا خمیر تیار کرتے ہیں۔ لہٰذا نامانوسیت کی پرچھائیں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنی کہانی کی عمارت ان لوگوں کی زندگیوں سے نہیں تیار کرتے جو اپنے عافیت کدوں میں بیٹھ کر بڑی شانِ بے نیازی سے دبے کچلوں کی زندگیوں پر فلسفیانہ گفتگو کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کہانیوں سے ایک گونہ ذہنی قربت کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ اپنے کرداروں کی زندگیوں کے صرف داستان گو ہیں مبلغ نہیں۔ المختصر یہ کہ ان کو افسانے کی زبان پر دسترس ہے اور انھیں بہت ہی چھوٹی سی بات کو افسانہ بنا دینے کا فن بخوبی آتا ہے۔

اختر واصف نے بھی علامتی اور تجریدی افسانے لکھے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مجموعہ میں ان کی محض تین ہی علامتی کہانیاں ہیں، وہ ہیں 'زمین میں گڑے ہوئے

پاؤں'، 'دیواریں ہنستی ہیں'، 'وہ یہاں بھی آ پہنچا'۔ بقیہ راست کردار مرکوز بیانیہ افسانے ہیں۔

'ہاتھ' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے، جو ایک بہترین مختصر افسانے کے انتخاب میں جگہ پانے کے لائق ہے۔ اس دیمک زدہ صارفی کلچر میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص خود سے ہی مطلب رکھتا ہے اسے دوسروں کے رنج و تکلیف سے کچھ غرض نہیں۔ کوئی مرتا ہے تو مرے ہمیں کیا! لیکن ابھی بھی ہمارے معاشرے میں چند ایسے ٹمٹماتے ہوئے چراغ روشن ہیں جن کے وجود سے انسانیت زندہ ہے۔ 'ہاتھ' کے مشتاق صاحب کا کردار بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مصیبت میں پڑے شخص کی آگے بڑھ کے مدد کریں لیکن کوئی انجانی طاقت انھیں روکنے لگتی ہے کہ جناب آپ اس پچڑے میں نہ پڑیں ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آج ہم سبھی میں ایک مشتاق صاحب ملیں گے۔ 'ہاتھ' بظاہر ایک بیانیہ کہانی ہے لیکن افسانہ نگار نے 'ہاتھ' کو اس میں ایک علامت کی طرح برتا ہے جو اپنے اندر کئی زیریں لہریں رکھتا ہے۔

'کمرہ' بھی ایک عمدہ کہانی ہے۔ اس کہانی میں ایک مخصوص کمرے کا ذکر بار بار آتا ہے۔ کمال خوبی یہ ہے کہ اسے کہانی کار نے ایک ذی روح کردار کی شکل دے دی ہے۔ مذکورہ کمرہ دو جنریشن کی سوچ کی کہانی بیان کرتا ہے۔ ایک وہ وقت، جب زبان امیر خسرو، غالب، اقبال، آزاد کے افکار و فلسفے کا ذکر کرتی تھی، دیواروں پر ان کی تصاویر ہوتی تھیں اور سینوں میں مشرقی اخلاقیات و رواداری کا چراغ روشن تھا لیکن وقت بدلا تو نئی نسل ان تمام اقدار سے نابلد ہوگئی۔ اب مجاہدین وآزادی کی جگہ ہالی وڈ ایکٹر اور پوپ سنگرز کی تصاویر سے کمرہ مزین تھا۔ کمرہ دکھاتے وقت کا منظر اور شمیم کے بیٹے کی گفتگو ہمیں اندر تک جھنجھوڑ دیتی ہے۔

رشتوں اور اقدار کی پامالی اور دولت کے پیچھے بھاگنے پر لکھی گئی کہانیاں ان کے بالغ نظر احساس و فکر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ 'کچھ الم غلم چیزیں'، 'سمندر پر ایک اڑان'، 'فرد بیان' ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ جن میں طنزیہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ روپیہ کمانے اور عشرت بھری زندگی جینے کے لیے آدمی کس قدر اخلاقی پستی میں گر سکتا ہے اس کی ایک اچھی مثال یہ کہانیاں ہیں۔

'دوسرے درجے کا ٹکٹ' سماجی نابرابری کے موضوع پر لکھی گئی ایک اہم کہانی ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان جو تفریق ہے اس کے نام پر بھی نے اک دوسرے کو دوسرے درجے کا ٹکٹ تھمار کھا ہے کیونکہ ہر من لکڑا جو آدیواسی ہے اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ ہمارے حلق میں سماجی نابرابری کے کانٹے کی طرح ابھی بھی چبھا ہوا ہے۔ سماج کے حاشیائی کرداروں پر لکھی گئی کہانیوں میں بلا تامل اس کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

زیر تبصرہ مجموعہ کی دیگر کہانیاں 'آخری راہ'، 'یک بابی ڈرامہ'، 'گلی' بھی قابلِ مطالعہ ہیں اور ہمیں گرفت میں لے کر بھرپور طمانیت بخشتی ہیں۔ ان کہانیوں سے گزرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کو زبان و بیان، منظر نگاری اور جزئیات نگاری پر گرفت ہے۔ اس کا اسلوب پر پیچ نہیں پر کشش ہے۔ وہ کسی منظر یا محسوسات کو لطف زبان کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ چاہے خوف و ہراس میں ڈوبے گاؤں کا منظر ہو یا 'محبت کی ایک کہانی' کے کرداروں کی خلوت کا بیان جس میں لطیف احساس جمال ہے، جنسی تلذذ نہیں۔ 'زمیں میں گڑے ہوئے پاؤں'، 'دیواریں ہنستی ہیں' اور 'وہ یہاں بھی آ پہنچا' اس مجموعہ کی علامتی کہانیاں ہیں۔

زیر نظر 'سمندر پر ایک اڑان' میں افسانہ نگار نے اکثر ایسے موضوعات و واقعات کو کہانی کی شکل دی ہے جو بڑے کینوس کا احاطہ کرتے ہیں۔ مجموعہ میں ہر کہانی اک الگ موضوع اور مختلف مسائل کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔ ان کا تخلیقی سرچشمہ قوتِ اظہار سے روشن ہے۔ وہ کہانی اس طرح کہتے ہیں کہ قاری کا ذہن تخلیق کی غیر مرئی لہروں میں بہتا چلا جاتا ہے۔ وہ چاہتے تو ان کے بطن میں جو مسائل ہیں ان پر اپنے کرداروں کی زبانی سو کالڈ دانشوروں کی طرح بہت کچھ کہہ سکتے تھے لیکن یہ ان کا کمال ہنر ہے کہ وہ بڑی خوبصورتی سے دامن کشاں نکل جاتے ہیں یعنی وہ کرداروں کے مبلغ نہیں بنتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے کرداوں کی نفسیات، حرکات و سکنات اور واقعات کی ماجرا سازی کے پس منظر میں اشاروں کی زبان میں کہہ جاتے ہیں۔ بعض مقام پر تو ایسا لگتا ہے کہ اب کردار ضرور کچھ بولے گا لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ اس طرح کہانی کا عروج وانجام طمانیت سے بھرپور ہوتا ہے۔

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔ یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بچوں کا لٹریچر تیار کرنا قومی اردو کونسل کی ترجیحات میں شامل: ڈاکٹر شمس اقبال

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'خواب، کتاب اور بچے' کے عنوان سے بچوں کے ادب پر سہ روزہ ورکشاپ

ممبئی/دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام خلافت ہاؤس، ممبئی میں 'خواب، کتاب اور بچے' کے عنوان سے آج سہ روزہ ورکشاپ کا افتتاح عمل میں آیا۔ ورکشاپ کے افتتاح سے قبل 'گل بوٹے' اور خلافت ہاؤس کے اشتراک سے جشن بچپن کا بھی افتتاح عمل میں آیا جس کے مہمان خصوصی قومی اردو

کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال تھے۔ خلافت ہاؤس میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ادب کی تخلیق کے لیے سہ روزہ ورکشاپ اور نمائش کتب وفروخت کا اہتمام کیا گیا جس میں مہاراشٹر اور بیرون مہاراشٹر کے اہم ادبا و تخلیق کار شریک ہوئے۔

ورکشاپ کے افتتاح کے موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تفصیل سے ورکشاپ کا تعارف اور مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کے لیے عہد حاضر کی ضرورتوں کے مطابق ادب تخلیق کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل آپ کے دروازے پر مہم کے تحت ملک بھر کے بچوں کو کتابوں سے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہے اور ان کے لیے مفید لٹریچر تیار کروا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سہ روزہ ورکشاپ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ڈاکٹر حافظ کرناٹکی نے کہا کہ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر آنے والی نسل کو اچھی غذا فراہم کر رہے ہیں، یہ کام ہر صوبے میں ہونا چاہیے، اور اس طرح کے تدریبی پروگرام پورے ہندوستان میں ہونا چاہیے۔ آج کا یہ پروگرام ایک تاریخی پروگرام ہے، جس انداز سے کہانیوں کا سلسلہ چل رہا ہے بڑا اہم کارنامہ ہے، اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے بھی اس ورکشاپ کو اپنی نوعیت کا منفرد پروگرام قرار دیتے ہوئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

قابل ذکر ہے کہ اس سہ روزہ ورکشاپ میں ڈاکٹر حافظ کرناٹکی، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، آفتاب حسنین، ایم مبین، اقبال نیازی، مشتاق کریمی، محمد اسلم پرویز، حامد اقبال صدیقی، فرحان حنیف وارثی، شاہ تاج خان اور اقبال برکی نے بحیثیت تخلیق کار شرکت کی۔

ورکشاپ کے آغاز سے قبل ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ نفیسہ مظفر حسین، سرفراز آرزو، قومی اردو کونسل کے ممبر عبدالستار، عرفان علی پیرزادے، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، فاروق سید، خورشید صدیقی وغیرہ کے ہاتھوں قومی اردو کونسل کے بک اسٹال کا فیتہ کاٹ کر افتتاح ہوا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 جنوری 2025

قومی اردو کونسل میں 76 ویں یوم جمہوریہ کے موقعے پر تقریب پرچم کشائی

نئی دہلی: جمہوریت ایک عظیم نعمت ہے جس کی پاسداری اور حفاظت ہمارا قومی فریضہ ہے۔ جمہوریت جہاں ہمیں بہت سارے سیاسی و سماجی حقوق سے بہرہ ور کرتی ہے وہیں ہمارے اوپر اس کی بقا اور استحکام کے حوالے سے کچھ ذمے داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جنھیں نبھانا ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار 76 ویں یوم جمہوریہ کے موقعے پر

پرچم کشائی کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کا دن محض جشن منانے کا دن نہیں ہے بلکہ یوم احتساب بھی ہے۔ آج کے دن ہمیں ملک کی تعمیر وترقی میں اپنے کردار کا جائزہ لینا چاہیے اور یہ عہد بھی کرنا چاہیے کہ اپنے قومی فرائض کی ادائیگی میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیں گے۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اردو نثر ونظم کا ہندوستانی جمہوریت کے تحفظ میں غیر معمولی کردار رہا ہے اور ہمارے شاعروں، صحافیوں اور تخلیق کاروں نے قومی شعور بیدار کرنے اور حب الوطنی کے جذبات کو مستحکم کرنے میں تاریخی رول نبھایا ہے۔ قومی اردو کونسل اس زبان کے فروغ واشاعت کے لیے مختلف سطحوں پر کام کر رہی ہے اور اس زبان کو نئی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ قبل ازاں قومی اردو کونسل کے صدر دفتر جسولہ میں پرچم کشائی تقریب کا نہایت تزک واحتشام سے اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے پرچم کشائی کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جنوری 2025

قومی اردو کونسل کے کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائننگ سینٹرز کے ذمے داران کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے صدر دفتر میں کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائننگ سینٹرز کے ذمے داران کی میٹنگ ہوئی جس میں دہلی اور

بیرون دہلی کے سینٹر انچارج شامل ہوئے۔ واضح رہے کہ دہلی کے باہر کے سینٹروں کے ذمے داران آن لائن اس میٹنگ کا حصہ بنے۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ کیلی گرافی ہماری تہذیب کا حصہ ہے، اس کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے اور اس سے روزگار کے مواقع بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس میٹنگ کا مقصد تمام سینٹر کے ذمے داران کے ساتھ انٹریکشن اور تعارف ہے۔ سینٹرز کے ذمے داران کے مشورے کی روشنی میں ہم اس کورس کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک) نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائننگ سینٹرز میں اچھے تربیت یافتہ، تجربہ کار اساتذہ کے انتخاب پر زور دیا۔ اس موقعے پر میٹنگ میں شامل سینٹرز کے ذمے داران کو کچھ ہدایات بھی دی گئیں۔ ریسرچ آفیسر انتخاب احمد کے شکریے پر میٹنگ کا اختتام عمل میں آیا۔ میٹنگ میں محمد قاسم اور محمد افروز وغیرہ بھی شریک ہوئے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 جنوری 2025

قومی اردو کونسل میں نوجوان اردو قلمکاروں کے ساتھ ڈائرکٹر کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں آج دہلی کے نوجوان قلمکاروں کے ساتھ ایک میٹنگ کا انعقاد ہوا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نوجوان قلمکاروں سے ملنا، ان کو جوڑنا اور ان پر توجہ دینا میری ترجیحات میں شامل ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ کس طرح قومی اردو کونسل کے پلیٹ فارم سے نوجوان قلمکاروں کو

جوڑا جائے اوران کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جائے۔انھوں نے مزید کہا کہ نئی نسل میں علمی وتخلیقی امکانات کی کمی نہیں ہے،بس ضرورت ہے کہ ان کی صحیح رہنمائی کی جائے اوران کی صلاحیتوں کومنظم طریقے سے پروان چڑھایا جائے۔نوجوانوں کی مثبت انداز میں ذہن سازی کی ضرورت ہے۔اس موقعے پر مدعو قلمکاروں نے ادب کی موجودہ صورتِ حال خصوصاً بچوں کے ادب اور انھیں کتابوں سے جوڑنے کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اوراس حوالے سے کچھ سوالات بھی کیے جن کا ڈاکٹر شمس اقبال نے جواب دیا۔ میٹنگ میں ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر غزالہ فاطمہ، ڈاکٹر سفینہ بیگم، ڈاکٹر ریحان، ڈاکٹر امیر حمزہ، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی، ڈاکٹر محمد عرفان، ڈاکٹر جاوید عالم، ڈاکٹر نورین علی حق، ڈاکٹر ذاکر فیضی، ڈاکٹر شاہد حبیب فلاحی، سفیر صدیقی، ذبیح اللہ کے علاوہ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی ودیگر اراکین موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 جنوری 2025

قومی اردو کونسل اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اشتراک سے 'ادب کیوں پڑھیں؟' کے عنوان سے خصوصی لیکچر

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام 'ادب کیوں پڑھیں؟' کے عنوان سے خواجہ احمد فاروقی لائبریری کمرہ نمبر 79

میں آج ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔اس پروگرام میں مقرر کی حیثیت سے سینئر شاعر و ادیب جناب ادین واجپئی نے شرکت کی، صدارت پروفیسر اپتابھ چکرورتی ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، جواہر لال نہرو یونیورسٹی شریک رہے۔کونسل کے ڈائرکٹر ،ڈاکٹر شمس اقبال اپنی مصروفیت کی وجہ سے پروگرام میں شریک نہیں ہوسکے،البتہ ان کا تحریری پیغام پیش کیا گیا۔ پیغام میں انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان کا ادب نہ صرف انسانی شعور کو جلا بخشتا ہے،بلکہ انسان کی انفرادی واجتماعی تربیت میں بھی ادب کا غیر معمولی کردار ہوتا ہے،اسی لیے باشعور معاشرے میں ادب کے مطالعے پر زور دیا جاتا ہے۔انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل اردو زبان کے فروغ کے لیے مختلف النوع اسکیمیں چلانے کے ساتھ عمومی سطح پر ادب کا شستہ وشستعلیق ذوق پیدا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کررہی ہے اور معیاری ادبی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ملک بھر میں ادبی سمینار، سمپوزیم، مذاکروں، خصوصی لیکچرز اور ورکشاپس کا انعقاد بھی اس کی سرگرمیوں کا حصہ ہے۔ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ 25-2024 کے عرصۂ عمل میں کونسل نے ملک کے طول وعرض میں بیسیوں بڑے پروگراموں اور سو سے زائد ادبی مذاکروں کا انعقاد کیا ہے،جن میں ملک بھر سے کم وبیش چار سو نوجوان اور سینئر ادبا، دانشوران اور اسکالرز نے حصہ لیا ہے، جو یقیناً فروغ ادب کے نقطۂ نظر سے کونسل کی بڑی حصول یابی ہے۔

اپنے خصوصی لیکچر میں جناب ادین واجپئی نے کہا کہ ہر انسان شعوری اعتبار سے دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، جس کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہتا ہے، ادب بھی اسی کی ایک شکل ہے۔انھوں نے کہا کہ ادب انسان کے احساس وادراک کو نکھارتا ہے اور اسے حقائق اشیا کو قبول کرنے پر ابھارتا ہے۔انھوں نے کہا کہ ادب اور ادیب کا اصل کام دنیا کو بدلنا نہیں ہے بلکہ چیزوں کی حقیقت کو سمجھنا اور سمجھانا ہے اور ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے یہی مقصد پیش نظر رکھنا چاہیے۔انھوں نے ادب کی تفہیم کے حوالے سے شعور کے مختلف مدارج پر تفصیلی گفتگو کی۔

پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ اکیسویں صدی کے ترقی یافتہ دور میں یہ سوال اہم ہے کہ ہم ادب کیوں پڑھیں؟ مگر دنیا چاہے جتنی ترقی کرلے ادب کی ضرورت کل بھی تھی، آج بھی ہے اور آیندہ بھی رہے گی، کیوں کہ اس کے بالمقابل کسی ٹکنالوجی اور عصری علوم وفنون کو نہیں رکھا جا سکتا۔ کیونکہ یہ سارے علوم عقل کا بیانیہ ہیں اور ادب دل کا بیانیہ ہے۔ ادب بنیادی طور پر جمالیاتی احساس کا اظہار ہے، جس میں ادراک وعرفان بھی شامل ہوتا ہے۔ پروفیسر اپتابھ چکرورتی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ادب اور شاعری انسان کے احساسات وخیالات کی حقیقی ترجمان ہے اور ادب کی تمام اصناف کا مطالعہ انسان کے اندر اچھے برے ادب کی تمیز پیدا کرتا ہے۔ ادب انسان کو اس کی قدر و قیمت سے آگاہی بخشتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسان کی اصل خوبی اس کے ظاہر میں نہیں بلکہ باطن میں ہوتی ہے،اس لیے انسان کو اپنے عرفان کے لیے ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

پروفیسر ابوبکر عباد نے اختتامی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ادب کا مطالعہ انسان میں صبر وتحمل پیدا کرتا ہے، جمال پسندی کا ذوق بیدار کرتا ہے۔انھوں نے کہا کہ ادب پڑھنے سے ہی انسان سماج، ملک، معاشرہ اور خود اپنے آپ کو سمجھ سکتا ہے۔آخر میں ان کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔نظامت کے فرائض پروفیسر ارجمند آرا نے انجام دیے۔اس موقعے پر کونسل سے ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر)، نایاب حسن (ریسرچ اسسٹنٹ)، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبا وطالبات اور ریسرچ اسکالرز کے علاوہ شعبۂ فارسی، عربی، ہندی و انگریزی کے اساتذہ واسکالرز بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 فروری 2025

اودھ نامہ
avadhnama

اردو تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

اردو اور فارسی شاعری پر لیکچرز

نئی دھلی: دہلی میونسپل کارپوریشن کے ہیریٹیج سیل نے چاندنی چوک کے تاریخی ٹاؤن ہال میں اپنے ورثہ 'واک سیریز' کے ایک حصے کے طور پر 'اردو اور فارسی شاعری: ایک تعارف' پر لیکچر کا اہتمام کیا۔ پروگرام میں اسکالرز اور شائقین اردو فارسی شریک ہوئے۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر شریف حسین قاسمی اور پروفیسر علیم اشرف خان نے لیکچر دیا، جس میں اردو اور فارسی کی ترقی، اس کی مطابقت اور ہندی میں اس کی شراکت کو اجاگر کیا گیا۔ دہلی میونسپل کارپوریشن کے کمشنر اشونی کمار اس موقعے پر موجود تھے۔ کارپوریشن کمشنر نے ہندوستان کے ثقافتی ورثے کو فروغ دینے کی اہمیت کو قبول کرتے ہوئے اس پروگرام کی تعریف کی۔ ایم سی ڈی کا ہیریٹیج سیل اس طرح کے پروگراموں کو منظم کرنے کے لیے پرعزم ہے جس کا مقصد دہلی کے ثقافتی ورثے کے بارے میں عوام کو روشناس کرانا ہے اور شہریوں میں معاشرتی جذبے کو فروغ دینا ہے۔ لیکچرز، واک اور دیگر اقدامات کی میزبانی کرکے ہیریٹیج سیل شہر کی تاریخ کو محفوظ کرنا چاہتا ہے تاکہ اسے سب کے لیے قابل رسائی اور پرکشش بنایا جاسکے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 جنوری 2024

اردو ادب کا میر نمبر

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو کے مرکزی دفتر اردو گھر میں تقریر کرتے ہوئے ایران کے سفیر کبیر ڈاکٹر ایرج الٰہی نے میر کی خودنوشت ذکر میر کے مکمل متن کی بازیافت پر انجمن کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ مجھے اردو نہیں آتی مگر میرے جن رفیقوں نے بھی ڈاکٹر صدف فاطمہ کا یہ ترجمہ پڑھا ہے، انھوں نے اس ترجمے کو بے مثال ترجمے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ میر کی صحیح تفہیم میں بھی معاون ہوگا۔ کلیدی خطبہ شریف حسین قاسمی نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو میں اب تک میر پر ایسا کوئی شمارہ شائع نہیں ہوا جو اردو ادب کے اس مثالی نمبر کے ہم پلہ ہو۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے لائف ٹرسٹی سلمان خورشید نے کہا کہ مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اسلامیہ کالج کے ذخیرے کو ذاکر صاحب نے ہی علی گڑھ منتقل کیا تھا اور اس میں ذکر میر کا اہم ترین متن بھی تھا۔ پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ اردو ادب کا میر تقی میر نمبر مطالعات میر میں نئی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جنوری 2024

حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر

نئی دھلی: جامعہ ہمدرد میں سپورٹ سوسائٹی کے زیر اہتمام تیسرا حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر منعقد کیا گیا، جو علمی، فکری اور طبی حلقوں کے لیے ایک بامعنی اور اہم موقع ثابت ہوا۔ سید منیر عظمت نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔

تقریب کے کلیدی مقرر ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی تھے، جنھوں نے حکیم عبدالحمید کی زندگی، ان کے علمی ورثے، اور ان کے وژن پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر یوگیتا منجال نے پروگرام میں شرکت کی۔ اس موقعے پر ایک نئی کتاب کی رونمائی کی گئی اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو اعزازات سے نوازا گیا۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر ایم افشار عالم نے صدارت کرتے ہوئے حکیم عبدالحمید کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا اور جامعہ ہمدرد کے کردار اور کامیابیوں پر روشنی ڈالی۔ سپورٹ سوسائٹی 2022 سے حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر کی روایت کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ان کی خدمات کو نئی نسل تک منتقل کرنے کے لیے اہم ذریعہ ہے۔ پرگرام میں جامعہ ہمدرد، آیورویدا اینڈ یونانی طبیہ کالج، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و اساتذہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جنوری 2025

ایران اور ہندوستان کے درمیان تہذیبی تعلقات

نئی دھلی: سینٹر فار ویسٹ ایشین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے 'ایران اور ہندوستان کے درمیان تہذیبی تعلقات: صلاحیتیں اور امکانات' کے موضوع پر ایک انتہائی معلوماتی اور فکر انگیز ٹاک کی میزبانی کی۔ ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر فریدالدین فرید عصر نے یہ ٹاک پیش کیا۔ ڈاکٹر فرید عصر نے ہندوستان اور ایران کے مابین سیاسی و تہذیبی تعلقات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ ان کی گفتگو جغرافیائی سیاست، مشترکہ تہذیب، ادب اور آرٹ سمیت وسیع کینوس کو محیط تھی۔ سیمینار کے کنوینر پروفیسر انیس الرحمٰن نے ہند-ایرانی تعلقات کی اہمیت کو اجاگر کیا اور بتایا کہ دونوں ملکوں کے درمیان افہام و تفہیم کو بہتر کرنے میں تہذیبی لین دین کس طرح معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ پروفیسر ہمایوں اختر نظامی، ڈائریکٹر، سینٹر فار ویسٹ ایشین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تجزیے پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ پروفیسر نظامی نے شکریہ ادا کیا اور بحث و مباحثہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ایرانی تہذیب اور سماج کے مطالعے میں دلچسپی رکھنے والے محققین کو تعاون فراہم کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر فریدالدین فرید عصر کا ذکر کیا۔ اخیر میں انھوں نے تمام شرکا کی ستائش کی اور پروگرام منعقد کرانے کی اہمیت واضح کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 جنوری 2025

این ایل ای انسٹی ٹیوٹ مصطفیٰ آباد کے ذریعے سالانہ تقریب

نئی دہلی: این ایل ای انسٹی ٹیوٹ مصطفیٰ آباد کے ایس این پیلیس میں سالانہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔

اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل)، وزارت تعلیم حکومت ہند کے ذریعے چل رہے کورس میں سال 2024 میں کامیاب ہونے والے طلبا کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی جناب وید پرکاش شرما نے جولائی 2024 میں پاس ہونے والے طلبا کو میڈل اور ڈپلوما دیگر ان کی حوصلہ افزائی کی اور سبھی طلبا کو محنت اور لگن سے پڑھنے اور سیکھنے کی جانب راغب کیا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جرار احمد نے بچوں سے خطاب کیا اور انھیں بہترین مستقبل کی دعا دی اور بچوں سے آگے بھی محنت اور لگن کے ساتھ پڑھنے کی تلقین کی اور کہا کہ محنت اور لگن سے ہی آپ کی زندگی میں بہتری آسکتی ہے اور آپ اپنے ادارے کا نام روشن کرسکتے ہیں۔

روزنامہ 'سالار ہند'، دہلی، 30 جنوری 2025

اترپردیش

'بتیا' کی 'ہیریٹیج آف اودھ' کے زیراہتمام دلکش پیشکش

لکھنؤ: ڈرامے ہماری تہذیب و ثقافت کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ مذکورہ خیال کا اظہار سابق جج بی ڈی نقوی نے ڈرامے کے اختتام پر کیا۔ 'ہیریٹیج آف اودھ' نامی ٹرسٹ کے زیراہتمام ایک ڈراما 'بتیا' والمیکی آڈیٹوریم نزد ریزرو بینک میں پیش کیا گیا جس میں مختلف کرداروں اور فنکاروں نے اپنی بہترین اداکاری سے ناظرین کو مسحور کیا۔ اس ڈرامے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں جج کا کردار ادا کرنے والے بی ڈی نقوی حقیقی زندگی میں بھی جج رہ چکے ہیں۔ ڈرامے کی ہدایت کاری ریاض علوی نے کی، ورکشاپ کے ڈائریکٹر رحمان خان، پروڈیوسر مجتبیٰ خان اور میوزک اسسٹنٹ علشبا خان نے حصہ لیا اور اس ڈرامے کو کامیاب بنانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ نظامت مس انجم نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 جنوری 2025

نئے ناولوں میں دلت مسائل

میرٹھ: اب وقت آچکا ہے کہ ناقد اور فنکار سوچیں اور محاسبہ کریں کہ آخر دلت ادب لکھنے میں اردو والوں نے اتنی تاخیر کیوں کردی۔ حالانکہ صغیر رحمانی، احمد صغیر اور غضنفر وغیرہ نے دلت ادب پر خاصا کام کیا ہے، لیکن ابھی بھی دلت ادب پر لکھنے اور ان کے مسائل اٹھانے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد پروفیسر صغیر افراہیم کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیراہتمام منعقد ادب نما کے ہفت روزہ پروگرام بعنوان 'نئے ناولوں میں دلت مسائل' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کررہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانان کے بطور پروفیسر عارفہ بشریٰ، صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، پروفیسر متھن کمار، دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر احمد صغیر، معروف فکشن نگار نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات طالبہ فرحانہ، نظامت کے فرائض اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کی۔ اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اردو میں بہت سے ناول اور افسانے ایسے ملتے ہیں جن میں دلت مسائل کثرت سے موجود ہیں۔ دیگر زبانوں مثلاً تمل، تیلگو وغیرہ میں دلت مسائل زیادہ نظر آتے ہیں مگر افسوس اردو میں یہ دیگر زبانوں کے مقابلے کم ہیں۔ 'دویہ بانی' میں دلت مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 'تخم خوں' میں بھی دلت مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر احمد صغیر نے کہا کہ دلت غربت کا مترادف ہے۔ دلتوں نے اپنے مسائل کے تعلق سے خوب احتجاج بھی کیا ہے۔ پروفیسر متھن کمار نے کہا کہ دلت لوگوں کے درد کو سمجھنا ان کے مسائل کو دور کرنا آسان کام نہیں ہے۔ پروفیسر عارفہ بشریٰ نے کہا کہ دلت ایسا طبقہ ہے جسے دبا کر رکھا گیا۔ تعلیمی، سیاسی اور معاشی طور پر دلت طبقے کو نظرانداز کیا گیا۔ پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ دلت مسائل پر آج بہت اچھی گفتگو ہوئی۔ دلت ادب کو سچا فنکار اپنے تجربے کی بنا پر لکھتا ہے۔ اس موقعے پر کشمیر کے عامر عباس نے 1980 کے بعد اردو ناول میں دلت مسائل، دہلی یونیورسٹی کے ذبیح اللہ نے ناول 'چمراسر' میں دلت مسائل اور میرٹھ یونیورسٹی کی ڈاکٹر الکا وششٹھ نے 'دلت ادب میں خواتین' موضوع پر اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 جنوری 2025

بیاد انیس دبیر

لکھنؤ: شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے زیراہتمام بیاد انیس و دبیر یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا، بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر نسیم احمد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر صغیر افراہیم، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر شفیق احمد اشرفی نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے سمینار میں شرکت کی۔ شعبے کے استاد پروفیسر عباس رضا نیر نے جلسے کی صدارت کی۔ شعبۂ اردو کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی نے استقبالیہ خطبہ دیا۔ اپنی تقریر میں پروفیسر نسیم احمد نے کہا کہ انیس و دبیر فلک ادب کے ایسے آفتاب و ماہتاب ہیں جو اپنے کلام کی ضیا سے چمک رہے ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ انیس و دبیر کو دار فانی سے رخصت ہوئے ایک سو پچاس برس کا عرصہ گزر گیا مگر ان کا کلام آج بھی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر شفیق احمد اشرفی نے کہا کہ یہ کہنے میں مجھے کوئی گریز نہیں کہ انیس و دبیر کے مراثی اردو ادب کے سر کا تاج ہیں۔ پروفیسر عباس رضا نیر نے کہا کہ انیس و دبیر کی خدمات مراثی تک محدود نہیں ہیں۔ ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی نے کہا کہ انیس و دبیر کے مراثی کی عصری معنویت سمجھنے کے لیے ہمیں کلاسیکی اثاثے کی طرف راغب ہونا ہوگا۔ ڈاکٹر جاں نثار عالم نے شکریہ کی رسم ادا کی۔ شعبۂ اردو کے بیشتر ریسرچ اسکالرز، طلبا اور اسٹاف نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 جنوری 2025

تمل ناڈو

جلسہ تقسیم اسناد 2025

میل وشارم: سی۔ عبدالحکیم کالج (خود مختار) کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرانکس اینڈ

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اشتراک سے 'ڈپلومہ تقسیم اسناد تقریب 2025' کا شاندار انعقاد کیا گیا۔ تقریب کی باضابطہ شروعات سینئر فیکلٹی جناب احتشام الحق کے استقبالیہ خطاب سے ہوئی۔ بعدازاں، مرکز کے کوآرڈینیٹر جناب ڈاکٹر ایس۔ محمد یاسر نے مہمانانِ خصوصی کا تعارف پیش کیا۔ کالج کے انتظامیہ کی جانب سے تمام مہمانان اور اساتذہ کے مابین یادگار تمغے پیش کیے گئے۔ افتتاحی خطبہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایس اے ساجد نے دیا، جس میں انھوں نے طلبہ کو حصول علم میں مستقل مزاجی، لگن اور جذبے کے ساتھ آگے بڑھنے کی تلقین کی۔ قومی کونسل کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ قلیل فیس میں طلبہ کے لیے مختلف زبانیں سیکھنے کا موقع دیا۔ یہ کورس تقریباً بیس سالوں سے شعبہ اردو کی جانب سے بحسن وخوبی انجام پا رہا ہے۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سی۔ ڈنڈاپانی نے کلیدی خطبہ پیش کیا، جس میں انھوں نے اردو زبان کی ابتدا اور دور حاضر میں اس کی مواصلاتی اہمیت کو اجاگر کیا۔ جبکہ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر اے۔ محمد انیس نے خصوصی خطاب میں کہا کہ زبانوں کو سیکھنا انسانی دماغ کو فعال بناتا ہے، اسی ضمن میں عربی، فارسی اور اردو کی خاص اہمیت ہے۔ اسناد کی تقسیم کے بعد، تقریب کے اختتام پر استاد ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم نے کلماتِ تشکر ادا کیے۔ تقریب کا اختتام قومی ترانے کے ساتھ ہوا، جو تبریز احمد (متعلم) اور ان کی ٹیم نے پیش کیا۔ جناب سروش اور جناب احتشام زید نے اجلاس کے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ یہ تقریب انتہائی شاندار، منظم اور یادگار رہی، جس میں تعلیمی، سماجی اور علمی شخصیات نے شرکت کی اور طلبہ کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ایس محمد یاسر، میل وشارم، 6 فروری 2025

پنجاب

مقالہ نویسی: مسائل اور حل

چنڈی گڑھ: پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے شعبہ اردو میں مقالہ نویسی کا ایک پروگرام منعقد کیا گیا جس میں شعبے کے ریسرچ اسکالرز نے مختلف موضوعات پر اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر سیف الرحمٰن (صدر، شعبہ کمیونٹی ایجوکیشن) نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ دنیا میں جتنے بھی انقلابات آئے، ادب کی بدولت ہی آئے۔ موجودہ دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے نوجوانوں کا ادب سے رشتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ بہتر سماج کی تشکیل کے لیے ادب کے ساتھ اپنے رشتے کو مضبوط کرنا ہوگا۔ شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر علی عباس نے کہا کہ جس قدر زبان الجھاؤ اور التباس سے پاک ہوگی اس قدر تحقیق اور تنقید کے مباحث کی رسائی قاری کے ذہن تک بآسانی ہوسکتی ہے۔ پروگرام کے آخر میں شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر ذوالفقار علی نے مہمانوں اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں سائنسی اور غیر سائنسی تمام شعبوں میں تحقیق کے طریقہ کار اور طرز تحریر میں تبدیلی آچکی ہے، اس لیے تحقیق کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے۔ شعبہ کے ریسرچ اسکالرز میں رضوانہ کوثر، شمیم چودھری، محمد سلطان، خلیق اعوان اور شیتل ورما نے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض طالب علم امن دیپ کور نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 جنوری 2025

راجستھان

اردو شاعری میں گنگا جمنی تہذیب: اتحاد اور یگانگت کی خوشبو

جھالاواڑ: جشن یوم جمہوریہ کے موقعے پر 20 جنوری 2025 کو شعبۂ اردو گورنمنٹ پی جی کالج جھالاواڑ،

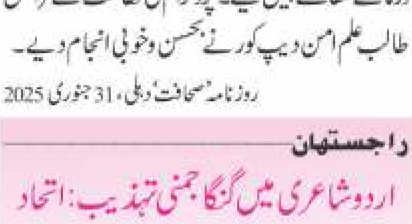

راجستھان کے زیرِ اہتمام ایک توسیعی لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ 'اردو شاعری میں گنگا جمنی تہذیب: اتحاد اور یگانگت کی خوشبو' کے موضوع پر پرنسپل پروفیسر پھول سنگھ کی صدارت میں مقررِ خصوصی ڈاکٹر شمشاد علی، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ کالج باراں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے مہتمم جناب فہیم الدین ٹونکی، صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ پی جی کالج جھالاواڑ تھے۔

پروفیسر حمید احمد نے مقرر اور اقبال فاطمہ نے تمام مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ یہ تقریب جھالاواڑ کے مشہور شعرا اور ادیبوں کی موجودگی میں منعقد ہوئی۔ تمام حاضرین نے اس تقریب کو کامیاب اور معنی خیز قرار دیا۔

پریس ریلیز: فہیم الدین، راجستھان، 21 جنوری 2025

مہاراشٹر

'عالم گیر ادب' کی جانب سے جلسہ اعتراف خدمات ومشاعرہ کا کامیاب انعقاد

اورنگ آباد: اردو ادب کی مثبت اور صالح قدروں کا امین کتابی سلسلہ عالم گیر ادب اورنگ آباد کے

زیرِ اہتمام گذشتہ کئی برسوں سے شاعروں وادیبوں کی اعترافِ خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی کے تحت 22 دسمبر کو پانچواں جلسہ اعتراف خدمات ومحفل مشاعرہ کا انعقاد 24 دسمبر کو عالمگیر ہال عمل میں آیا۔ جلسے کی صدارت معروف افسانہ نگار نورالحسنین نے کی۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے اسلم مرزا، ڈاکٹر ارتکاز افضل، خالد سیف الدین، ڈاکٹر مسرت فردوس اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ صدر عالم گیر ادب اورنگ آباد اسلم مرزا نے اس موقعے پر اپنی مخاطبت میں کہا کہ 'اعترافِ خدمات کا علاقہ مراٹھواڑہ میں یہ اپنی نوعیت کا اولین منفرد سلسلہ ہے، جس کی تمام ادبی حلقوں میں پذیرائی ہو رہی ہے اور آج تک تقریباً 14 ادبی شخصیات کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے، جس میں محققین، ناقدین، فکشن نگار اور شعرا شامل ہیں۔' صاحبان اعزاز سید قاسم قالب جالنوی، مبصر احمد اورنگ آبادی، ڈاکٹر شرف النہار مبصر اسلم مرزا، ڈاکٹر عظیم راہی مبصر ڈاکٹر شکیل احمد خان، وجاہت قریشی مبصر احمد اقبال کا تحریر کردہ مضمون ڈاکٹر اشفاق اقبال نے پیش کیا۔ نظامت نوجوان شاعر قاضی جاوید ندا نے بحسن وخوبی انجام دی۔ اظہارِ تشکر وسیم راہی نے کیا۔ اس کے بعد اعزاز یافتگان سید قاسم قالب، ڈاکٹر شرف النہار، ڈاکٹر عظیم راہی، وجاہت قریشی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ہدیۂ تشکر پیش کیا اور مہمانانِ خصوصی نے بھی اپنے خیالات میں اعزاز یافتگان

کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دلی مبارکباد پیش کی اور عالم گیر ادب کی اس انفرادی روایت کی ستائش کی۔

پریس ریلیز: شکیل خان، اورنگ آباد، 9 جنوری 2025

جشن اردو 3 ممبئی

ممبئی: اردو چینل اور شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام مراٹھی بھاشا بھون کالینا کیمپس (ممبئی یونیورسٹی) میں تیسرے جشن اردو کا انعقاد نہایت تزک و احتشام سے کیا گیا۔ افتتاحی سیشن کی صدارت ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے کہا کہ اردو کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر ہمیں جگہ جگہ اردو کا جشن منانا چاہیے۔ موصوف نے ماضی کے جھروکے سے اردو زبان کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر نے جشن اردو منعقد کرنے کے مقاصد بیان کیے۔ ڈاکٹر قمر صدیقی نے مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ اس درمیان انھوں نے اردو زبان و ادب کے مختلف حوالوں سے گفتگو کی۔ دہلی سے پروفیسر احمد محفوظ نے جشن اردو کا افتتاح کرتے ہوئے جشن اردو کے منتظمین کو مبارکباد پیش کی۔ اردو کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لیا۔ آئی پی ایس افسر قیصر خالد نے اس موقعے پر اردو کی لسانی ساخت پر مختلف تاریخی حوالوں سے گفتگو کی۔ ان کے مطابق اردو میں ہر طرح کے تہذیبی عناصر پنہاں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب ہمیں اس زبان کو شعبۂ حیات کے مختلف زمروں سے جوڑنا ہوگا۔ حافظ ولی احمد نے اپنے تاثرات میں اردو زبان سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا۔ صدر شعبہ ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد نے رسم شکریہ ادا کیا۔ جشن اردو 3 کے اس افتتاحی سیشن میں شہر ممبئی و مضافات کے علاوہ ملک بھر سے ادبی شخصیتوں اور ادب دوست احباب نے کثیر تعداد میں شریک رہ کر اپنی اردو دوستی کا ثبوت فراہم کیا۔

دوسرے سیشن میں عبداللہ ندیم کی کتاب 'بوئے دوست' کا اجرا عمل میں آیا۔ بعد ازاں کثیر لسانی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو، ہندی، انگریزی اور مراٹھی زبان کے شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

اگلے سیشن میں ممبئی یونیورسٹی کی طالبات نے ڈاکٹر مزمل سرکھوت کی ہدایت میں ایک مزاحیہ ڈراما پیش کیا۔ پہلے دن کا آخری سیشن ایوارڈ کی تقسیم تھا جس میں انوار قوم ایوارڈ شہر کی مختلف تعلیمی و سماجی تنظیموں کو اور انوار تدریس ایوارڈ برائے تعلیم و تدریس اساتذہ کو تفویض کیے گئے۔

جشن اردو کے دوسرے دن صبح طلبہ کے مقابلے منعقد ہوئے۔ مضمون نویسی، اوپن مائک، خطاطی، ڈرائنگ اور مہندی ڈیزائن کے مقابلوں میں تقریباً 1200 طلبہ نے حصہ لیا۔ ترجمہ نگاری کی اہمیت پر مذاکرے میں ڈاکٹر ابوشہیم خان اور ڈاکٹر پرویز اعظمی نے ترجمہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ لطیفہ گوئی میں اختر خان اور عبدالباسط نے ادبی مزاح سے سامعین کو محظوظ کیا۔ دوسرے دن جشن اردو میں دو مشاعرے بھی منعقد ہوئے۔ ایک مشاعرہ شاعرات اور دوسرا مشاعرہ نوجواں۔ اس دن کا سب سے کامیاب پروگرام حامد اقبال صدیقی کا ادبی کوئز تھا۔ دوسرے دن ہی افسانہ خوانی، جاوید صدیقی کا میرا ادبی سفر اور مرثیہ خوانی کے پروگرام بھی ہوئے۔ آخر میں مجیب خان کا ڈراما 'پنڈت اور پٹھان' نے اس پورے دن کی ریکارڈ کامیابی حاصل کی۔

ممبئی یونیورسٹی ممبئی میں 10 جنوری سے شروع ہوئے تاریخ ساز پروگرام سہ روزہ 'جشن اردو' کا اتوار 12 جنوری کو اختتام ہوا۔ سیاسی و سماجی قائدین، اساتذہ کرام، پروفیسرس، ادبا، شعرا، طلبا و طالبات اور ادب دوستوں کی کثیر تعداد نے اس جشن میں شرکت کرتے ہوئے مادری زبان اردو سے اپنی محبت، عقیدت اور گہری وابستگی کا ثبوت دیا۔ جشن کے محرک و روح رواں ادبی مجلّہ 'اردو چینل' ممبئی کے مدیر و اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، قمر صدیقی نے جشن اردو کے آغاز و شاندار اختتام پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے خصوصی تعاون پر ارباب ممبئی یونیورسٹی کا دلی شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ جشن اردو کے انعقاد سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اردو زبان سے متعلق فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے امریکہ، یوروپ، کینیڈا اور دیگر مغربی ممالک میں بھی اردو کی نئی نئی بستیاں بڑی آب و تاب سے آباد و روشن ہو رہی ہیں۔ شرکا میں سے بیشتر کا خیال یہ ہے کہ ہم سب اردو کے لیے اپنے اپنے حصہ کی شمع روشن کریں۔ ڈاکٹر قمر صدیقی نے جشن اردو کے سلسلہ میں شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی اور اس کے صدر ڈاکٹر عبداللہ امتیاز صاحب، مراٹھی شعبہ ممبئی یونیورسٹی اور اس کے صدر پروفیسر ونود کمرے کے علاوہ اردو، ہندی، انگریزی اخبارات و نیوز چینلس، اشرف بستوی (دہلی) کے علاوہ دیگر معاونین ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر، وسیم عقیل شاہ، ذیشان ساحر، عبدالکلام خان، عبید اعظم اعظمی اور دیگر کی کاوشوں کو پر اثر خراج تحسین ادا کیا۔ آخری دن اتوار 12 جنوری کو جو مختلف پروگرام منعقد ہوئے ان میں بیت بازی مقابلے میں چوبیس اسکولوں کے طلبا و طالبات نے حصہ لیا۔ حکم (جج) کے فرائض معروف شاعر مقصود آفاق اور خلیق الزماں نصرت نے انجام دیے۔ بعد ازاں مذاکرہ 'کوکن میں اردو' منعقد ہوا جس میں جویریہ قاضی اور ڈاکٹر دانش نے سیر حاصل گفتگو کی۔ اس سیشن میں کوکن کے خوبصورت خطہ کی تاریخ، ثقافت، ادب اور تعلیمی صورتحال پر سیر حاصل مباحث ہوئے۔ اس کے بعد مذاکرہ بعنوان 'بھیونڈی میں اردو' منعقد ہوا جس کی صدارت عرفان جعفری نے کی۔ پرنسپل ضیاء الرحمٰن انصاری اور مخلص مدعو نے سامعین سے تخاطب کیا۔ اردو اور مراٹھی کے ادبی اور لسانی رشتے کے عنوان سے منعقدہ مذاکرہ کی صدارت معروف ڈراما نگار اقبال نیازی نے کی جبکہ شکیل رشید اور ایم مبین مہمانان کے طور پر شریک ہوئے۔ قاسم ندیم اور ڈاکٹر مزمل سرکھوت نے مذاکرہ کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اگلا ایونٹ شعری مجموعہ 'دریچے کی دھوپ' (شاعر زبیر الحسن غافل) کی رسم اجرا عمل میں آئی جس میں اسلم حسن آئی آر ایس) عرفان جعفری، ڈاکٹر خالد شیخ، ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر، شکیل رشید، عبید اعظم اعظمی، قمر صدیقی اور دیگر معززین نے کتاب کے محاسن پر گفتگو کی۔ 'صحت اور سماج' مذاکرہ میں ڈاکٹر زبیر شیخ، ڈاکٹر یاسمین پٹھان، ڈاکٹر

انتخاب شیخ، ڈاکٹر عفان نے سماجی ہم آہنگی کے ذریعہ صحت مند زندگی کے فروغ اور فوائد پر روشنی ڈالی۔ مذاکرہ 'اردو مراٹھی کا رشتہ' کی صدارت اقبال نیازی نے کی۔ اس ایونٹ میں شکیل رشید، ایم مبین، قاسم ندیم اور مزمل سرکھوت بطور مقررین موجود رہے۔ آخیری دن تین بہت ہی اہم ایونٹ ہوئے۔ ایک عدنان سرکھوت کا لازوال ڈراما 'الوداع'، دوسرا گیت سنگیت کی محفل میں گاتھا جادھو اور گندھار جادھو نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور تیسرا آئی پی ایس قیصر خالد کی صدارت میں آل انڈیا مشاعرہ، جس میں بشمول قیصر خالد شمیم عباس، راجیش ریڈی، شاہد لطیف، مہتاب عالم، حامد اقبال صدیقی، سلیم محی الدین، وسیم خان وسیم، اسلم حسن، عبید اعظم اعظمی، قمر صدیقی، ذاکر خان ذاکر، خان رضوان، طہ صدیقی، احمد معراج اور ذیشان ساحر جیسے شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کی نظامت یوسف دیوان نے بہ حسن وخوبی انجام دی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر قمر صدیقی، ایڈیٹر اردو چینل، ممبئی، 11 فروری 2024

اعزاز و اکرام

پروفیسر سید عین الحسن

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر سید عین الحسن کو حکومت ہند کی جانب سے پدم شری کا اعلیٰ ترین شہری اعزاز دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہاں جاری ایک ریلیز میں بتایا گیا کہ رجسٹرار

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر اشتیاق احمد کے بموجب ہر برس کی طرح اس مرتبہ بھی 26 جنوری کے موقعے پر حکومت ہند کی جانب سے جن افراد کو ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں پدم شری کا ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے، ان میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پرفیسر سید عین الحسن کا نام بھی شامل ہے۔ واضح رہے کہ گزشتہ تین برسوں سے پروفیسر سید عین الحسن کی قیادت میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ترقی کے نئے منازل طے کررہی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 جنوری 2025

پروفیسر وسیم بریلوی

بریلی: صوفی جمیل اختر لٹریری سوسائٹی کولکاتا کی جانب سے عالمی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر وسیم بریلوی

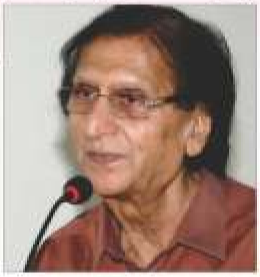

کو صوفی جمیل اختر میموریل ایوارڈ 2025 سے سرفراز کیا جائے گا۔ تنظیم کی جانب سے 25 اگست کو کولکاتا میں منعقد کی گئی ماہانہ میٹنگ کے دوران پروفیسر وسیم بریلوی کو 2025 کا ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ سوسائٹی ہر سال اردو سے متعلق کسی اہم شخصیت کی ادبی خدمات کے اعتراف میں صوفی جمیل اختر میموریل ایوارڈ دیتی ہے۔ پروفیسر وسیم بریلوی کو اس سے قبل بھی ملک اور بیرون ملک کی ادبی انجمنوں کی جانب سے سیکڑوں ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ اس موقعے سے امن کمیٹی کے صدر ڈاکٹر قدیر احمد نے کہا کہ عالمی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر وسیم بریلوی کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بریلی شہر کو شہرت حاصل ہے۔ یہ بریلی کے شہریوں کے لیے بھی اعزاز کی بات ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جنوری 2025

عمران راقم

شاہجہانپور: کولکاتا سے آئے معروف شاعر اردو ادیب و ماہنامہ صورت کے مدیر عمران راقم کو رشید حسن خاں ادبی ایوارڈ 2025 سے نوازا گیا۔ اس دوران ان کے دیوان 'شاعر وقت' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ادارہ افق نو کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں مہمان خصوصی شہید وطن اشفاق اللہ خاں کے پڑپوتے اشفاق اللہ خاں، مہمان اعزازی شاہد انور قریشی، پروگرام کے صدر خالد علوی نے عمران راقم کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں رشید حسن خاں ادبی ایوارڈ دیا۔ پروگرام میں ادبی تنظیم ادراک کے جنرل سکریٹری اصغر یاسر اور نظر میموریل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری حمید خضر کی طرف سے شال، یادگاری نشان اور توصیفی سند سے نوازا گیا۔ اس دوران اسٹیج پر موجود مہمانوں نے عمران راقم کے دیوان 'شاعر وقت' کا اجرا کیا۔ عمران راقم نے کہا کہ اردو ادب کے فروغ میں ضلع شاہجہاں پور کے شعرا و ادبا کا بہت بڑا رول ہے۔ آج وہ کولکاتا سے شہیدوں کی سرزمین پر آکر بہت فخر محسوس کررہے ہیں۔ اشفاق اللہ خاں نے کہا کہ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ عمران راقم کو ان کی ادبی خدمات پر اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ معروف نقاد رشید حسن خاں کے فرزند خالد حسن خاں نے اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت ادارہ افق نو کے صدر راشد حسین راہی نے کی۔ آخر میں کنوینز شاہینہ خاتون شبنم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 جنوری 2025

ڈاکٹر غضنفر اقبال

شولا پور: واجد اختر صدیقی کی اطلاع کے بموجب ادارہ ادب اسلامی ہند حلقہ مہاراشٹر کی جانب سے

معروف اردو قلم کار ڈاکٹر غضنفر اقبال کو ان کی نثری خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر عصمت جاوید ایوارڈ ادارہ ادب اسلامی کی دوروزہ سالانہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں ممتاز افسانہ وناول نگار اور کالم نویس، ڈاکٹر سلیم خان کے ہاتھوں تفویض کیا گیا۔ یہ ایوارڈ تیس ہزار روپے سپاس نامہ مومنٹو اور شال پر مشتمل ہے۔ اس پرمسرت موقعے پر پروفیسر مقبول احمد مقبول (صدر نشین ادارہ ادب اسلامی ہند مہاراشٹر) جناب فرید مونس (سکریٹری ادارہ ادب اسلامی ہند حلقہ مہاراشٹر) ڈاکٹر اسماعیل شیخ (امیر مقامی جماعت اسلامی شولہ پور)، جناب بشیر پرواز (صدر بزم غالب شولہ پور) جناب نورالحسنین (اورنگ آباد) ڈاکٹر آئی جے تنبولی (پرنسپل سوشیل کالج شولہ پور) اور پروفیسر ڈاکٹر شفیع چوبدار (صدر شعبہ اردو سوشیل کالج شولہ پور) کے علاوہ دیگر مہمانان کانفرنس میں شریک ہوئے۔

پریس ریلیز: غضنفر اقبال، گلبرگہ، 1 فروری 2025

قرطاس وقلم ایوارڈ 2024

جگتدل: اردو زبان کے مصنف ڈاکٹر معصوم شرقی کی 58 سالہ علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں

'قرطاس وقلم ایوارڈ 2024' سے سرفراز کیا گیا۔ ادارہ 'قرطاس وقلم' جگتدل (شمالی کولکاتا) کے زیر اہتمام جگتدل شمس اردو ہائی اسکول کے وسیع ہال میں تقریب منعقد کی گئی۔ صدارت پروفیسر صفدر امام قادری نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا اور ڈاکٹر وحید الحق نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔

صفدر امام قادری نے کہا کہ ڈاکٹر معصوم شرقی کا قلم کئی صنفوں کو محیط ہے۔ انھوں نے کئی قیمتی کتابیں اردو دنیا کو عطا کی ہیں۔ دیگر مقررین نے ڈاکٹر معصوم شرقی کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ ادارہ قرطاس وقلم کی جانب سے صفدر امام قادری کے ہاتھوں ڈاکٹر معصوم شرقی کو مومنٹو، سپاس نامہ اور کیسۂ زر پیش کیے گئے۔ تقریب میں شہر کولکاتا و مضافات کے ممتاز ادبا، شعرا، اردو اسکالرز اور ادب دوست احباب نے شرکت کی۔ اظہار تشکر ادارہ قرطاس وقلم کے صدر عظیم انصاری نے کیا۔

رپورٹ: ظہیر فیصل، جگتدل، 1 فروری 2025

رسم اجرا

بوئے دوست

ممبئی: مجھے اس مجموعے 'بوئے دوست' میں سب سے

اچھی بات یہ لگی کہ اس میں اکثر وہ اشعار ہیں جو شاعر کے اپنے محسوسات ہیں، اس کی جو انفرادی کیفیت ہے یعنی جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے، دنیا کے بارے میں یا عشق کے بارے میں، یا باطنی دنیا کے بارے میں اس کے جو تجربات ہیں، اس کا بیان انھوں نے حتی الامکان بہت عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار 11 جنوری 2025 کو شعبہ اردو جامعہ ملیہ کے صدر پروفیسر احمد محفوظ نے عبداللہ ندیم کے پہلے شعری مجموعے کی رسم اجرا کے موقعے پر اردو چینل اور شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد جشن اردو کے موقعے پر کیا۔

پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ عبداللہ ندیم کے بہت سے شعروں کو پڑھ کر آدمی فوراً یہ کہے گا کہ ایسے اشعار وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کا مزاج شاعری کی طرف خاص طور پر غزل گوئی کی طرف ہو۔ پروفیسر احمد محفوظ نے مزید کہا کہ ان کی غزلوں کو پڑھ کر کہیں سے یہ نہیں لگتا کہ وہ دنیا کے بارے میں کوئی تبصرہ کر رہے ہیں یا کوئی ردعمل ظاہر کر رہے ہیں بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل پر جو کچھ گزر رہا ہے اس کا بیان ہے۔

مشہور ادیب ڈاکٹر شاہ عالم (شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ عبداللہ ندیم تازہ کار شاعر ہیں۔ انھوں نے نئے کہنے والوں کے لیے امید پیدا کی ہے۔ ڈاکٹر شمیم خاں (مانو حیدرآباد) نے کہا کہ عبداللہ ندیم کے اشعار کی روانی قابل داد ہے اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ بوئے دوست میں زبان کا خلاقانہ استعمال بھی قاری کے لیے توجہ کا باعث ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر پرویز احمد نے کہا کہ عبداللہ ندیم کی شاعری کا عشقیہ پہلو کلاسیکی عہد کی یاد دلاتا ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ عبداللہ ندیم کی غزلیں پرکشش اسلوب کی حامل ہیں۔ ان کی اس کشش کا راز ان کی سادگی ہے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر قمر صدیقی، ڈاکٹر ذاکر خاں، حافظ محمد ولی خاں اور دیگر احباب نے مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر شاہ عالم، دہلی، 16 جنوری 2025

بچپن کی بادشاہت

حیدرآباد: حیدرآباد دکن کنکشن (ایچ ڈی سی) اور اے جی آئی ایس کے اشتراک سے 'یوم اردو' کا شاندار پروگرام منعقد ہوا جس میں معروف ادیب و مصنف نعیم جاوید کی کتاب 'بچپن کی بادشاہت' کا اجرا مہمانِ خصوصی معروف شخصیت، صنعت کار نوشاد انصاری، قاری سید لطف اللہ حسینی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام میں نغماتِ اقبال سرائی ہوئی جسے عالمی شہرت یافتہ فنکار نعیم نیازی نے اپنی آواز سے سحر آفریں بنایا۔ تقریب میں مجیب سلطان، نائب صدر ایچ ڈی سی اور ماہر تعلیم ڈاکٹر ملک پرویز اختر ڈائریکٹر اسکول نے مصنف کی نثر نگاری اور اسلوب پر گفتگو کی اور کتاب کے اقتباسات پیش کیے۔ پروگرام کے آخری حصے میں مختصر و منتخب شعرا کے اشعار کی گہرباری رہی۔ اس حصے کی نظامت اقبال اسلم نے بہت خوبی سے انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 جنوری 2025

روضۃ الشہدا اور کربل کتھا (تقابلی مطالعہ)

حیدرآباد: معروف ناقد اور ادیب ڈاکٹر صابر علی سیوانی کی آٹھویں کتاب روضۃ الشہدا اور کربل کتھا (تقابلی

مطالعہ) کی رسم اجرا مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے 28 ویں یوم تاسیس کے موقعے پر 9/جنوری 2025 کو نظامتِ فاصلاتی تعلیم آڈیٹوریم، مانو میں بدست پروفیسر سید عین الحسن، شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی عمل میں آئی۔ صابر علی سیوانی کی کتاب 'روضۃ الشہداء اور کربل کتھا (تقابلی مطالعہ)' ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف 'روضۃ الشہداء' اور فضل علی فضلی کی تالیف 'کربل کتھا' کے متعلق ایک تحقیقی اور تنقیدی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں مصنف نے نہایت ایماندارانہ طور پر دونوں کتابوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ حیدرآباد کی نامور اور ممتاز شخصیات اس موقعے پر موجود تھیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد زبیر احمد، حیدرآباد، 13/جنوری 2025

اردو زبان تعلیمی و تدریسی بیداری

تروونتو پورم کیرالا: ایس سی ای آر ٹی، تروونتو پورم کیرالا کے سابق اردو ریسرچ آفیسر اور تعلیمی کارکن ڈاکٹر فیصل ماولڈتل کی کتاب 'اردو زبان تعلیمی و تدریسی بیداری' کی رسم اجرا جناب کے راجن کے ہاتھوں 16 جنوری کو عمل میں آئی۔ تقریب کی صدارت کیرالا اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کے ریاستی صدر ڈاکٹر شمس الدین ترورکاڈ

نے کی۔ تقریب کی ابتدا میں عبدالستار نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، اور تقریب رسم اجرا کے مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ مہمان وزیر جناب کے۔ راجن نے کہا ڈاکٹر فیصل ماولڈتل کی تصنیف ان کے طویل تدریسی تجربوں، مشاہدوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے، جو بچوں کی تعلیم پر مبنی ہے۔ پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی کا خیال تھا کہ 'اردو زبان تعلیمی وتدریسی بیداری' ایک ایسی شاندار کتاب ہے، جس میں بچوں کی تعلیم اور اساتذہ کی ذمے داریوں کے متعلق دیکھی جانے والی تساہلی وغفلت اور کچھ ضروری نکات پر تفصیلی ومدلل گفتگو کی گئی ہے۔ صدارتی کلمات میں ڈاکٹر شمس الدین ترورکاڈ نے کہا ڈاکٹر فیصل ماولڈتل جنوبی ہند کی ایک منفرد ریاست کے لائق باشعور ذہین اور اعلیٰ فکر کے حامل شخص ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب میں ایسے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن کے متعلق کہا جاتا رہا ہے کہ ان موضوعات کے سوتے خشک ہوچکے ہیں۔ سکریٹری جناب سلام ملیالم، ٹی رشید اور نجیب منار نے بھی رسم اجرا کی تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر فیصل ماولڈتل کی کاوش کو سراہا اور انھیں مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ کیرالا میں تعلیمی وتدریسی سرگرمیاں قابل رشک ہیں۔ جی جی مول نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا اس قسم کی تقریب میں غیر اردو داں طبقے کی اس طرح کی ادبی شراکتیں مثالی ہیں، اس سے لگتا ہے اردو کا فروغ زمینی سطح پر ہو رہا ہے۔

پریس ریلیز: فیصل ماولڈتل، کیرالا، 17 جنوری 2025

افسانہ نما

گلبرگہ: مجلس شعور ادب اور مجیب علی خان میوزیم کلچرل فورم گلبرگہ کے زیر اہتمام برصغیر ہندوپاک کے

فن افسانچہ پر مبنی اولین رسالے دوماہی 'افسانہ نما' کرچہ کے سال نامہ کی رسم اجرا گلبرگہ میں 16 جنوری کی نو بجے شب ممتاز طنز وظرافت نگار افسانہ وافسانچہ نویس خاکہ نگار اور بچوں کے کہانی کار محترم منظور وقار کی صدارت اور مشہور فکشن رائٹر وشاعر جناب محمود شاہد (مدیر افسانہ نما) کی نگرانی میں منعقدہ ایک اجلاس میں ڈاکٹر غضنفر اقبال (سربراہ کاغذ دکن بیورو گلبرگہ) کے ہاتھوں انجام پائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے معروف قلم کار ڈاکٹر طیب خرادی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو دی نیو کالج چنئی) شریک اجلاس رہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید چندا حسینی اکبر (معتمد اعلیٰ مجلس) اور الحاج مجیب علی خان (سربراہ مجیب علی خان میوزیم) موجود تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، 18 جنوری 2025

ترجمانِ اطفال

بیاول: سہ ماہی ترجمان اطفال بیاول وادارہ اردو سیوا کے زیر اہتمام مولانا آزاد لائبریری ہال میں شہر کی اردو

اسکولوں کے جماعت اول تا نہم کے طلبا وطالبات کے ذریعے درسی وغیر درسی کہانی ونظم خوانی کے مقابلہ کا انعقاد 16 جنوری 2025 کو عبدالکریم سالار کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ شکیل احمد اور رئیس فیض پوری کے ذریعے مہمانوں کے استقبال کے بعد اردو سیوا کے صدر اور ترجمان اطفال کے مدیر رحیم رضا نے تقریب کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ طلبا میں ذوق مطالعہ کے فروغ اور کتب بینی کی طرف رغبت دلانے کے مقصد کے تحت یہ تقریب رکھی گئی ہے۔ اس موقعے پر معروف قلمکار سلیم خان کی کتاب 'ہم جب ایک ہوجائیں' کی رونمائی محترم عبدالرؤف (سابق پرنسپل) نے کی۔ شریک مقابلہ طلبا وطالبات کو عبدالکریم سالار نے اسکول بیگ کا تحفہ دیا، جابر جان کی جانب سے کاپیاں اور قلم نیز ترجمان اطفال کی جانب سے کہانیوں کی کتابیں اور ترجمان اطفال اور بچوں کی دنیا تقسیم کیے گئے۔ اس موقعے پر ترجمان اطفال اور مشتاق کریمی کے چینل میٹھا کریلا کی جانب سے تعلیمی وادبی خدمات کے اعتراف میں جناب انصار الدین (معلم ڈاکٹر ذاکر حسین اسکول) اور ارشد خان (معلم سرسید پرائمری اسکول) کو مجاہد آزادی حسرت موہانی کی ایک سو پچاسویں سالگرہ کی مناسبت سے حسرت موہانی ایوارڈ پیش کیا گیا۔

سینئر افسانہ نگار جناب رشید قاسمی، عبدالرؤف، حاجی انصار احمد اور صاحب کتاب سلیم خان نے اپنے تاثرات پیش کیے جب کہ مشتاق کریمی نے سلیم خان صاحب کی کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جگہ صدارتی تقریر کرتے ہوئے سالار صاحب نے ادارہ ترجمان اطفال کی اس تقریب کی تعریف کرتے ہوئے مطالعہ کی سمت میں عمدہ قدم قرار دیا۔ نظامت کے فرائض صابر مصطفیٰ ابادی نے انجام دیے آخر میں رسالے کے نائب مدیر ایس ایم انور نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: رحیم رضا، مہاراشٹر 22 جنوری 2025

جانکاری

مرادآباد: ناگرک جن کلیان سمیتی کے زیر اہتمام فیروز خاں کی کتاب 'جانکاری' کا اجرا کیا گیا۔ تقریب کی صدارت نیشنل سوشل آرگنائزیشن کے صدر مرزا ارشد بیگ نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر ممبر اسمبلی حاجی ناصر قریشی نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض سینئر صحافی سید محمد ہاشم قدوسی صابری نے انجام دیے۔ مصنف فیروز خان نے اپنی کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب محبّ وطن اور انسانیت سے محبت کرنے والی شخصیات پر لکھی گئی ہے۔ تمام مقررین نے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں اور موبائل فون سے دور رہیں۔ پروگرام کے کنوینر جابر خاں نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہمیں اپنے بچوں پر خصوصی نظر رکھنی چاہیے تاکہ وہ غلط راستے پر نہ چلیں اور ہمیں ان کی صلاحیتوں اور کوششوں کو سراہنا چاہیے تاکہ ان کے حوصلے بلند ہوں۔ اس موقعے پر سماج میں اچھے کام کرنے والے افراد اور غیر جانبدار صحافیوں کو سرٹی فکیٹ دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 جنوری 2025

ظ: ایک شخص تھا

ممبئی: ممبئی کی ایک تاریخی جگہ 'خلافت ہاؤس' میں 16 نومبر کی شام ندیم صدیقی کی کتاب 'ظ: ایک شخص تھا' 'ایکس سافٹ میڈیا ڈاٹ کام' کے زیر اہتمام

تقریب رونمائی عمل میں آئی۔ ممبئی کے استاد اور مقبول کالم نگار پروفیسر سید اقبال نے ظ انصاری سے اپنی پہلی ملاقات کو یاد کرتے ہوئے بتایا کہ میں نے انھیں اپنی درسگاہ سینٹ زیویرس کالج میں سنا تھا، عجب دلکش انداز گفتگو تھا کہ پورا مجمع جیسے ان کی گفتگو میں بہہ گیا تھا۔ ممبئی کے معروف استاد خالد اگاسکر نے اپنی تقریر میں ظ صاحب کو یاد کرتے ہوئے کہا ''لوگ ظ صاحب کے جتنے مداح تھے تو اتنے ہی ان سے شاکی بھی رہتے تھے کہ وہ برسرعام کھوٹے کو کھوٹا اور کھرے کو کھرا کہنے کا وصف جرأت رکھتے تھے۔ تقریب کی ابتدا ڈاکٹر ظہیر انصاری نے اپنی تحریر سے کی جس میں کتاب اور صاحب کتاب کے تعلق سے باتیں کی گئیں، ان کے بعد شہر کے معروف شاعر اور استاد سید ریاض رحیم نے بھی اپنی لکھی ہوئی باتیں حاضرین کو سنائیں۔ اس تقریب میں دور دراز مالیگاؤں سے بھی شائقین ادب نے شرکت کی۔ اس موقعے پر امتیاز خلیل، ڈاکٹر قاسم امام، شکیل رشید نے بھی اظہار خیال کیا۔

پریس ریلیز: ندیم صدیقی، ممبئی، 13 جنوری 2025

رنگ سخن کا

نئی دھلی: نئی دہلی کے ایوان غالب آڈیٹوریم میں ایک پروگرام سماجی و ثقافتی تنظیم میزان کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔ پروگرام کے پہلے سیشن میں ڈاکٹر ماجد دیوبندی کی کتاب 'رنگ سخن کا' کی رونمائی ہوئی۔ مرکزی وزیر سلمان خورشید، تسمیہ سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سید فاروق اور دیگر معززین کی موجودگی میں اس کتاب کا اجرا کیا گیا۔ مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو اعزاز سے نوازا گیا۔ سرسید ایوارڈ: سراج الدین ہاشمی (ان کے بیٹے برہان الدین ہاشمی نے ان کی غیر موجودگی میں قبول کیا)، فخر اردو ایوارڈ: ندیم عباس زیدی، خدمت خلق ایوارڈ: احمد رضا، فخر الدین بیگ ایوارڈ: قمر الحسن بیگ کو دیا گیا۔ سلمان خورشید نے کہا کہ اس طرح کے پروگرام لوگوں کو قریب لاتے ہیں اور نئی چیزیں سیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ تسمیہ سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر سید فاروق نے بھی ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو مبارکباد دی۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے جس نے اس کی قدر کی وہ ہمیشہ کامیاب ہوا۔ شعرا نے اپنی غزلوں اور گیتوں سے سامعین کو مسحور کیا۔ پروگرام کی نظامت معین شاداب نے کی، جب کہ ڈاکٹر ماجد دیوبندی کے شکریے پر اس کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 جنوری 2025

غیر افسانوی ادب کے مطالعے میں علی گڑھ کا حصہ

علی گڑھ: ''اردو زبان و ادب کی ترقی میں علی گڑھ کا

نمایاں کردار رہا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے تحت سالانہ 'علیگڑھ میگزین 2023 خصوصی شمارہ، غیر افسانوی ادب کے مطالعہ میں علی گڑھ کا حصہ' منظر عام پر آرہی ہے، جس کے لیے سبھی ذمے داران، اساتذہ، ایڈیٹر اور ادارتی بورڈ کے اراکین کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ یہ باتیں وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے اپنے دفتر کے میٹنگ روم میں علی گڑھ میگزین کا اجرا کرتے ہوئے کہیں۔ رجسٹرار مسٹر محمد عمران آئی پی ایس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ طنز و مزاح وہ صنف ہے جو انسان کو لطف و انبساط کے مواقع فراہم کرتی ہے اور مجھے جب بھی وقت ملتا ہے میں طنز و مزاح پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ اس سے قبل پروفیسر محمد علی جوہر نے علی گڑھ میگزین کی تاریخ اور اس کی روایت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں یہ میگزین شروع ہوئی تھی۔ اس شمارے میں اردو نثر کے بنیادی اسلوب سے لے کر خطوط، سیرت و سوانح، انشائیہ، طنز و مزاح، سفرنامہ اور خاکہ نگاری جیسی اصناف سے متعلق علی گڑھ کے پروردہ ادیبوں کی خدمات کو شامل کیا گیا ہے۔ پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے میگزین کے اجرا پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شعبۂ اردو کی ایک زریں تاریخ رہی ہے جس کا ایک حصہ علی گڑھ میگزین بھی ہے۔ یہاں کے طلبا کی علمی، ادبی اور تحقیقی و تنقیدی تربیت میں اس میگزین کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ پروفیسر سید سراج الدین اجملی نے کہا کہ جب ہدف متعین کرلیا جائے تو کام آسان ہوجاتا ہے۔ ایڈیٹوریل بورڈ نے غیر افسانوی ادب کے فروغ میں علی گڑھ کے حصے کو مرتب کر کے محفوظ کردیا ہے۔ یہ بہت وسیع موضوع ہے، جس پر ہزاروں تحریریں موجود ہیں جن میں سے نمائندہ تحریروں کا انتخاب کوئی آسان کام نہ تھا مگر اساتذہ کی رہنمائی، ایڈیٹر کی محنت اور بورڈ ممبران کی جانفشانی نے اسے آسان کردیا جس کا نتیجہ ہے کہ آج یہ میگزین ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 فروری 2025

شاہ ولی اللہ اور تصوف

نئی دھلی: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نظریۂ تصوف و سلوک کی تفہیم و تعبیر کے لیے یہ ایک رہنما کتاب ہے، جس میں تصوف کی ابتدا و ارتقا اور تمام سلاسل و مناہج اور طرق صوفیا کا تفصیلی بیان موجود ہے، جس کے مولف مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر میں 'شاہ ولی اللہ اور تصوف' کی رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے، جب کہ نظامت شبیہ احمد خاں نے کی۔ اس موقعے پر مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے تحت اب تک 50 سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ پروفیسر شہپر رسول نے جامع انداز میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث کا ذکر کیا۔ اس دوران پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں، خواہ محمد شاہد، سماجی رہنما آصف حبیب، شاعر و ادیب ڈاکٹر سجاد احمد، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست رہے ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی مرحوم کے بیٹے مونس الرحمٰن قدوائی نے بھی خطاب کیا۔ آخر میں ڈاکٹر سید فاروق نے صدارتی خطبے میں ناصحانہ کلمات سے نوازا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 فروری 2025

ایک لمحہ زندگی

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں راجیہ سبھا ایم پی جاوید علی خان اور دیگر سرکردہ شخصیات کے ہاتھوں معروف ویڈیو اور فوٹو گرافر زبیر ارشاد جامعی کا افسانوی مجموعہ 'ایک لمحہ زندگی' کی رونمائی عمل میں آئی۔ اس موقعے پر جاوید علی خان نے کہا کہ زبیر ارشاد 'وانڈرنگ سول' کے نام سے عام آدمیوں کی ویڈیو بناتے ہیں، نیز فوٹو گرافی کا بھی شوق رکھتے ہیں مگر یہ مصنف بھی ہیں اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ کم لفظوں میں بڑی بات کہنے کا ہنر موصوف کی تحریروں میں صاف نظر آتا ہے۔ کتاب کے مصنف زبیر ارشاد نے 'ایک لمحہ زندگی' کے حوالے سے کہا کہ ایک روز یوں ہی کیفے میں بیٹھے ہوئے چند احباب کے ساتھ باتوں باتوں میں زبان کے فروغ پر گفتگو ہوئی تو طے پایا کہ ہم سب کے اندر ایک مصنف و شاعر براجمان ہے کیوں نہ اس مصنف و شاعر سے کچھ کام کی چیزیں قلم بند کرلی جائیں۔ بس پھر کیا تھا برسوں بعد ایک بار پھر قلم اٹھایا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ فرحت عثمانی کنٹری ہیڈ ہندوستان ٹائمس نے کہا کہ زبیر ارشاد نے جو کتاب لکھی ہے، یہ ان کے تخیل کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر حاضرین بھی اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض رضوان احمد جامعی نے انجام دیے۔ آخر میں زبیر ارشاد نے تمام شرکا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 فروری 2025

وفیات

مولانا سید جعفر مسعود حسنی

نئی دھلی: برصغیر کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے ناظر عام مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کا ایک سڑک حادثے میں 15 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ مولانا ایک علم دوست، دیندار اور نہایت ہی محترم شخصیت تھے۔ وہ نہایت ہی خوش اخلاق اور نرم دل انسان تھے، جو ہر ایک کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتے تھے۔ مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی کا تعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خانوادے سے ہے۔ مولانا کی پیدائش 13 ستمبر

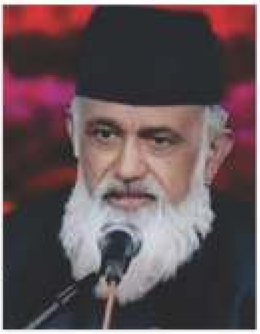

1965 کو تکیہ رائے بریلی، اترپردیش میں ہوئی، ان کے والد ماجد مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی مولانا علی میاں ندوی کے حقیقی بھانجے اور عربی زبان کے نامور ادیب اور صحافی تھے۔

مولانا جعفر مسعود حسنی نے حفظ قرآن اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن رائے بریلی میں حاصل کی اس کے بعد ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخلہ لیا اور علوم شرعیہ کے ساتھ عربی زبان وادب میں بھی مہارت پیدا کی۔ ندوۃ العلما لکھنؤ سے 1981 میں عالمیت اور 1983 میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد 1986 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی زبان وادب میں ایم اے کیا بعد ازاں 1990 میں سعودی عرب کی مشہور دانش گاہ 'جامعۃ الملک سعود' کے زیر اہتمام ٹیچرز ٹریننگ کا کورس مکمل کیا۔ مولانا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا، آپ نخاس لکھنؤ میں واقع ندوۃ العلما لکھنؤ کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ کا اصل موضوع تفسیر وحدیث اور فکر اسلامی ہے، اب تک بے شمار ادبی، فکری وتاریخی مقالات ومضامین لکھ چکے ہیں اور ندوۃ العلما لکھنؤ سے نکلنے والے پندرہ روزہ عربی جریدہ 'الرائد' کے 2019 سے مدیر اعلی (رئیس التحریر) ہیں۔ عربی زبان میں معیاری مضمون نگاری کے ساتھ کئی کتابوں کا اردو سے عربی میں ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔ مولانا کی تصنیفات میں فی مسیرۃ الحیاۃ (مولانا علی میاں ندوی کی خودنوشت 'کاروان زندگی' کا عربی ترجمہ)، الشیخ محمد یوسف الکاندھلوی، حیاتہ ومنہجہ فی الدعوۃ (محمد الحسنی الندوی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)، امام المحدث محمد زکریا الکاندھلوی ومآثرہ العلمیۃ (مولانا علی میاں ندوی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)، دعوۃ للتامل والتفکیر (دعوت فکر ونظر)، بصائر (مولانا علی میاں ندوی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ)۔ مولانا کی طرز زندگی بہت سادہ، قلم توانا، طرز نگارش صاف، شستہ اور شگفتہ ہے۔

روزنامہ صحافت اور دیگر ذرائع

قمر جہاں

بھاگلپور: اردو کی معروف افسانہ نگار اور ناقد پروفیسر قمر جہاں کا 11 فروری 2025 کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔

ان کی تدفین برہ پورہ قبرستان بھیکن پور میں عمل میں آئی۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ دو سال قبل ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔

پروفیسر قمر جہاں کا شمار اردو کی بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ چارہ گر، پنجرے کا قیدی، اجنبی چہرے ان کے افسانوی مجموعے ہیں تو بہ حیثیت تنقید نگار بھی ان کو شہرت ومقبولیت حاصل تھی۔ ان کی تنقیدی تصانیف میں اختر شیرانی کی جنسی اور رومانی شاعری، حرف آگہی، کلام عبداللہ حافظ مشکی پوری، معیار قابل ذکر ہیں۔ شکیلہ اختر پران کا ایک مونوگراف بھی شائع ہوا۔ ان کی ایک اہم کتاب 'تانیثی تنقید: ممتاز شیریں سے عصر حاضر تک' بھی ہے جسے ایک حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔

قمر جہاں کی پیدائش سستی پور کے گاؤں بزرگ دوار میں ہوئی۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ سندروتی مہیلا کالج بھاگلپور سے ان کے تدریسی کیریئر کا آغاز ہوا، بعد میں بھاگلپور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کی ذمے داریاں سنبھالیں۔

ایس آر میڈیا اور دیگر ذرائع

تابش مہدی

نئی دھلی: ڈاکٹر تابش مہدی کا 22 جنوری کی صبح 10 بجے میکس ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر

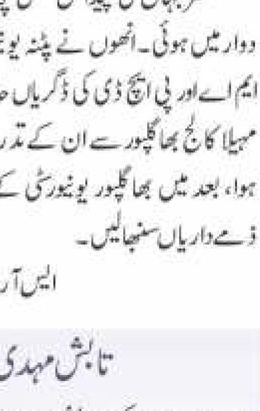

تقریباً 74 برس تھی، وہ دل اور گردے کے مرض میں مبتلا تھے اور کافی وقت سے علیل تھے۔ ڈاکٹر تابش مہدی کے لواحقین میں ان

کی بیوہ کے علاوہ چھ اولادیں شامل ہیں۔ انھیں شاہین باغ قبرستان میں سپردخاک کیا گیا۔ اس موقعے پر دہلی کی اہم علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو زبان وادب کو ایک نئی جہت دی۔ ان کی علمی وادبی زندگی کئی دہائیوں پر محیط رہی جس میں انھوں نے شاعری، تنقید اور تحقیق کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اردو ادب میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر تابش مہدی 3 جولائی 1951 کو اترپردیش کے ضلع پرتاپ گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے جون 1991 سے 3 جولائی 2009 تک مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی میں بطور ایڈیٹر کام کیا نیز وہ ابوالکلام آزاد انٹر کالج پرتاپ گڑھ ادارہ ادب اسلامی ہند کے رکن اساسی، عالمی رابطہ ادب اسلامی (ہند) اور دارالدعوۃ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن دہلی کے رکن، ادبیات عالیہ اکادمی لکھنؤ کے چیئرمین، ادارۂ ادب اسلامی ہند کے سابق نائب صدر، سہ ماہی کاروان ادب لکھنؤ کے مشیر اعزازی و رکن ادارت رہے۔ ان کے اساتذۂ سخن میں شہباز امروہوی (تلمیذ افق کاظمی)، بلالی علی آبادی (تلمیذ شفیق جونپوری)، سروش مچھلی شہری (شاگرد آرزو لکھنوی)، ابوالوفا عارف شاہ جہاں پوری (تلمیذ ریاض خیرآبادی) اور عامر عثمانی شامل ہیں۔ شیراز ہند جونپور سے ان کا قلبی اور ذہنی لگاؤ رہا۔ انھوں نے جونپور کے جامعہ الشرق بڑی مسجد سے کچھ سال تعلیم حاصل کی تھی اور علامہ شفیق جونپوری ان کے استاد تھے۔ 1989 میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) اور 1997 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے اردو تنقید میں پی ایچ ڈی کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جنوری 2025

حمرا قریشی

نئی دہلی: سینئر صحافی، مصنفہ اور کالم نگار حمرا قریشی

گزشتہ روز انتقال کرگئیں۔ وہ 70 سال کی تھیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں کشمیر: دی ان ٹولڈ اسٹوری، ویوز: پورز اینڈ مائن، موربیڈ ٹائم ٹیلز، ڈوائن لیکیسی: ڈاگرز، دھرو اینڈ میر شامل ہیں۔ انھوں نے آنجہانی خوشونت سنگھ کے ساتھ مل کر کئی کتابیں لکھیں، جن میں دی گڈ، دی بیڈ اینڈ دی ریڈیکولس: پروفائلز اینڈ خوشونت شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 18 جنوری 2024

محمد رامش

نئی دہلی: سینئر فوٹو جرنلسٹ محمد رامش کا قریب ساڑھے آٹھ بجے اچانک انتقال ہوگیا۔ وہ دریا گنج میں ایک صاحب سے ملنے گئے تھے، وہیں ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ وہ قریب 60 برس کے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے صحافتی دنیا سوگوار ہوگئی ہے۔ مرحوم نہایت ملنسار، خوش مزاج اور اپنے کام کے تئیں بہت متحرک تھے اور بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ورکنگ جرنلسٹ کلب کے متحرک رکن بھی تھے۔ وہ قریب 12 سالوں سے روزنامہ سیاسی تقدیر سے وابستہ تھے، پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ وہ ایک مشہور اداکار بھی تھے اور اکثر پروگرام میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھاتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب'، 21 جنوری 2025

نواب اختر

دیوبند: فلمی دنیا کے مشہور قوال مرحوم اقبال، افضال صابری کے بھائی فلم پلے بیک سنگر اور راشٹریہ ایکتا امبیڈکر سوسائٹی کے قومی صدر نواب اختر طویل علالت کے سبب 75 برس کی عمر میں انتقال کرگئے۔ مرحوم صلاحیت اور صالحیت کے پیکر، علم وادب سے مالا مال، حکمت و دانائی سے لبریز، سادگی اور تواضع میں بے مثال اور علمی گہرائی و گیرائی سے لبریز شخصیت کے مالک تھے۔ مرحوم نواب اختر اپنے تمام متعلقین دوست، احباب اور رشتے داروں سے بے انتہا پیار ومحبت کا معاملہ رکھتے تھے اور سبھی کو اپنی دعاؤں سے خوب نوازتے رہتے تھے۔ مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر محلہ قلعہ میں واقع مرکز والی مسجد میں ادا کی گئی جب کہ تدفین ہزاروں نم آنکھوں کے درمیان منگلور پولیس چوکی کے نزدیک واقع قبرستان شیخ سرا جو قال میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جنوری 2025

ضمیر ہاپوڑی

ہاپوڑ: معروف شاعر ضمیر ہاپوڑی کا 63 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ضمیر ہاپوڑی کے انتقال سے ادبی اور شعری حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ بڑی تعداد میں شعراء کرام اور

شہر کی معزز شخصیات نے مرحوم کی رہائش گاہ پہنچ کر تعزیت کا اظہار کیا۔ کریم پورہ میں واقع سید کریم قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ عیدگاہ گیٹ پر نماز جنازہ قاری فضل الرحمن انجم نے پڑھائی۔ مرحوم عرصے سے قلب کے عارضے میں مبتلا تھے۔ اس موقعے پر مختلف علمی اور ادبی شخصیات نے خراج تعزیت پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 جنوری 2025

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ اردو دنیا میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

آئینِ ہند: اُن کہی کہانی

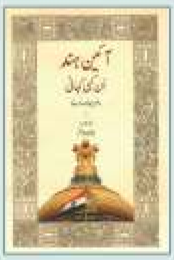

مصنف: رام بہادر رائے، مترجم: جاوید عالم

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 624+xl

قیمت: 340 روپے

معالجات (جلد: اوّل، دوم، سوم، چہارم)

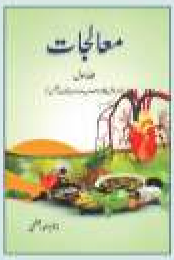

مصنف: وسیم احمد اعظمی

پانچواں ایڈیشن: 2024

صفحات: 2325 (مکمل سیٹ)

قیمت: 970 روپے (مکمل سیٹ)

کشاف اصطلاحات ادبیات (جلد اول)

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 627+26

قیمت: 340 روپے

کشاف اصطلاحات ادبیات (دوم)

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 644+23

قیمت: 340 روپے

کشاف اصطلاحات ادبیات (سوم)

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 355+21

قیمت: 235 روپے

باقیات شکیل الرحمٰن (جلد اوّل تا پنجم)

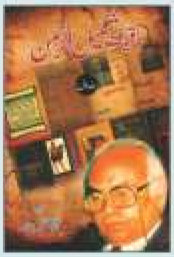

مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: تقریباً 3400

قیمت: 2190 روپے (مکمل سیٹ)

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

حالی کا سیاسی شعور

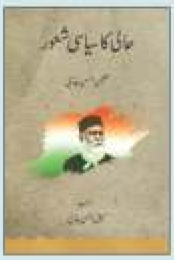

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, मार्च–2025,वर्ष:27, अंक:03
URDU DUNIYA Monthly, March-2025, Vol.27, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/02/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6